

حادثیہ و زبردستان کے ساتھ یہاں ایک لطیفی کی روح پروانگائیں... لطیف حسن قریشی کے قلم سے

اگست 2014ء

اردو ڈائجسٹ



ریاست خاران کے عام نگرانے کا
ہونہار فرزند
بلوچستان سے بننے والا
سیلاب فینٹ ہزل
اصولوں کی خاطر استعفا دینے والا
پہلا گورنر
ہندوستانی اور سیاسی راز ہائے سرپرست کا امین

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبد القادر بلوچ

عبد القادر بلوچ

کسٹمر سروس

پاکستان کے نگرانے

نہیں ملتا دہشت

بہارِ نوں و انِ خاندانِ سحر

امریکا کی کوئی جگہ ہے؟ دہشت و انتشار کا

پاکستان کی کوئی جگہ ہے؟ دہشت و انتشار کا

پاکستان کی کوئی جگہ ہے؟ دہشت و انتشار کا

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSIPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE BOOKS
DOUBTS

PAKSOCIETY'S PAKSOCIETY

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کا قرآن

دعا مانگنے کے آداب

جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ جب دعا مانگیں تو چاہیے میرا حکم مانیں۔ O (سورۃ البقرہ: 186)

اس کو پکارو خالص اس کی بندگی کرتے ہوئے۔ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ O (سورۃ مؤمن: 65:40)

اور تمہارے رب کا ارشاد ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو کہ میں تمہاری دعا قبول کروں۔ O (سورۃ مؤمن: 60:40)

رسول کا فرمان

دعا پورے اعتماد سے مانگیں

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص جب دعا مانگے تو پورے عزم و اعتماد سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے۔ یہ ہرگز نہ کہے: اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے دے دے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جسے کوئی مجبور کر لے وہاں نہیں ہے۔“ (امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرتا ہے اپنی خوشی اور مرضی سے کرتا ہے اس لیے بندے کو یہ شرط لگانا کہ اگر تو چاہے تو ایسا کر دے مناسب نہیں۔ اس میں ایک طرح کی بے پرواہی سمجھ سکتی ہے۔ غلام کو چاہیے کہ اپنے آقا سے براہ راز اور گڑبگڑا کر مانگے۔ اور اس حقیقت کا علم کہ دینا مناسب ہے یا نہ دینا اس کے لیے چھوڑ دے وہ بہتر جانتا ہے۔“

(بخاری کتاب 80: باب 21 مسلم کتاب الذکر۔ باب 3)





اینگریڈیٹس اور ایڈیٹر خدوت

قارئین کرام کو عید الفطر اور یوم آزادی کی خوشیاں مبارک!

ہم اس لحاظ سے خوش قسمت قوم ہیں کہ تمام مسائل

کے باوجود "لحبت خدائے پاکستان کی آزاد ہواؤں میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم اس بابرکت موقع پر اپنی افواج، پولیس اور سکیورٹی اداروں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر ملک کا دفاع کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کی کامیابیوں کے لیے رب تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کر دعا کی جائے اور سر سمجھ دیا جائے۔ اگست کے پورے ماہ آزادی کی تقریبات کے انعقاد کا حکومتی فیصلہ افواج، سکیورٹی اداروں کے جوانوں اور قوم کے جوش و جذبے کو جگانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یقیناً زندہ قومیں اپنا یوم آزادی تمام اختلافات بھلا کر مناجا ہو کر اور پورے غلوں کے ساتھ مناتی ہیں۔ کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ افواج، حکومت، سیاسی قائدین و نمائندگان اور شہداء کے لواحقین سب مل کر آزادی کے محبت گاتے اور جہانیاں کرتے ہیں کہ آزادی سنبھلی ہوئی ہے۔ اس وقت ایک طرف تو تقریباً دس لاکھ افراد وزیرستان میں جاری "آپریشن ضرب عضب" کی وجہ سے بے گھر ہیں اور دوسری طرف رمضان کے بابرکت مہینے میں شدید گرمی میں ٹخنوں بجلی کی عدم دستیابی سے بلہاتے عوام حکومت کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ امید ہے حکومت آنے والے وقت میں ان کی سہولت کے لیے ہر ممکن اقدامات کرے گی۔

اب "آزادی نمبر" کی تحریریں پڑھیے جو ہمارے بزرگوں کی قربانیوں کی یاد تازہ اور ہم پر لہجہ آزادی کی اہمیت اجاگر کرتی ہیں۔

tayyab.sqaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھا ہے، سیکھیں اور لکھ لکھا ہے

اگست 2014ء

شوال 1435ھ

جلد نمبر 54، نمبر 08

www.urdu-digest.com

www.urdu-digest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی

ایگزیکٹو ایڈیٹر: عذیب اعجاز قریشی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: سید ماسم محمود

سب ایڈیٹر: ظہیر عطاء

مجلس تحریر: حافظہ افراسیاب حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ امین

مستعملہات: فاروق اعجاز قریشی

انچارج کیمپیکیشن: انعام کامران قریشی

پرافٹ ٹوانس: خالد گیلانی، کلیم اللہ قادری

نیشنل: اشرف سکندر

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: محمد سلیمان احمد 0300-4116792

لاہور: ندیم حامد گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ

کراچی: شازیہ قریشی 0345-2558648

سبالاتہ خبریں آری 560

روپے کی بچت کے ساتھ subscription@urdu-digest.com

فریڈام کیلئے رابطہ 119/21 یوٹیکس، بحمن آباد، لاہور

فون: 02-42-3758897

پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں

آزاد ڈیجسٹ کو اپنے سبسکریپشن

یہ وہ ملک 160 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریداروں کی رقم بذریعہ بینک ازانلٹ

دریافتی اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 880383

Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)

Branch Code No. 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر روڈ، لاہور

فون نمبر: 02-42-35290738 • فیکس: 02-42-35290731

ایڈیٹر: editor@urdu-digest.com

100

حق، اور حقیقت سچائی نے جلد سے جلد 24 ستمبر 2014ء سے ہم کو ملنے لگا

08

اگست 2014ء

www.paksociety.com

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

فہرست

ریاست خاران کے عام گھرانے کا ہونہار فرزند
بلوچستان سے بننے والا پہلا لیفٹیننٹ جنرل
اصولوں کی خاطر استعفا دینے والا پہلا گورنر
عسکری اور سیاسی راز ہائے سرپرست کے امتین
وفاتی کا بیٹے کے نہایت سرگرم وزیر

عبدالقادر بلوچ

کاہوش ربیعہ انٹرویو

گورسنواری



55

ایک منفرد تقریب

متاثرین وزیرستان سے پیمان یک جہتی کانفرنس

اہل لاہور نے دھڑکتے دلوں سے
مہاجرین کی عزیمت کی داستانیں سنیں

الطاف مس فریدی



24

بیت الاقوامی سیاست

پاکستان اور بدلتا عالمی منظر نامہ

قومی تناظر میں تیزی سے جنم لیتی بین الاقوامی دور رس
اور انقلابی تبدیلیوں کی مہکھونیاں افروز داستان

ملیب امجد فریدی

50



اردو ماہنامہ 09 اگست 2014ء

فہرست

اسلامی زندگی کی کہکشاں

33 دیرینہ دوست کے نام

بد نصیب باپ کا نکاح ہوا چشم کشا خط

37 دیشمن شئی میں پہلی اذان

دنائے اسلام کی تازہ اور پھولیں خبروں کا سنگبارتھ

41 اللہ کی رحمت

ایک خدا رسیدہ شخص کی دل آفرین کھانا

44 نبی کریم ﷺ کی تکریم کرنے والے درخت

ان مقدس درختوں کا ایمان افروز بیان جنہوں نے مقام نبوت سے کھانا کھایا۔



لاہور تباہی

کے دیانے پر

برہنہ تیریسوب علی ڈاکٹر

ان گھبر مسائل کا تذکرہ جو شکل آکٹوپس

ہائات کے شیر کو انگل رہے ہیں



185



امیر مزوہ بن مشاق احمد

جعلی بیوی

ایک تیز و طرار تاجر کا قصہ عجب ناگے

127

ذرا مائی انداز میں منہ کی کھانی پڑی

الطاف حسین قزوینی کے قلم سے

17 بسم گہاں کھڑے ہیں

قوی سلامتی کا ایک نیا محور

15 کچھ اپنی زبیاں میں

آزادی کی اگلی منزل

اگست 2014ء

اردو ڈائجسٹ 10

فہرست

آزادی نمبر

71 وطن کی مٹی سے شہادت ————— ڈاکٹر صفدر محمود
جذبہ حب الوطنی سے منجھی تحریر

70 قربانی ————— صالح محبوب
جان اٹھلی پر رک کر باطل قوتوں سے نبرد آزما ہونے والے
فوجی و فسر کا قصہ دل افروز

72 نواب مراد اللہ خان کے آخری ایام —————
غاصب انگریزوں نے بھٹی کی ملکیت ————— اور
مکر فریب کی وجہ سے ہندوستان میں ختم ہونے والی
رام داغ کا منصوبہ —————

81 بھارتی سرکار کی سوہی بھی سازش کا کچھنا
ہندوستان سے آخری خط —————

85 ہندو ائمہ تہذیب میں تیزی سے جذبہ ہونے سے مسلم طبقہ
اشرافیہ کے ایک بزرگ کا الم ناک مار

86 آپ نے قائد کو کیسا پایا؟ ————— منظور حسین عباسی
وہانت و دلیری سے مجسم ہستی کے عظیم پہلو عیاں کرنے
والے بیش قیمت جواب

87 پاکستانی حکمران ... امریکا کی نگہ بندی ————— قیوم لطیفی
آزاد سے غلام ملکیت بننے تک کی ہوشیار داستان

113 نئی روشنی سے پاکستان ————— صبا اکبر آبادی
تحریک پاکستان سے وابستہ ممتاز شاعر کی شاعری سے انتخاب

929 کہاں پر سے اور کب ————— چودھری فرزند غلام
ایک معصوم بچے کا سفر قہر و آگ

143 خالد اسحاق انجمن پاکستان کے قانونی مہینے سے ایک
ابوالاعلیٰ مازع سے مسلم

انتہائی نازک سادہ مزاج اور ولیر قانون دہن کا ذکر خیر
148 اس کے تین کنوئیں ————— عطا الحق قاسمی
شہدائے تحریک آزادی کی لازوال قربانیوں کے

امن ہے جان بھارتی گواہ
951 بھارتی مسلمان انجمن سے ————— سید عامر محمود
بھارت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو معاشرے

سے کاٹ کر رکھ دیا ہے

فہرست

ریچھنی کا حملہ

تو ہم پرست والدین کا المیہ
جنہوں نے چہیتے بیٹے کو اپنی جہالت کی ہیمنٹ پر عادی



فرحان ولایت بٹ

214

موبائل کا ویال

رواجد وکی منیر احمد
ہب مصنفہ کے لیے
جان کا عذاب بن گئی

محبوب عالم

190

مفید غذا ایسی

غذائیں سفالٹوں کا خیر بہدف تھوڑ

ڈاکٹر شائستہ خان



208

مستقل سلسلے

پٹاروں کی قطار

161 شہر افغانستان کی واپسی

231 تبصرہ کتب

229 قصہ کوثر

240 اسلامی کوثر

235 چمن خیال

ورلڈ کپ کے یادگار لمحات

ابوصارم



181

ت بال کے عالمی
میلے میں جنم لینے والے
رکسپ ولفغانٹ کا مذاکرہ

بے خوف

شہر کراچی میں اندھی گولیوں
کے عجیب و غریب غداپ سے
جنم لینے والی دردناک کہانی

ام ایمان

121

رنگا رنگ تعریریں

124 ہزاروں خواہشیں دینی ————— خواجہ مظہر صدیقی

ایک سفر جو نہان مسافروں کو زندگی گزارنے کا سبق دے گیا۔

155 آخری شعبہ ————— ڈاکٹر سلیم اختر

ایک انوکھے فنکار کی حیرت ناک داستان

158 سینما کا عشق ————— بطرس بخاری

ایک فلمی عاشق کا کٹ مٹا ماجرا۔

187 سپریم کورٹ میں اردو کی فتح ————— سجاد قادر

جسٹس جواد ایس خواجہ نے قومی زبان میں مقدمے کی روداد تحریر کر

کے بپے جذب حب الوطنی کا ثبوت دے ڈالا

213 کتاب جگمگ اور میں ————— نجم الحسن

مطالعے سے دور بچا گئے والے خاندان کی چٹ پٹی آپ بیتی

12 اربوڈ ایگسٹ

اگست 2014ء

آزادی کی اگلی منزل

ہمیں آزادی حاصل کیے ۶۸ سال ہونے کو آئے ہیں اور وہ ملک جو لاکھوں انسانوں کی قربانی سے وجود میں آیا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قائم و دائم ہے۔ یہ الگ بات کہ ایک خوریز خانہ جنگی میں اس کا ایک بازو کٹ چکا ہے۔ آزادی جو توانائیوں کا سرچشمہ اور اُمگلوں کا بیش قیمت خزانہ ہے وہ اپنے تحفظ اور استحکام کے لیے ایک ایسے نظام کا تقاضا کرتی ہے جو اس کے ثمرات عام لوگوں تک پہنچاتا رہے اور ان کے دلوں میں تپتی نئی منزلوں کی دریافت کا شعلہ فروزاں دکھ سکے۔ زندہ قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے داخلی اور خارجی چیلنج بھی آتے ہیں اور بعض اوقات انہیں جنگ و جدل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کے ادارے ان کی سیاسی جماعتیں اور ان کی قوت ارادی اور ان کے اساسی مقاصد انہیں مسائل سے نبرد آزما کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ پاکستان جس کا حدود اربعہ بہت کٹا پھٹا تھا اور وہ بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوا تھا اور اس پر کروڑوں مہاجرین کا ہمارا آن پڑا تھا اس کے عوام نے غیر معمولی ایثار، جاس فطانی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا، بھارت سے لٹ پٹ کر آنے والے بھائیوں کو سینے سے لگایا اور چند ہی برسوں کے اندر ایک نئی دنیا تعمیر ہونے لگی۔ بلاشبہ یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ تھا۔

دوسرا معجزہ اس وقت رونما ہوا جب پاکستان کے سائنس دانوں، انجینئروں اور ٹیکنالوجسٹوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور محدود ذرائع سے ایٹمی طاقت حاصل کر لی اور یوں ان کا وطن بھارت کی جارحیت کے خوف سے بڑی حد تک محفوظ ہو گیا، مگر اس کے دوسرے پڑوسی ملک، افغانستان میں پیش آنے والے ہلاکت خیز واقعات نے اس کی قومی سلامتی کے لیے نئے چیلنج کھڑے کر دیے جو اس کی سیاسی، سماجی، عسکری اور مذہبی زندگی پر منفی طور پر اثر انداز ہوئے۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں تو عالمی اور علاقائی سطح پر یہ تاثر پیدا ہوا کہ سوویت

یونین گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا ہے کیونکہ اس کا سمندر سال میں آٹھ نو ماہ منجمد رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ افغانستان کے بعد پاکستان کی طرف پیش قدمی کرے گا۔ اس دفاعی تجزیے کے مطابق افغانستان ہی میں روس کو شکست دینا پاکستان کے لیے ناگزیر ٹھہرا اور اس نے مغربی دنیا کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جو سودیت یونین کی جارحیت کے خلاف متحرک ہو گئی تھی۔ افغان جہاد کوئی دس برس تک جاری رہا۔ اس میں حصہ لینے کے لیے ازبکستان، تاجکستان، چینیا اور مغربی چین سے لوگ آتے اور فاجہ میں تربیت حاصل کرتے رہے۔ یہ لوگ جنہیں امریکہ ”مجاہدین“ کے لقب سے پکارتا تھا، سودیت یونین کی شکست کے بعد فائناں میں آباد ہو گئے جن کے مذہبی نظریات میں بڑی شدت پائی جاتی تھی۔ پاکستان پر سے روسی حملے کا خطرہ تو ٹل گیا، لیکن اس کے حصے میں کھاشکول کچر اور مذہبی شدت پسند آ گئے جن سے فرقہ وارانہ تشدد کو بہت ہوا ملی۔

اکتوبر ۲۰۰۱ء میں امریکی اور نیٹو افواج نے افغانستان پر یلغار کی اور وہاں افغانوں پر ہلک ترین اسلحہ آزمایا۔ طالبان کی حکومت کا خاتمہ ہو جانے کے بعد وہ پسپا ہوتے گئے۔ ان فوج کشی میں پاکستان نے امریکہ اور اتحادی فوجوں کا ساتھ دیا۔ یہ خونریز جنگ تیرہ سال سے جاری ہے جس نے پاکستان کو ناقابل حلافی نقصان پہنچایا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی نے پورا نظام زندگی تلیٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ لڑبک اور تاجک جو افغان جہاد میں پیش پیش تھے وہ اب ہماری آبادیوں فوجی تنصیبات، ہمازی عہادت گا ہوں اور ہمارے ہوائی اڈوں اور ہمارے فوجی دستوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور فرقہ وارانہ تشدد کی دہا گھیلی جا رہی ہے۔ ان دہشت گردوں نے شمالی وزیرستان میں محفوظ ٹھکانے بنا لیے تھے اور اپنا کنٹرول اینڈ کمانڈ سسٹم قائم کر رکھا تھا۔ ان دنوں ان کے خلاف ضرب عضب آپریشن جاری ہے اور بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ ہماری فوج بڑی پامردی سے خطرات کے سامنے ڈٹی ہوئی ہے اور قدر آور خوبصورت جوان جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔ دراصل فوجی آپریشن اس بڑی جدوجہد کا ایک حصہ ہے جو ہمیں آزادی کی اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے طویل عرصے تک جاری رکھنا ہوگی۔ ہماری اگلی منزل اس ذہنیت کا خاتمہ ہے جو مذہبی تنگ نظری اور دہشت گردی کو جہنم دیتی اور طاقت کے ذریعے ایک خاص طرز کی شریعت کا نفاذ چاہتی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تو ہم آئی ڈی ہیز کے دل جیت کر سرخرو ہو سکتے ہیں مگر ذہنیت کی تبدیلی کے لیے ہمارا پورا نظام تعلیم، تمام تر فلسفہ معیشت اور سیاسی جماعتوں میں ارادت کے طور طریق یکسر بدل دینا اور اسلام کے بنیادی تصورات کے مطابق معاشرہ تعمیر کرنا ہوگا۔ ہم سے آج روح آزادی بھی تقاضا کر رہی ہے۔

الطاف حسن قسہ پسی



قومی سلامتی کا ایک نیا محور

یوم آزادی جوں جوں قریب آ رہا ہے نئے نئے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ کیا کوئی سیاسی بھونچال آئے گا یا وزیرستان کی رزم گاہوں اور بتوں کے میدانوں میں قومی بقا کے قلعے تعمیر ہوں گے؟ پاکستان لہو لہو ہے اور داخلی سلامتی کے تحفظ کا آج ایک معرکہ بپا ہے۔ سیاسی اور مذہبی قیادتوں کی بالغ نظری کا کڑا امتحان ہے کہ آزادی کی حفاظت کے لیے کیا وہ نذرانہ پیش کرتے ہیں

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

قطار در قطار امدے چلے آ رہے ہیں اور ہماری بیشتر سیاسی قیادتیں فطرت کے اشارے سمجھنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ ہم اپنے یوم آزادی پر کامل یک جہتی کا مظاہرہ کرنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ شیخ الاسلام طاہر القادری انقلاب برپا کرنے کی تاریخ چودہ اگست کے آس پاس دینے کا عزم رکھتے ہیں جبکہ ”سوتالی“ کے خالق عمران خاں اسی روز دس لاکھ شیعہ ایوں کے جلو میں اسلام آباد کی طرف کوچ کریں گے اور قافلہ گلے سڑے نظام کو جڑوں سے اکھاڑ دیے بغیر واپس آنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ حکومت نے بوکھلاہٹ میں اعلان کر دیا تھا کہ یوم آزادی کے موقع پر ایک مدت بعد اسلام آباد میں فوجی پریڈ ہوگی، یہ دن بڑی تڑک و احتشام سے منایا جائے گا اور کسی کو تقریبات میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وزیر اعظم کے بعض عقابانی مشیروں نے عمران خاں کو گھر کے اندر مقید کرنے کی تجویز دی جو اخبارات میں شائع ہوگئی جس پر سیاسی حلقوں کی طرف سے شدید رد عمل آیا تو اور باب حکومت نے فوجی پریڈ کی تقریب منسوخ کر دی اور پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے چھ ہزار محززین جن میں عمران خاں بھی شامل ہوں گے، جمع کرنے اور یوم آزادی بڑے وقار کے ساتھ منانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بھی اعلان ہوا کہ تحریک انصاف کو اسلام آباد تک مارچ کرنے کے لیے فری پنڈ دیا جائے گا اور حکومت آزادی مارچ کرنے والے سیاسی کارکنوں کے قیام اور حفاظت کے انتظامات میں سبقتیں فراہم کرے گی۔

عوام حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ جناب عمران خاں اور شیخ الاسلام طاہر القادری یوم آزادی

کے آس پاس تماشا لگانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ کیا انہیں آزادی کی عظیم اور بے مثل نعمت کی سرے سے کوئی قدر نہیں اور کیا فلسطینیوں کی حرماں نفسی اور زبانوں حال سے ان کے دل لرز نہیں اٹھتے۔ یہ اور اس نوع کے دوسرے سوالات ذہنوں میں گردش کر رہے ہیں اور اُمٹتے ہوئے خطرات زیر بحث آرہے ہیں۔ سنجیدہ حلقے ارباب اختیار سے بھی یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ آج کے ماحول میں آزادی کی تقریبات منانے کے بجائے انہیں "یوم تشکر" اور "یوم دعا" منانے کی عوام سے اپیل کرنی چاہیے۔ آزادی کی نعمت سے سرفراز کرنے اور ہمیں اس کے تحفظ کی توفیق عطا فرمانے پر خدائے رحمن ورحیم کا شکر بجالانا چاہیے اور "یوم دعا" ان جاں فروشوں کی سلامتی اور حفاظت کے لیے منانا چاہیے جو آٹھ ہزار فٹ کے بلند پہاڑوں پر گہری وادیوں اور جنگلوں میں دہشت گردوں سے برسر پیکار ہیں اور ارض مقدس کی خاطر جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔ اس مسئلہ حقیقت کو بار بار دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ پاکستان ہمارا عزیز ترین سرمایہ اور ہماری زندگی کی شدہ دگ ہے اور اس کے مستقبل سے پورے عالم اسلام اور عالمی امن کا مستقبل وابستہ ہے۔

☆ ☆

مساجد اور بڑے بڑے اجتماعات میں "یوم تشکر" اور "یوم دعا" کا اہتمام کرنے سے ایک طرف عوام کے اندر جوش و خروش پیدا ہوگا اور دوسری طرف قومی ترجیحات کا واضح تعین ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ ہفتوں اور عشروں پر محیط ہونا چاہیے کہ اس کے ذریعے آزادی کی قدر و قیمت ذہنوں اور دلوں میں راسخ ہوتی جائے گی اور یہ عظیم احساس بھی جلوہ گر ہوگا کہ پاکستان کی سلامتی اور اس کا دفاع ہماری اولین ترجیح ہے۔ ملک میں دہشت گردی کے خاتمے سے امن قائم ہوگا، تو دیوقامت سیاسی اقتصادی سماجی اور علاقائی مسائل اور تنازعات حل کرنے پر توجہ دی جاسکے گی اور اصلاحات کا انقلابی عمل بھی شروع کیا جاسکے گا۔ اس وقت قومی قیادت کو اپنی تمام تر توجہ دہشت گردی کے خاتمے اور اس سے وابستہ امور پر مرکوز کر دینی چاہیے کہ یہ ایک صبر آزما اور طویل مرحلہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے مختلف مدارج ہیں اور ہر سطح کے اپنے تقاضے ہیں۔ دہشت گردوں کے خلاف جنگ فوج لڑے گی، مگر اسے مکمل کامیابی کے لیے عوام اور سول اداروں کا تعاون درکار ہوگا۔ سول سوسائٹی کو نظریاتی محاذ پر فعال ہونا اور دہشت گردوں پر اپنے اپنے علاقوں میں کڑی نگاہ رکھنا ہوگی۔ فوجی آپریشن کی کامیابی کے لیے تمام اداروں کی کارکردگی میں ایک مربوط ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ میڈیا کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ فوجی آپریشن کے بارے میں ذہنوں کے اندر شکوک و شبہات پیدا کرنے کے بجائے اس کی افادیت کا شعور گہرا کرنے کے ساتھ ساتھ قومی جذبے بیدار رکھ سکتا ہے۔ اس پورے عمل میں کلیدی نکتہ یہ ہے کہ فوجی آپریشن کے دوران ملک میں امن و امان قائم رہے اور سیاسی محاذ آرائی اور احتجاج کے نتیجے میں کسی قسم کے تناؤ کی صورت حال پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی طرح عوامی سطح پر ہر اس اقدام سے اجتناب کیا جائے جس سے مسلح افواج کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہونے کا امکان پایا جاتا ہو۔ مزید برآں نیشنل کاؤنٹر ٹیررزم اتھارٹی کو پوری طرح فعال بنانے کے لیے جنگی بنیادوں پر اقدامات کرنا ہوں گے جس کے لیے ۳۲ ارب روپے درکار ہیں جب کہ بجٹ میں صرف ۹۰ ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔

آپریشن ضرب عضب کے بارے میں قومی اتفاق رائے تحریک طالبان پاکستان سے مذاکرات کی ناکامی کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس سے قبل سوات میں بھی آپریشن آئل پارٹیز کانفرنس کی تائید کے بعد شروع کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ دونوں آپریشن ان فوجی آپریشنز سے بالکل مختلف ہیں جو مشرقی پاکستان اور بلوچستان میں کیے گئے تھے۔ اسی لیے فوج مالاکنڈ میں کامیاب رہی اور اب شمالی وزیرستان میں بھی دہشت گردوں کا گھیراؤ اور ان کے ٹھکانے تباہ کیے جا رہے ہیں۔ اس آپریشن میں اب تک ۵۰۰ کے لگ بھگ دہشت گرد مارے جا چکے ہیں جبکہ تیس کے قریب فوجی افسر اور جوان بھی شہید ہوئے۔ وہ پٹی جو میران شاہ میر علی اور دتہ خیل پر مشتمل ہے وہاں چپے چپے پر سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔ یہ بہت دشوار گزار ٹیرین (Terrain) ہے اور دہشت گردوں نے یہاں بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہیں۔ اسی پٹی میں خودکش جیکٹس تیار کرنے کے کارخانے بھی تھے اور نو جوانوں کو گوریلا تربیت دینے کے ٹھکانے بھی۔ دہشت گردوں نے اپنا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم بھی یہیں قائم کر رکھا تھا اور جدید ترین میڈیا مرکز بھی خفیہ طور پر سرگرم تھا۔ یہاں سے طالبان کے ترجمان اخبار نویسوں سے خفیہ رابطے رکھتے اور حملوں کی ذمے داریاں قبول کرتے تھے۔ یہ سارے خفیہ مراکز ہمارا کر دیے گئے ہیں اور بڑی احتیاط اور غیر معمولی مہارت سے علاقے ”کلیر“ کیے جا رہے ہیں۔ عسکریت پسندوں کی طاقت بڑی حد تک ٹوٹ چکی ہے مگر گوریلا جنگ روایتی جنگ سے بڑی مختلف ہے کہ دو چار گوریلا فوج کی ایک پوری کیمپنی کی پیش قدمی روک سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ دس ہزار گوریلوں کی سرکوبی کے لیے دو ڈویژن فوج ڈپلائے ہے اور معرکہ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ دو چار ہفتوں میں آپریشن ضرب عضب اپنا پہلا اور دوسرا ہدف حاصل کرے گا۔ پہلا ہدف شمالی وزیرستان کو دہشت گردوں سے صاف کرنا اور دوسرا ہدف اس پورے علاقے پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا ہے۔ اس کے دو اہداف اور بھی ہیں جو علاقے کی ڈویلپمنٹ اور انھیں ہلا خروشاہ انتظامیہ کی تحویل میں دینا ہے۔ ان کے حصول میں بڑا وقت لگ سکتا ہے اور اس میں بڑے مشکل مقام بھی آسکتے ہیں۔

☆☆

کچھ حلقے جیسے یہ جیسے ہیں کہ طالبان سے مذاکرات میں وقت بھی ضائع ہوا اور بڑے بڑے دہشت گرد فرار ہونے میں بھی کامیاب ہو گئے مگر حالات کا یہ ایک سطحی تجربہ ہے۔ دراصل مذاکراتی عمل کے ذریعے سیاسی اور عسکری قیادت امن کو ایک موقع دینے کے علاوہ یہ اندازہ بھی لگانا چاہتی تھی کہ شمالی وزیرستان میں جو دہشت گرد سرگرم ہیں کیا وہ ایک مرکزی قیادت کے تحت منظم ہیں یا ان کے اندر مختلف گروہ پائے جاتے ہیں۔ مذاکرات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ بیرونی باشندے طالبان پر حادی ہو چکے ہیں اور دہشت گردی کے ذریعے پاکستان کی تنصیبات کو ناقابل معافی نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ قبائلی عمائدین کے ساتھ بات چیت سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ شمالی وزیرستان کی عظیم اکثریت دہشت گردوں کے ہاتھوں پر غلام بنی ہوئی ہے جو پاکستان سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان بک اور تاجکوں کے تصور دیکھ کر طالبان کی قیادت اور نامور افراد وہاں سے منتقل ہو گئے اور حافظ گل بہادر اور حقانی نیٹ ورک بھی موقع کو غنیمت جان کر محفوظ مقام پر چلے گئے ہیں۔ یہی وہ طاقتور عناصر تھے جو پاکستان کے

حلیف سمجھے جاتے تھے چنانچہ جب آپریشن ضرب عضب ۱۵ جون کو شروع ہوا تو فوج نے ۴۸ گھنٹوں میں علاقہ خالی کرنے کا ایٹمی میٹم دے دیا اور متنبہ کیا کہ جو لوگ رہ جائیں گے ان سے جنگ ہوگی۔ دو ہفتوں کے اندر آٹھ دس لاکھ مہاجرین خیبر پختونخواہ کے جنوبی اضلاع میں پھینچ گئے کہ وہ دہشت گردوں کے عذاب سے نجات پانا اور فوج کو فری ہینڈ دینا چاہتے تھے۔ آپریشن کے نتیجے میں دو بڑے مسائل پیدا ہوئے ہیں جو سیاسی مذہبی قیادتوں اور سول سوسائٹی کی طرف سے ایک انتہائی مثبت کردار اور قومی وحدت کے ایک ایمان افروز اظہار کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس وقت اہم ترین مسئلہ آپریشن کے متاثرین کی نہایت عمدہ دیکھ بھال کرنا اور ان کے ساتھ بیان و وفا باندھنے کا ہے۔ محض باتیں بتانے اور بیانات دینے کے بجائے ہم ان کے ساتھ حسن سلوک سے دہشت گردی کے خلاف جنگ پیشی طور پر جیتی جاسکتی ہے۔ دوسرا تسخیر مسئلہ یہ ہے کہ دہشت گرد جو پاکستان کے مختلف علاقوں میں اپنی جڑیں رکھتے ہیں وہ فوجی آپریشن کے رد عمل میں جوابی کارروائیاں کر سکتے ہیں جن کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ یہاں علمائے کرام دانشوروں اور عوامی قیادتوں اور خاص طور پر پولیس کو ایک فیصلہ کن رول ادا کرنا ہوگا۔ یہ محاذ فوجی محاذ سے کہیں زیادہ وسیع کٹھن اور صبر آزما ہے اور پارلیمنٹ میں نیکٹا (Nakta) کے قیام کی جو منظوری دی ہے اس کے لیے جنگی بنیادوں پر فنڈ فراہم کر کے اسے پوری قوت کے ساتھ حرکت میں لانا چاہیے۔

شمالی وزیرستان سے لاکھوں افراد نقل مکانی کر کے بہت سرد علاقوں سے نہایت گرم علاقوں کی طرف آئے ہیں۔ ان میں وزیری، گرباز مسعود، تھمن ڈی، دورز خاڑن وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی اپنی قبائلی روایات اور رسم و رواج ہیں۔ انھوں نے تجویز کرکے ذریعہ اسامیل خاں میں پناہ لی ہے۔ زیادہ تر اسکولوں اور مقامی لوگوں کے گھروں میں قیام پذیر ہیں۔ ان کی تعداد کے بارے میں خاصا کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ایک ادارے نے ان کی تعداد دس لاکھ بتائی ہے مگر ناہرا کے حوالے سے ایک رپورٹ میں ان کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ ظاہر کی ہے اور یہ اشارہ دیا ہے کہ لوگوں نے راشن اور نقد رقم حاصل کرنے کی خاطر کئی کئی بار نام درج کرا دیے ہیں۔ حکومت کی طرف سے پوری جانچ پڑتال کے بعد اس ضمن میں ایک ہاتھ بڑھانا چاہیے تاکہ عوام کو معلوم ہو کہ انہیں کس پیمانے پر امداد مہیا کرنی ہے۔ اب تک وفاقی حکومت نے مہاجرین کی امداد کے لیے ایک ارب روپے فراہم کیے ہیں جبکہ کے پی کے حکومت نے ۳۵۰ ملین دیے ہیں۔ حکومت پنجاب نے بھی ہر خاندان کو سات ہزار روپے ادا کرنے کا اعلان کیا ہے جبکہ پورے پنجاب سے کپڑے خیمے اور جالوروں کے لیے چارے سے بھرے ٹرک روانہ کیے جا رہے ہیں۔ علاقائی تنظیمیں اپنے طور پر خدمت خلق میں لگی ہوئی ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارے اوچھا کی رپورٹ کے مطابق آپریشن کے متاثرین کے لیے کم سے کم ۲۸ ارب روپے درکار ہیں۔ اتنی بڑی رقم فراہم کرنے کے لیے پورے ملک میں وسیع پیمانے پر امدادی مہم چلانا ہوگی۔

مالی وسائل کے علاوہ ڈاکٹروں نرسوں کی بڑی تعداد میں ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ان کی دلجوئی کے لیے مردوں اور خواتین کو ان علاقوں میں جانا چاہیے۔ آج کل اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعطیلات ہیں اور طلبہ طلبات اور اساتذہ بڑی تعداد میں خدمت گزاری اور دلجوئی کے لیے ان علاقوں میں جاسکتے اور کچھ روز قیام بھی کر

سکتے ہیں۔ مہاجرین کی بہت بڑی تعداد اردو نہیں بول سکتی مگر محبت کی زبان تو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ میل جول بڑھانے کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔ سیاسی قائدین فرداً فرداً وہاں پہنچے ہیں۔ عمران خاں بھی مکے اور جاوید ہاشمی بھی پہنچے ہیں۔ سید خورشید شاہ نے بھی تفصیلی دورہ کر کے وزیر اعظم کے ساتھ رابطہ کر کے اپنے مشاہدات سے آگاہ کیا اور مہاجرین کو سکیموں کی فراہم کرنے کا مشورہ دیا۔ جماعت اسلامی کے پروفیسر ابراہیم وہاں مستقل قیام کیے ہوئے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں مگر اتنی بڑی تعداد میں شمالی وزیرستان سے مہاجرین کا آنا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام سیاسی قائدین ایک ساتھ جنوبی اضلاع میں جائیں اور ان تین چار اضلاع کا دورہ کریں جہاں مہاجرین ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس طرز عمل سے قومی وحدت کو فروغ ملے گا اور پوری دنیا کو یہ پیغام جائے گا کہ پاکستان کے عوام اپنے مہاجر بھائیوں کے صحیح معنوں میں غم گسار اور چارہ ساز ہیں۔

☆☆

مہاجرین کے ساتھ چنان یک جہتی کی تحریک قومی وحدت کا ایک نیا محور بن سکتی ہے۔ تمام سیاسی مذہبی جماعتیں اور سماجی تنظیمیں یک جا ہو کر میدان عمل میں نکلیں اور ”مہاجرین کے ساتھ چنان وفاقاً باندھو“ کی جھم چلائیں۔ اس مہم کو عوام تک پہنچانے میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ایک انتہائی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس قومی سرگرمی سے لوگوں کی توجہ ابھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے ایک مرکزی نقطے پر مرکوز ہو جائے گی اور سیاسی جماعتوں کے درمیان ایک بلند مقصد کی خاطر یک جاں ہو جائیں گے۔ یہی منظم طاقت آج کل کرانتا پسندوں کے خوابی مصلوں کا سد باب کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی۔ محلے محلے امن کمیشیاں بنائی جاسکتی ہیں جو مشتبہ افراد کی نگرانی کریں گی اور متعلقہ اداروں تک اپنے تاثرات اور معلومات پہنچاتی رہیں گی۔ دہشت گردوں نے فیہر انتہائی میں جرہود کے قریب سواہل پارٹی پر حملہ کر کے آٹھ اہلکار شہید کر دیے ہیں۔ اسی طرح رائے وٹ کے قریب پنڈ ارنایاں میں دہشت گرد وزیراعظم ہاؤس کو نشانہ بناتے اور یوم حضرت علیؑ پر خون بہانے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ پولیس کے دو سو جوانوں نے بارہ گھنٹے مقابلہ کر کے ایک دہشت گرد مار ڈالا اور دوسرا گرفتار کر لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان عسکریت پسندوں کے ساتھ انتہائی جنس کا ایک شخص بھی ملوث تھا۔

اس لرزہ خیز واقعے نے جہاں پولیس کی ”بہادری“ کی دھاک بٹھادی ہے اور شہید ہونے والے پولیس اہلکار کو حکومت پنجاب نے روایت سے ہٹ کر درہٹا کے لیے ایک کروڑ روپے دینے کا اعلان کیا ہے وہاں انتہائی جنس نظام کی ہولناک خامی بھی بے نقاب ہو گئی ہے۔ یہ دہشت گرد دو ماہ سے مکان کرائے پر لے کر رہ رہے تھے اور انڈوس پڑوس اور ہماری ”قابل فخر“ خفیہ ایجنسیوں کو اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ اس نازک اور خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اجتماعی طور پر سرگرم ہونا اور تمام بکھیزوں سے نکل کر داخلی سلامتی کو یقینی بنانا ہوگا۔ دوسرے معاملات چند ماہ کے لیے موخر بھی کیے جاسکتے ہیں۔ حالات کے سرسری جائزے سے یہ بات ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ دقت حکومت اور نظام کو تلپٹ کرنے اور ملک میں انتشار پھیلانے کے بجائے پوری یک جہتی اور قوت کے ساتھ دہشت گردوں کے قلعے مسمار کرنے اور ذہنوں میں اُن کے خلاف جنگ جیتنے کا ہے۔ وہ عناصر جو اس نازک مرحلے میں تھے نئے ایشو اٹھا رہے ہیں اور کسی تیاری اور زمین ہموار کیے بغیر انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ قومی سلامتی سے کھیلنے

کے بھیا تک جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں اور عوام ان کا یہ جرم بھی معاف نہیں کریں گے۔

☆☆

داخلی سلامتی میں بنیادی کردار پولیس اور سول خفیہ اداروں کا ہے۔ صوبوں میں انسٹرل پراجیکٹ مشتبہ لوگوں کی نگرانی کرتی اور حکومت کو خطرات کی پیشگی اطلاع بھی دیتی رہتی ہے۔ بد قسمتی سے پولیس پر سیاسی اثرات غالب آ گئے ہیں۔ سندھ کا حال ہمارے سامنے ہے کہ تین ماہ کے دوران تین آئی جی تبدیل کیے جا چکے ہیں اور جب اتفاق نے اس شخص کو آئی جی لگانے سے انکار کر دیا جس کی صوبے نے سفارش کی تھی تو جناب آصف زرداری کا بیچ و تاب کھاتا ہوا بیان آگیا کہ نواز شریف وزیراعظم رہیں ہادشاہ نہ بنیں۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ تماشا اس لیے ہو رہا ہے کہ سندھ پولیس کے لیے آٹھ ارب کی گاڑیاں اور ساز و سامان خریدا جائے چنانچہ سندھ حکومت ایک ایسا آئی جی لگانا چاہتی ہے جس کے ذریعے بھاری کمیشن کھایا جاسکے۔ پنجاب کی پولیس ایک زمانے میں پیشہ ورانہ مہارت کی شہرت رکھتی تھی مگر سانحہ ماڈل ٹاؤن میں اس کی مہارت کے بجائے اس کی بددیانتی سامنے آئی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ آئی جی پولیس کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں اور نا اہل اور جو نیز افسر ترقی پاتے رہے ہیں۔ وزیراعلیٰ شہباز شریف کو اپنا طریق کار بدلنا اور میرٹ کی حکمرانی کا اہتمام کرنا ہوگا۔ ہمیں ایک ماہ پہلے کوٹہ جانے کا اتفاق ہوا تو یہ جان کر غایت درجہ مسرت ہوئی کہ وہاں پولیس ایک آئیڈیل فورس کے طور پر ابھر رہی ہے۔ اس کے سربراہ کو اپنے منہبی فرائض کی ادائیگی اور اپنی ٹیم کے انتخاب میں کامل آزادی حاصل ہے۔ نواب غوث بخش بارو کی مگران وزیراعلیٰ مقرر ہوئے تو انہوں نے پولیس کو سیاسی اثرات سے محفوظ رکھنے کی روایت ڈالی جو وزیراعلیٰ ڈاکٹر عبدالملک بلوچ نے بھی برقرار رکھی ہے۔ وہاں فوج پولیس کو ٹریننگ دے کر عسکریت پسندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رہی ہے۔

مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ خیبر پختونخوا صوبے میں حکومت نے آئی جی پر مکمل اعتماد کرنے کا ایک درختاں باب رقم کیا ہے۔ جس نے پولیس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ فانا میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے براہ راست اثرات پشاور پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اس صوبے میں بڑے بڑے بم دھماکے خود کش حملے اور ٹارگٹ کلنگ کے ہولناک واقعات رونما ہوئے۔ اے این پی کے لیڈر شہید ہوئے اور مولانا فضل الرحمن کا علاوہ حملوں میں بال ہال بچے ہیں۔ پاکستان کے مایہ ناز پولیس افسر جناب طارق کھوسہ نے انکشاف کیا ہے کہ پی کے پی پولیس نے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ان کے مطابق دہشت گردی کے واقعات ایک سال کے دوران ۱۲ فیصد اور خود کش حملوں میں ۶۸ فی صد اور بم دھماکوں میں ۲۶ فی صد کی آئی ہے۔ پولیس نے دہشت گردی کے ۶۲۶ مقدمات حل کیے ہیں اور وہ ۱۰۹ دہشت گردوں کو انسداد دہشت گردی کی عدالتوں سے سزا دلانے میں کامیاب رہی ہے۔ آئی جی صاحب نے پولیس کی صلاحیت پیشہ ورانہ مہارت میں اضافے کی خاطر پشاور میں اسکول آف انویسٹی گیشن اور ایبٹ آباد میں اسکول آف انٹیلی جنس قائم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ کمانڈ و ٹریننگ لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ جناب طارق کھوسہ نے اُمید ظاہر کی ہے کہ شمالی وزیرستان میں کامیاب آپریشن کے بعد صوبے میں راکٹ

جملے اور مارگٹ ٹھگ کی وار وائیں کم ہو جائیں گی۔

☆☆

بے شک ہمارے تعلیمی ہمارے اقتصادی اور معاشرتی اور ہمارے انتخابی نظام کے اندر بڑے بڑے سقم پائے جاتے ہیں اور ہمارا انتظامیہ ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ مگر آج ۲۰۱۳ء کے انتخابات کا موضوع ایک بھائی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ بلاشبہ ۲۰۱۳ء کے انتخابی نتائج سے اس نظام کے اندر پائی جانے والی نہایت بنیادی خرابی کا پتہ چلتا ہے۔ مسلم لیگ نون نے ۲۰۱۱ء ۱۳۸۷ ووٹ لے کر ۱۶۶ نشستیں حاصل کیں۔ یوں ایک نشست کے حصے میں اوسطاً ۸۹۶۰۰ ووٹ آئے جبکہ پاکستان تحریک انصاف نے دوسرے نمبر پر ووٹ حاصل کیے جو ۹۹۵۴۷۷ تھے اور اسے فقط ۳۵ نشستیں حاصل ہوئیں۔ اس کی ایک نشست کے حصے میں ۲۱۹۳۲۷ ووٹ آئے۔ پیپلز پارٹی نے اس کے مقابلے میں کم ووٹ حاصل کیے جو ۶۹۱۲۱۸ تھے مگر اسے ۳۵ نشستیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک بے حد غیر منصفانہ انتخابی نظام ہے جسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ عمران خاں کی احتجاجی مہم کے نتیجے میں پارلیمنٹ میں انتخابی اصلاحات کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے جسے ہم تحریک انصاف کی ایک بڑی کامیابی قرار دے سکتے ہیں۔ اب اسے اس کمیٹی میں بھرپور حصہ لے کر مطلوبہ اصلاحات کے لیے ایک جمہوری راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ میڈیا اور سول سوسائٹی عمران خاں کا ساتھ دیں گے اور پارلیمنٹ کو انتخابی ڈھانچہ یکسر تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ مگر چہ طاقت ور عناصر آخری دم تک مزاحمت کریں گے۔

ہمارا خاں صاحب کے لیے مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ چند ماہ مہاجرین کا دامن خوشیوں سے بھرنے کے لیے وقف کر دیں اور سیاسی تناؤ میں شدت لانے سے گریز فرمائیں کہ یہ تناؤ شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن متاثر کر سکتا ہے۔ سیاسی معاملات پر گفتگو کرنے کے لیے وزیراعظم نواز شریف انھیں کئی بار دعوت دے چکے ہیں اور سیاسی ممانعت کو فروغ دینے کے لیے ان کے گھر پر بھی جا چکے ہیں۔ درمیانی مدت کے انتخابات کی مہم قبل از وقت مظلوم ہوتی ہے اور ہمارے گرو وائش کے حالات اس کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ افغانستان میں ابھرنے والا انتخابی تنازع ایک خطرناک موڑ اختیار کر سکتا ہے اور نیٹو افواج کا انخلا ہمارے لیے ایک بہت بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرق وسط ایک بہت بڑی تبدیلی کے دھانے پر کھڑا ہے اور عالمی طاقت کا توازن مشرقی ایشیا کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ امریکہ روس اور چین بڑی عالمی طاقتوں کی حیثیت سے سرد جنگ میں داخل ہو چکے ہیں۔ امریکہ معاشی اعتبار سے زوال پذیر ہے جبکہ بھارت کی نئی قیادت کو مہم جوئی سے روکنے کے لیے پاکستان کو چین سے اپنے رابطے مستحکم کرنا ہوں گے۔ پاکستان کے موجود حکمران ان تعلقات میں گرم جوشی پیدا کرنے کی راہ پر گامزن ہیں اور نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کر رہے ہیں۔ چنانچہ عوامی طاقت کے ذریعے حکومت گرانے کی کوشش کرنا ایک منطقی اقدام تصور کیا جائے گا جبکہ داخلی سلامتی کا اولین تقاضا سیاسی استحکام اور ایک مضبوط معیشت ہے۔ گورنر سنیت بینک کی تازہ رپورٹ سے قدرے اطمینان ہوا ہے کہ دہشت گردی اور لوٹاٹائی کے بحران کے باوجود بڑی صنعتوں کی کارکردگی حوصلہ افزا رہی ہے اور نئی سیکٹر میں سرگرمیاں ایک بہتر مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ایک منفرد تقریب

متاثرین وزیرستان سے پیمان یک جہتی کانفرنس

اہل لاہور نے دھڑکتے دلوں سے مہاجرین کی عزیمت کی داستانیں سنیں
 بنوں کے مکینوں کے ایثار اور اخوت کے ایمان افروز واقعات اپنے اندر جذب کیے اور
 اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے اپنے عظیم ہیروز کے لیے محبتوں کے چشمے پھوٹنے لگے
 اُن روح پرور لمحات کی زوداد الطاف حسن قریشی کے قلم سے



اردو ڈائجسٹ 24 اگست 2014ء



مغربی غصب ۱۵ جون سے شروع ہوا تو ج نے دہشت گردوں کے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا اور آپریشن سول آبادی کو اپنے علاقوں سے ۲۸ گھنٹوں کے اندر اندر نکل جانے کا اشارہ دیا۔ ایک ایک دن میں ایک ایک لاکھ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور اٹھانے والوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ اقوام متحدہ کے ایک ادارے کی رپورٹ کے مطابق دس لاکھ مہاجرین ہوں، کرک ڈیرہ اسماعیل خاں، بھکر اور فتح جنگ کے اضلاع میں آچکے ہیں۔ پختون بھائیوں نے ان کا بڑی گرجھوٹی سے خیر مقدم کیا ہے اور اس امر کا زبردست ثبوت دیا کہ پاکستانی معاشرے میں اخوت اور یکجہتی کے جواں جذبے موجزن ہیں۔ اخبارات میں اس نوع کی خبریں بھی آتی رہیں کہ ہمارے محسن ان گنت مشکلات سے دوچار ہیں اور حکومت کے مختلف اداروں کے مابین مثالی تعاون کے فقدان کے باعث مسائل ٹھیک طور پر حل نہیں ہو پارہے جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ لاکھوں بے گھر انسانوں کے ذریعے ہی جیتی جا سکتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ کہ شمالی وزیرستان میں پاکستان کی بقا کی جنگ لڑی جا رہی ہے اور اس کی آخری کامیابی میں آئی ڈی بیز کا بہت کلیدی کردار ہو گا، ماہنامہ ”اردو ڈائجسٹ“ اور ”روشن چمک“ نے ”مذاشرین وزیرستان کے ساتھ بیان یک جہتی کانفرنس“ کا اہتمام کیا جس میں وزیر سینیٹر ان لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ ان کے ساتھ ان فلاحی تنظیموں کے سربراہان بھی مدعو کیے گئے جو مہاجرین کے دکھ بانٹنے اور انہیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے دن رات کام کر رہی ہیں۔ اس تقریب میں دانش ور، کالم نگار، دفاعی امور کے ماہرین، اطلاع عامہ کے نمائندے اور پرنس کمیونٹی کی ممتاز شخصیتیں اور نامور خواتین بھی شریک ہوئیں۔ تقریب میں جہاں بہت سے خیر حضرات نے آئی ڈی بیز کی امداد کی وہاں اردو ڈائجسٹ اور روشن چمک نے اپنے ملازمین کی ایک دن کی تنخواہ اور ادارے کی طرف سے آئی ڈی بیز کی امداد کے لیے تین لاکھ کا چیک دیا۔

جناب الطاف حسن قریشی

ملکوت قرآن مجید کے بعد اردو ڈائجسٹ کے مدیر اعلیٰ نے خواتین و حضرات کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ ہم سب سے پہلے نو لاکھ سے زائد ان عظیم بھائیوں، بہنوں اور بزرگوں کو سلام پیش کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے پاکستان کی

سلامتی کے تحفظ کی خاطر اپنے گھر بار چھوڑ کر سرد علاقوں سے انتہائی گرم علاقوں کی طرف ہجرت کی ہے اور سخت مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے عظیم تر محسن اور ہمارے ناقابل فراموش ہیرو ہیں۔ ہم انہیں لاہور سے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہم ان کی بیش قیمت قربانیوں کی قدر کرتے ہیں ان کے ساتھ چپان دفائن بندھے ہوئے ہیں اور ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور خوشیاں فراہم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس کانفرنس کا دوسرا مقصد ان عظیم خاندانوں کو سلام عقیدت پیش کرنا ہے جنہوں نے انصافِ مدینہ کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے سے لگایا اور انہیں اپنے گھروں میں مہمانوں کی طرح ٹھہرایا۔ اس تقریب کا مقصد اس امر کا اندازہ لگانا ہے کہ شمالی وزیرستان کے متاثرین کو اس وقت اور آنے والے وقتوں میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی اور وہ کس طرح بہتر طور پر فراہم کی جاسکتی ہیں۔ چوتھا مقصد یہ ہے کہ ہم ان مہاجرین کے لیے ایک نوبہ صورت دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس خطے سے دہشت گردی اور غربت و افلاس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ یہ کام جوان جذبوں ہی سے تکمیل پائے گا جس کے لیے گھر گھر اور کوپے کوپے ایک عوامی تحریک اٹھانا ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی زیر بحث لانا ہوگا کہ حکومت کے اداروں کے مابین تعاون میں کیونکر بہتری لائی جاسکتی ہے اور انسانی رشتوں میں گرجوشی کا فطری اظہار کس طرح ممکن ہے۔ ہم اس وقت اپنی زندگی کے بازگ ترین مرحلے سے گزر رہے ہیں اور ہماری ڈرا سی کو تباہی یا غفلت قومی وحدت کو پارہ پارہ بھی کر سکتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وفاقی حکومت کے علاوہ پنجاب حکومت آئی ڈی بیز کی دیکھ بھال میں غیر معمولی سرگرمی دکھا رہی ہے اور وزیر اعلیٰ شہباز شریف اپنے تعلیمی اداروں اور غیر حضرات کو متحرک کر رہے ہیں۔

جناب ڈاکٹر آصف محمود جاہ

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھ گئے اور کسٹم سروس میں آ گئے۔ آج کل کلکٹر کسٹمز ہیں اور ۱۹۹۸ء سے ایک اعلیٰ تنظیم کسٹم ایلٹھ کیئر سوسائٹی چلا رہے ہیں۔ انہوں نے عظیم المہرت مہاجرین کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہوئے کہا:

حکومت اور طالبان کے مابین مذاکرات میں قفل پیدا ہو جانے کے بعد ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب آپریشن ہونے والا ہے چنانچہ ہم نے ایک ایلٹھ پونٹ ہول کے لوج میں یکم جون ہی کو قائم کر دیا تھا۔ اس پونٹ نے متاثرین کو پولیو قطرے پلانے میں بڑی سرگرمی سے کام کیا ہے۔ ہمارے کلینکس میں ۲۵ ہزار کے لگ بھگ لوگ علاج کروا چکے اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ان مریضوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ پاکستان کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کا سامنا ختم کرنے میں جلد کامیاب ہو جائے گا۔ میں اپنی کلینک میں جیٹھا مریضوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ چند قبائلی ہمارے سروں پر آن گھرے ہوئے اور قدرے سخت لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ ہمارے چوکیدار نے پوچھا تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ہماری پانی کی مشین کام نہیں کر رہی اور ہم بوند بوند کو ترس گئے ہیں۔ میں نے ایک آدمی کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ اُس نے واپس آ کر بتایا کہ مشین کی مرمت کے لیے پندرہ ہزار روپے درکار ہیں۔ میں نے اسی وقت پندرہ ہزار روپے دیے اور جب ان کی مشین کام

کرنے لگی، تو وہ خوشی سے رقص کرنے اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

صحبت عامہ کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ ہماری تنظیم نے سو کے لگ بھگ سولہ چھ فرائیم کیے ہیں، جبکہ انہیں یہ ہزاروں کی تعداد میں درکار ہیں۔ ہم تین ہزار کے لگ بھگ بچوں اور عورتوں کو کپڑے اور جوتے فراہم کر چکے ہیں۔ ایک انتہائی توجہ طلب مسئلہ یہ بھی ہے کہ پچاس فی صد کے لگ بھگ خواتین حاملہ ہیں، ان کی ڈیوری کے لیے گائیکا لوجسٹ خواتین کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں پورے ملک سے نرموں اور ڈاکٹروں کو نیم کی صورت میں آنا اور خدمت کے ذریعے محبت اور یگانگت کا گہرا نقش قائم کرنا چاہیے۔ اس وقت عید میلہ منعقد کرنے کی تیاریاں جاری ہیں اور ہم بڑی تعداد میں اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ عید منا سکیں گے اور انہیں تحائف دیں گے۔

میں جناب عبدالقادر بلوچ سے درخواست کروں گا کہ بنوں میں درجہ حرارت اڑتالیس پچاس کے لگ بھگ ہے، اس لیے اس پورے علاقے کو بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اور نقد رقوم ادا کرنے کے سسٹم کو تیز رفتار بنایا جائے، جس کی سست روی سے مہاجرین کی پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں اہل بنوں کے جذبہ اخوت کو سلام عقیدت پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ شمالی وزیرستان سے لوگ نقل مکانی کر کے آرہے ہیں، تو وہ اپنی گاڑیاں لے کر پہنچ گئے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر آئے اور ان کے لیے اپنے کمرے، حجرے اور دالان خالی کر دیے۔ اخوت کی ایسی مثال پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں پانچ کروڑ سے زائد پناہ گزین ہیں، مگر کسی ملک میں انہیں اپنے گھروں میں نہیں ٹھہرایا جاتا۔ یہ شرف صرف پاکستان کے پٹھان بھائیوں کو حاصل ہوا ہے۔

جناب ڈاکٹر حفیظ الرحمن

الخدمت فاؤنڈیشن کے صدر آئی سرجن ہیں اور دنیا بھر میں آئی ڈی ایئر کے معاملات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے شمالی وزیرستان کے متاثرین کے جملہ حالات بیان کیے اور نازک معاملات پر توجہ دلاتے ہوئے کہا:

نیشنل ڈیزاسٹر منجمنٹ اتھارٹی (این ڈی ایم اے) کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۷۷۹۰ خاندان آچکے ہیں اور مہاجرین کی کل تعداد ۹۹۲۷۹۴ بنتی ہے، ان میں ۲۵۲۲۵۰ بچے اور ۲۸۲۲۱۴ خواتین ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمیں کس قدر احتیاط، منصوبہ بندی اور جاں فشانی سے کام کرنا ہوگا۔ پوری قوم اس کار خیر میں شامل ہوگی، تب ہی یہ مشکل مرحلہ سر کیا جاسکے گا۔ وفاقی حکومت، فوج، صوبائی حکومتیں اور مقامی تنظیمیں ایک انتہائی نازک صورت حال سے نبرد آزما ہیں۔ مگر زمینی حقائق یہ ہیں کہ موسم نا قابل برداشت ہے، سامان نہ ہونے کے برابر، صحت سے متعلق مریضوں تک رسائی محدود، خوراک کی مستقل ضمانت ناپید اور مختلف بیماریوں کے پھیل جانے کے زیادہ امکانات۔ این ڈی ایم اے نے جو تازہ ترین اعداد و شمار فراہم کیے ہیں، ان کے مطابق صرف تیس فی صد خاندانوں کو حکومت کی طرف سے نقد رقوم ادا کی جاسکی ہیں اور غذا کے علاوہ ضروری اشیاء مثلاً برتن اور کپڑے وغیرہ صرف ۳۶ فی صد لوگوں تک پہنچی ہیں۔ ان دونوں مدوں میں بڑے پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ رجسٹریشن میں تاخیر اس لیے ہو رہی ہے کہ نادرا کے پاس مطلوبہ افرادی قوت موجود نہیں۔

الخدمت فاؤنڈیشن جو اعلیٰ ہزار رضا کاروں پر مشتمل ہے وہ آئی ڈی ہیز کو ٹرانسپورٹ، صحت، خوراک اور سائباں کی سہولتیں فراہم کرنے کی سرگودھا کوششیں کر رہی ہے۔ اس نے تیس ہزار خاندانوں کو رجسٹر کیا ہے۔ دس ریلیف کمپ قائم کیے ہیں اور اس کی پچیس ایجوکیشن فیلڈ میں ہیں۔ تین فیلڈ ہسپتال بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ فاؤنڈیشن دس ہزار خاندانوں کو فوڈ پیکٹس فراہم کر چکی ہے اور اس نے پندرہ ہزار خاندانوں کو محفوظ مقامات تک پہنچانے کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولتیں مہیا کی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ ستر ہزار مہاجرین کو پینے کا صاف پانی مہیا کیا گیا ہے بچوں اور خواتین کے لیے نئے کپڑے بڑی تعداد میں تیار کیے جا رہے ہیں اور ہمارا پروگرام اپنے بے گھر بھائیوں کے ساتھ عید منانے اور ان میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں بانٹنے کا ہے۔ ہم صحافیوں کو اس تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آئی ڈی ہیز کے نگران وزیر جناب عبدالقادر بلوچ بہت سرگرم ہیں اور مسائل حل کرنے میں زبردست دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے احتجاج پر ہزاروں لوڈ شیڈنگ اب صرف پانچ گھنٹے کی رہ گئی ہے اور اسے بھی فوری طور پر ختم کرنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ مہاجرین سرد علاقوں سے آئے ہیں اور ان کے بچے گرمی سے بلبلا اٹھتے ہیں۔ دائر کوڑا اور پتے بڑی تعداد میں پہنچانا ان کی تکالیف میں کمی لانے کا باعث بنے گا۔

مہاجرین کی آمد کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان پولیو کی بیماری سے محفوظ ہو جائے گا کیونکہ اب تک پولیو کے جتنے بھی کیس سامنے آئے ہیں ان میں سے ۹۵ فی صد کا تعلق شمالی وزیرستان سے تھا۔

جناب ڈاکٹر امجد ثاقب

”الاخت“ ان کا بہت بڑا شاہکار ہے۔ انہوں نے متاثرین کے حوالے سے اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

مجھے بنوں میں ایک شخص ملا جس نے کہا کہ ہماری وہ عورتیں جن کا چہرہ سورج کی روشنی اور چاند کی چاندنی نے بھی نہیں دیکھا تھا وہ آج برہنہ سرراش تلاش کر رہی ہیں۔ اس کے اس فقرے میں بہت گہرا کرب تھا اور میں لرز اٹھا تھا۔ ہمیں راشن فراہم کرنے سے بہت آگے بھی سوچنا ہو گا اور بچوں اور بچیوں کے لیے ہنگامی اسکول قائم کرنا ہوں گے تاکہ ان کا تعلیم اور کتاب سے تعلق قائم رہے اور انہیں کوئی بندوق کی طرف نہ لے جاسکے۔ میں آپ سے اپنی ایک خاموش کاوش کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ الاخت پچاس ہزار روپے تک قرض حسہ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے فراہم کرتی ہے جو ۹۸ فی صد ہمیں واپس ادا کر دیے جاتے ہیں۔ اب تک تین لاکھ افراد ہماری اس بلا سود قرضوں کی اسکیم سے استفادہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے محدود وسائل میں سے بیس روپے مہاجرین کو دینے کا فیصلہ کیا ہے اور آئندہ ایک دو ہفتوں میں اس طرح ساٹھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں گے۔ ہم اگر عام آدمی تک بالخصوص اور طالب علموں میں تحریک پیدا کر سکیں تو مہاجرین کی آباد کاری اور تعمیر نو کے لیے بہت سارے وسائل جمع کیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر امجد ثاقب کی تقریر سے متاثر ہو کر دو طلبہ عرشیان اور ابراہیم نے اپنی پاکٹ منی جو دس دس ہزار روپے پر مشتمل تھی، مہمان خصوصی کی خدمت میں پیش کی جس سے حاضرین میں بڑا جوش و خروش دیکھنے میں آیا۔

جناب عبدالقادر بلوچ

سیٹران کے ٹران وزیر نے اپنی ولولہ انگیز تقریر میں جذباتوں کو گرمایا بھی اور بڑے بڑے حقائق سے پردہ بھی ہٹایا اور بڑے مؤثر انداز میں شمالی وزیرستان کے متاثرین کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

انہوں نے ہمیں دن کا آرام اور شب کو پرسکون نیند مہیا کرنے کے لیے اپنا سکون اور آرام ہم پر قربان کیا ہے اور سخت مصیبتیں جھیلی ہیں۔ ہم ان کی قربانیوں کی جتنی قدر کریں گے اتنا ہی ہمارا مستقبل محفوظ ہوگا اور ہم دہشت گردی کے خلاف جدوجہد میں ان شاء اللہ پوری طرح کامیاب رہیں گے۔ ہمارے لیے آپریشن ضرب عضب ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں سے زیادہ کٹھن اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لیے پوری قوم کو اپنی مسلح افواج کی پشت پر کھڑا رہنا اور کامل یک سوئی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بلاشبہ بنوں اور اس کے ملحقہ علاقوں میں این جی او قابل قدر کام کر رہی ہیں مگر فوج نے سب سے پہلے ایک مہینے کا راشن فراہم کیا اور میری درخواست پر آرمی چیف نے ایک پورا انجینئرنگ ڈویژن متاثرین کی دیکھ بھال ان کی واپسی اور بحال کے لیے متعین کر دیا ہے۔ نقد رقوم اگر حکومت کے بنائے ہوئے طریق کار کے مطابق تقسیم کی جائیں تو وہ بہتر ہوگا کہ وہ نظام شفاف بھی ہے اور اس کے ذریعے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے خاندان بھی مستفید ہو سکیں گے۔ ہم رجسٹرڈ انجی لوگوں کو کر رہے ہیں جو پولیو کے قطرے پیتے ہیں۔ اس کے علاوہ نادرا آنے والے مہاجرین کے جملہ کوائف جمع کر رکھی ہے جو آئندہ کی منصوبہ بندی میں اہم کردار ادا کریں گے۔ فیہر پختونخواہ کے سرکاری حکام کے ساتھ ہمارا تعاون مثالی ہے اور حکومت پنجاب متاثرین کو امداد پہنچانے میں بڑی فیاضی سے کام لے رہی ہے جس کے خوشگوار اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ ہم بے مثال قومی جذبوں کے ذریعے چیلنجز کا بڑی پامردی سے مقابلہ بھی کریں گے اور اس خطے کو ایک شاندار مستقبل سے ہمکنار کر کے دم لیں گے۔ مجھے اس کانفرنس نے بے حد متاثر کیا ہے اور یہاں سے اخوت ایک جیتی اور ہم آہنگی کا جو پیغام دیا جا رہا ہے اس سے قومی سلامتی کا ایک نیا کور وجود میں آ رہا ہے۔

بلوچستان کی فضا میں پرواز پانے والے جناب عبدالقادر بلوچ کی گفتگو میں حقیقت پسندی بھی تھی اور انسانیت کے لیے ایک درد بھی۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ مسائل بہت بڑے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے وزیراعظم خود بنوں گئے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد اعلان کیا کہ مہاجرین کے قیام کو خوشگوار بنانے کے لیے ہم زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کریں گے۔ اسی طرح وزیراعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف بنوں پہنچے اور انہوں نے ہر خاندان کو سات ہزار روپے ماہانہ دینے کا اعلان کیا۔ بہت اچھا ہوتا اگر جناب عمران خاں بھی تعاون کا ہاتھ بڑھاتے اور "پوائنٹ سکورنگ" سے اجتناب کرتے کہ یہ دقت مہاجرین کے معاملے میں سیاست بازی کرنے کا نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے دل جیتنے کے لیے ساری قوتوں کو مجتمع کیا جائے۔

حاضرین نے ان کے اس خیال کی تائید بجا کر تائید کی کہ فوج پاکستان کی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ افسروں اور جوانوں کی قربانیاں پیش کر رہی ہے اس لیے قوم کو پوری ثابت قدمی سے اس کی حمایت جاری رکھنی چاہیے۔ ان کی پُر عزم تقریر نے کانفرنس میں ایک زبردست جذباتی ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

جناب سہیل لاشاری

لاہور چیئرمین کے صدر نے انکشاف کیا کہ ہم پہلی قسط کے طور پر ایک کروڑ روپے اگلے مہینے وزیر اعلیٰ پنجاب کو پیش کر دیں گے، کیونکہ متاثرین کا مسئلہ کم از کم ایک سال پر محیط ہوگا اور اصل مرحلہ آباد کاری کے وقت آئے گا جس میں ہمیں قبائلی روایات کا بے حد احترام کرنا اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں باہمی اعتماد فروغ پاتا رہے۔ آج عام طور پر یہ کہا جا رہا ہے کہ دس لاکھ مہاجرین کا مسئلہ جس قدر گہیر ہے، اسی قدر عوام کے اندر جوش و خروش نہیں پایا جاتا۔ دراصل آسانی آفات کے موقع پر انسانی جذبے پوری قوت سے بیدار ہوتے ہیں جبکہ مہاجرین کا مسئلہ انسانوں کا اپنا پیدا کردہ ہے اور عوام تک اصل حقائق بھی پوری طرح نہیں پہنچے ہیں اور سیاسی قیادتیں متحد نظر نہیں آتیں، البتہ وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف بہت متحرک ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ بزنس کمیونٹی اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد میں پورا پورا تعاون کرے گی اور غانا کو ایک مثالی خطہ بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھارے گی۔ ہمیں پاکستان کے مستقبل کو محفوظ اور تباہناک بنانا اور معیشت کو مستحکم بنانا ہے۔ میرے خیال میں یہاں سے ایشیا جیسے نئے بجائے متاثرین میں نقد رقوم تقسیم کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ وہاں کی مقامی معیشت بھی پھلے پھولے اور مارکیٹ میں رونق نظر آئے۔

محترمہ بشری رحمن

پاکستان کی معروف ماہر نگار اور بلا کی خوش گفتار دانش ور نے کہا: ہمیں شمالی وزیرستان نے نقل مکانی کرنے والوں کی راہوں میں آٹھکھیں بچھا دیں چاہئیں کہ انہوں نے پاکستان کو محفوظ بنانے کے لیے قابل قدر قربانیاں دی ہیں اور سختیاں بھٹی اور جیل رہے ہیں۔ ہماری قوم کے اندر سچے جذبوں کی کمی نہیں، ہم نے زلزلے اور سیلاب کے دلوں میں اسے ناقابل فراموش قربانیاں دیتے ہوئے دیکھا ہے، مگر ہمارے ہاں سامان تقسیم کرنے والے دیانت دار اور فرض شناس ثابت نہیں ہوئے، اس لیے وزیرستان کے متاثرین تک وافر سہولتیں پہنچانے کا ایک قابل اعتماد انتظام ہونا چاہیے۔ ہم فوج کے ساتھ ہیں کہ وہ ہمارے وطن کو محفوظ اور باوقار بنانے کے لیے جانوں کا نذرانہ پیش کر رہی ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ فوج اور عوام کی قربانیاں رانا کاں نہیں جائیں گی اور پاکستان دہشت گردی کے عذاب سے نجات حاصل کر لے گا اور اس کا جغرافیائی محل وقوع اسے عالمی برادری میں اور اس خطے میں ایک قابل اعتبار مقام عطا کرے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے قبائلی بھائیوں کے لیے ایک نہایت خوبصورت دنیا تعمیر کرنا ہوگی اور انہیں قومی دھارے میں لانا ہوگا۔

جناب اوریا مقبول جان

ممتاز محقق اور کالم نگار نے شمالی وزیرستان کے متاثرین کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ جو قومیں اپنے مہاجرین کی حفاظت نہیں کر سکتیں، ان کے حصے میں ذلت و رسوائی آتی ہے۔ میں نے صبرا اور شاتیلہ میں فلسطینیوں کی حالت زار دیکھی ہے اور آج پاکستان کو شمالی وزیرستان کے لاکھوں بے خانہاں لوگوں کا مسئلہ درپیش ہے۔ ہمیں ان کے کرب کو عام کرنا اور اسے عوام کے اندر اتارنا ہوگا۔ ہمیں گلی گلی اور کوچے

کو سچے جا کر انسانی ضمیر کو آواز دینا اور اقتدار کے پجاریوں کو سرنگوں کرنا ہو گا کہ وہی ہماری تہذیبی پس ماندگی اور غریبوں کی زبوں حالی کے ذمے دار ہیں۔

جناب امجد اسلام امجد

انہوں نے اپنی بڑی ہی مختصر نظم پر مبنی جس میں امید اور محبت کا دریا بہہ رہا تھا

محبت ایسا دریا ہے

کہ بارش روٹھ بھی جائے

تو پانی کم نہیں ہوتا

جناب ارشاد احمد عارف

صاحب فکر اور صاحب اسلوب کا لم ٹکار نے کہا

شمالی وزیرستان کے مہاجرین نے بھی ایک تاریخ رقم کی ہے اور اعلیٰ سطحوں نے بھی ہجرت مدینہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اب ہمیں بھی ایک جیتی ہم آہنگی اور ایمار کا ایک درخشندہ باب رقم کرنا ہو گا۔ آج کی اسی کانفرنس نے ہمارے جذبے بیدار کر دیے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایک ہوک سی اٹھی ہے۔ ہمیں آئی ڈی ہیز کے مسئلے کو بڑی اہمیت دینا ہو گی کہ اُن کے ساتھ ہمارا مستقبل وابستہ ہے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپریشن ضرب عضب جلد سے جلد اختتام پذیر ہو اور آئی ڈی ہیز دو چار مہینوں میں اپنے گھروں تک لوٹ جائیں اور تعمیر و ترقی کا عمل تیزی سے شروع ہو سکے۔ ہمیں غائب کو ایک خوب صورت خطہ بنانا ہو گا۔

جناب الیس ایم ظفر

پاکستان کے عظیم دانش ور اور بین الاقوامی شہرت کے حامل قانون دان اور سیاسی لیڈر نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا: میں حکومت کے ہر اقدام کی تعریف کرتا ہوں کہ اُس نے جناب عبدالقادر بلوچ کو آئی ڈی ہیز کی ذمے داریاں سونپی ہیں۔ اُن کا تعلق ایک ایسے صوبے سے ہے جہاں انسانی محرومیوں کے ایک سے زائد ایسے وجود میں آچکے ہیں۔ ہم دہشت گردی کی جنگ میں آئی ڈی ہیز کے ذریعے سرخرو ہو سکتے ہیں اور اُن کے دل جیتنے کے لیے ہمیں مخلصانہ اور دیر پا کوششیں کرنا ہوں گی۔ ہمارے سیاست دان آئی ڈی ہیز پر سیاست بازی کرنے کے بجائے ایک جیتی اور بالغ نظری کا ثبوت دیں۔ آئی ڈی ہیز کے لیے بیرونی امداد لینا ہمارا حق ہے کیونکہ اس سلسلے میں ایک سے زیادہ بین الاقوامی کنونشن موجود ہیں جن کے مطابق اقوام متحدہ کے ارکان ممالک امداد فراہم کرنے کے پابند ہیں۔ یہ جدوجہد بڑی صبر آزما اور طویل ہے اور ہمیں لمبے عرصے تک اپنے جذبے بیدار اور اپنے حوصلے بلند رکھنا ہوں گے۔ اسی طرح مہاجرین کی خبر گیری میں توازن اور تسلسل ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ شروع میں ہم دالفر سہو تیں فراہم کر دیں اور بعد ازاں اس بہاو میں کمی آجائے۔ اس طرح انہیں اچھے دن بھول جائیں گے اور تعلق تارشی یاد رہے گی جو آگے چل کر مسائل پیدا کرے گی۔ اردو ڈائجسٹ اور روشن بیکچر نے اس کانفرنس کا انعقاد کر کے بہت بڑی قوی

خدمت انجام دی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ چراغ سے چراغ روشن ہوں گے۔ ہماری اس کاوش سے فوج کے حوصلے بھی بلند ہوں گے اور سول ادارے بھی صحیح راستے پر کام کرنے کا اپنے اندر ایک داعیہ محسوس کریں گے۔

☆☆

آخر میں عزیزم طیب اعجاز نے اردو ڈائجسٹ اور روشن چنگر کی طرف سے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نوجوانوں کے مقبول شاعر عزیزم وحی شاد نے میزبانی کے فرائض انجام دیے اور سب نے مل کر روزہ افطار کیا۔ تین سو کے لگ بھگ سوچنے سمجھنے والے حاضرین میں اس امر پر اتفاق پایا جاتا تھا کہ پوری قوم کو اپنی تمام تر توانائیاں اور صلاحیتیں مہاجرین کی جھولیاں اٹھی یادوں سے بھر دینے کے لیے وقف کر دینی چاہئیں اور قومی قیادت کو ایک ساتھ متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنے اور قوم کے اندر ایک نئی روح پھونکنے کا اہتمام کرنا ہوگا کہ اس سے سیاسی بھونچال بیٹھ جائیں گے اور انتشار کے بجولے دم توڑ دیں گے۔

روؤف طاہر کے کالم سے اقتباس

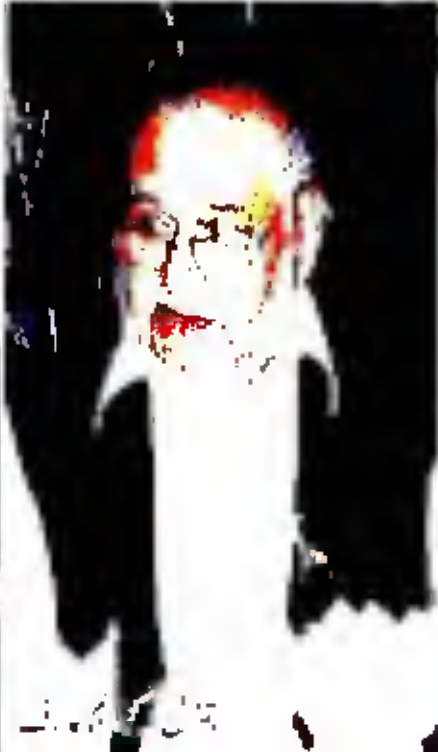
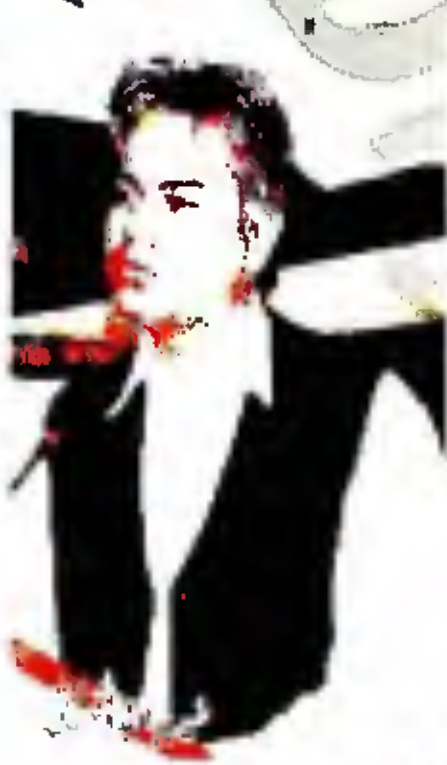
شمالی وزیرستان کے بے گھر ہونے والے افراد کی تعداد 10 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ گزشتہ روز اردو ڈائجسٹ کے زیر اہتمام کانفرنس، اٹلی لاہور اور اٹلی پنجاب کی طرف سے اپنے ان بھائیوں کے لیے پیانا کچیتی کا بھرپور اظہار تھا۔ (اس کی تفصیل جناب الطاف حسن قریشی کے کالم میں آنچل گ)۔ ایک بہت اہم بات جو جنرل (ر) عہد القادر بلوچ نے کہی وہ یہ تھی کہ اس جنگ کے حوالے سے قوم میں دو فوسس نظر نہیں آتا جس کا 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں مظاہرہ ہوا تھا حالانکہ یہ جنگ، ان جنگوں سے کم اہم نہیں۔ اس میں پاک فوج اور سکیورٹی اداروں کے ہزار ہا افراد شہید ہو چکے جن میں ایک تھری سٹار اور نو سٹار جنرل بھی شامل ہیں۔ یہ فوسس سیاسی لیڈر شپ اور میڈیا پیدا کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ہماری تمام تر توجہ کا مرکز یہ جنگ اور (آئی ڈی ہیز سمیت) اس جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل ہوتے، ہمارے ٹانگ شوز، ہمارے کانٹھوں، ہمارے اوار یوں، ہماری مہالس، ہماری ملاقاتوں، ہمارے ڈرائنگ رومز اور تھراپک شپ کا موضوع ہوتے۔

ارشاد احمد عارف کے کالم سے اقتباس

”ہنوں کے عوام نے انصار مدینہ کی یاد تازہ کر دی۔ شمالی وزیرستان کے مہاجرین کو اپنے گھروں میں یوں بسایا جیسے یہ ان کے قریبی رشتہ دار اور دیرینہ تعلق دار ہوں۔ حتیٰ کہ ایک خاندان نے مشران کے کہنے پر ایسے خاندان کو اپنے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی اور لا بسایا جو اس کا دیرینہ دشمن اور مخالف ہے اور عرصہ دراز سے آمادہ پیکار۔“ وفاقی وزیر سلیٹران عہد القادر بلوچ نے ہنوں کے عوام کا ذکر انصار مدینہ کے طور پر کیا تو بال تالیوں سے گونج اٹھا، ہر زبان میں مرحبا لکھا۔ وفاقی وزیر عہد القادر بلوچ نے اپنی تقریر میں نقل مکانی کے لیے کم وقت دینے کے حکومتی فیصلے کا دفاع کیا اور ”بتایا کہ آپریشن ضرب عضب کی حساسیت و نزاکت، دہشت گردوں پر اچانک کاری ضرب لگانے اور انھیں فرار کا موقع نہ دینے کے لیے یہ فیصلہ ہوا، نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دس لاکھ ہے مگر (بقیہ صفحہ 49)

www.paksociety.com

www.paksociety.com



جناب

جناب

جناب

جناب



جہانگیر محمد خان، سید ایشہ، کمران الطاف، سحر علی، سحر علی



سحر علی، سحر علی، سحر علی، سحر علی



رہنمائی اور ارشاد: شہزادہ شہزادہ



زیات لیب



عابد تاج



سید عامر محمود



شب



کتاب



ڈاکٹر حفیظ الرحمن



نبیہ

دسی شاہ



بیان کیم انفرنس

ڈاکٹر محمد عاتق



محسن فارانی

سجاد میر

اردو پبلسٹ

ت 2014

www.paksociety.com

www.paksociety.com



محمد عابد

میرزا احمد

محمد عابد



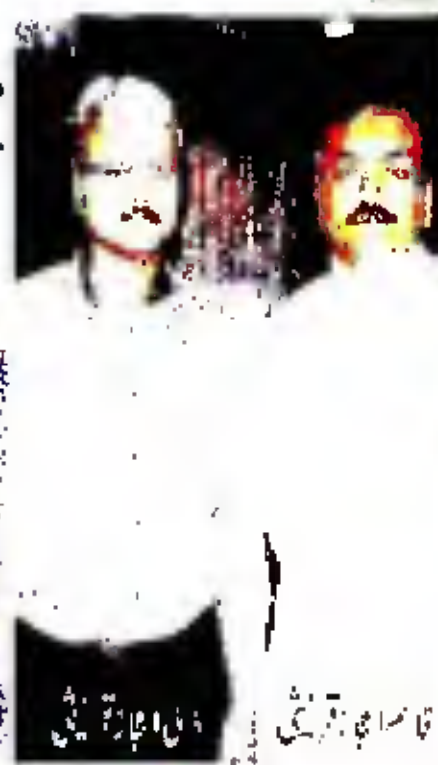
محبت اقبال قریشی



محمد اسلم ایچ



محمد اسلم ایچ



قاسم قریشی



ارشاد علی

2014

ناقابل فراموش
کا فیملہ کرلوں گا، یہ بھی میرے وہم و گمان میں نہ تھا۔
ایسا کیسے ہو سکتا تھا!

ہم نے سارا بچپن گرمی کی دوپہروں میں گلیوں
میں ساتھ کھیلتے گزارا۔ جب ہم بڑی بی کے ہاؤس
خانے سے آلو کے پرائے چراتے جو اس نے اپنے
اکھوتے پوتے کے لیے سنبھال کر رکھے ہوتے تھے، تو
وہ کیسا داؤلا مچاتی۔ بچپن کی ساری شراعتیں اور
مہبات ہم نے مل کر انجام دیں لیکن تم سدا کے
چالاک تھے۔ ہمیشہ پھٹاؤسے کی طرح غائب ہو
جاتے اور میں پکڑا جاتا۔

اور وہ شاہی یاد ہے، کیسا بدھو ہوتا تھا۔ میں، علی،
ساجد اور تم! ہم سب مدر سے کے باہر ہر دوسرے
تیرے روز اپنے بے تے یہ کہہ کر اس کے حوالے کرتے
کہ وہ ان کا خیال
رکھے۔ ہم بھنے چنے
لے کے ابھی آئے،
پھر مل کے کھائیں
گے۔ وہ بھارا بھی
شاید چنوں کے
لاچ میں بھری
دھوپ



دیرینہ دوست کے نام!

پچھتاؤسے وندامت کے آنسوؤں سے تر
بد نصیب باپ کا لکھا ہوا ایک چشم کشا خط

سائزہ صلاح الدین

عبد جبار

از میرے دیرینہ دوست!
چونکہ میں جانتا ہوں تم ہمیشہ کی طرح

عیش میں ہو گے، اس لیے تمھاری خیریت
دریافت نہیں کروں گا۔ رہی میری خیریت تو اس
سے تم کبھی بے خبر رہے ہی نہیں۔ ہاں! تم ہمیشہ
سے یاروں کے یار تھے۔ ہر دم دوستی پر آمادہ!

یوں تو ہم بچپن سے دوست رہے ہیں لیکن
وقت کے ساتھ اس دوستی میں اتنی شدت آجائے
گی۔ میں جانتا نہ تھا۔ زندگی کے چالیس سال
گزرنے کے بعد اچانک میں تم سے قطع تعلق

بستوں کی چوکیداری کرنے لگتا۔ جب ہم چوکیاں بھرتے گھر پہنچ جاتے تب اسے ہوش آتا۔ وہ سارے بسترے گھسیتا ہوا نہ صرف گھر پہنچتا بلکہ ہم سب کو فردا فردا دروازے پہ بستہ دے کر جاتا۔

میں آج تک سمجھ نہیں پایا کہ کیا وہ واقعی ایسا ہی بے وقوف تھا یا بننا تھا؟ آخر اتنی سیدھی سی بات اس کی سمجھ میں کیوں نہ آتی تھی؟ کیا وہ چنوں کے چند دانوں کے لالچ ہی میں بھری دھوپ میں کھڑا رہتا تھا؟ نہیں! مجھے ایسا نہیں لگتا۔ وہ کچھ اور تھا..... کچھ اور جو اسے دھوپ میں کھڑا رکھتا۔ پتا نہیں کیا؟

تمھارا کیا خیال ہے؟ تم یقیناً جانتے ہو۔ لیکن بتاؤ گے نہیں، میں جانتا ہوں اور بستہ دیتے وقت وہ عجیب ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا، تو میرا دل ڈوب جاتا۔ جیسے کہہ رہا ہو ”مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔“ حالانکہ اسے ہم سے یہی امید ہونی چاہیے تھی۔ لیکن وہ واقعی اسحق نہ تھا، اسحق تو ہم تھے لیکن تب مجھے اس بات کی سمجھ نہ تھی۔

ابا کو تم سے سخت جڑ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا تمھاری وجہ سے دن بدین آوارہ ہوتا جا رہا ہے اور وہ یقیناً ٹھیک سوچتے تھے۔ (ابا کو تو تم سے اللہ واسطے کا پیر تھا۔ ہاں! اللہ واسطے کا پیر۔ مگر میں کیا کرتا، تم تھے ہی اتنے ٹٹ کھٹ، شوخ، زندگی سے بھرپور۔ تمھارے بنا زندگی بالکل بے رنگ لگتی۔ تب گھر کی فضا میں بلا وجہ ٹھنسن محسوس ہوتی۔ ہر دم نظریں دروازے پر لگی رہتیں۔ دل چاہتا، دروازہ توڑ کے اس ٹھن زد فضا سے باہر نکل جاؤں۔ اڑ کر تمھارے پاس آ پہنچوں۔ پھر سازشیں ہوں، ایذا پہنچاؤں اور قہر مل ہو۔

تب ہم کیسے ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

میں ششیں اور تم مجھے خوش رکھنے کے لیے کیا کچھ نہ کرتے۔ ایک دوسرے کی خواہش پوری کرنا جیسے ہمارا نصب العین بن گیا تھا۔ بلکہ تمھاری محبت کے سامنے اپنی اکثر بچ نظر آتی۔ تم تو میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے۔ میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے بے چین رہتے۔ ہم نفس کی تمنا پورا کرنے کے لیے منصوبے بناتے اور اسے پورا کر کے ہی دم لیتے۔ جائز یا ناجائز۔ ہاں! اور یہی وہ بات تھی جو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں۔

کالج میں بھی ہم نے کوئی شوق اور رنگینی ہاتھ سے نہ جانے دی اور پھر ہاسٹل میں تو جیسے کھلی مچھوٹ مل گئی۔ آف ایجب میں وہی مزہ تمھارے ساتھ سینما دیکھنے گیا تو پیرا دل بلیوں اچھلی رہا تھا۔ لگتا تھا ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ جب ہیرو ہیروئن کے قریب آتا مجھے بلا وجہ غصہ سے پسینے آنے لگتے۔ لیکن سینما کے ہفتہ وار ہاتھ اندہ چکر نے میرا دل کافی حد تک کم کر دیا۔ اب میں آرام سے فلم دیکھ سکتا تھا۔ نہ دل پسلیاں توڑنے کی کوشش کرتا، نہ دھڑکن بے ترتیب ہوتی۔

میں ان دنوں کس قدر خوش رہنے لگا تھا۔ اب میں جھینپو سادہ پہنا کر لڑکا نہیں رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری شخصیت دن بدن نکھرتی جا رہی ہے۔ اب میں کسی بھی لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آسانی سے بات کر سکتا تھا، بالکل شہری لڑکوں کی طرح! یا ان فلمی ہیروئن کی طرح جو ہیروئن سے بات کرتے وقت ذرا نہ گھبراتے اور بڑی بے ہاکی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی محبت کا یقین دلاتے۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میری آنکھیں بے ہاکی نہیں بے حیا ہو گئی ہیں۔ ان میں شرم نہیں رہی

تھی۔ پہلے مجھے جو ہر راد چلتی لڑکی بہن لگتی تھی، اپنی محبوبہ بن گئی۔ لیکن تب یہ سمجھ نہ تھی۔

کچھ دن قبل اسی میں نے قرآن میں "خطوات الشیطان" کی تفسیر "شیطان کے قدم" پڑھا۔ تفسیر میں لکھا تھا کہ چھوٹے چھوٹے گناہ جنہیں تم گناہ نہیں سمجھتے، انہیں خطوات الشیطان کہتے ہیں یعنی شیطان کے قدم! واقعی! جانے کب، کیسے بچپن کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں، ماں باپ کو ستانا، چھوٹے موٹے فیشن، چند ایک فلمیں، سگریٹ سے شراب اور شراب سے ماحرم عورت تک کا سفر طے کرتی گئیں اور مجھے پتا ہی نہ چلا۔ اور جب پتا چلا، سب ختم ہو چکا تھا۔ میں راکھ کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ نہ علم، نہ ہنر، نہ ایمان، نہ حیا، میرے ہاتھ خالی تھے، بالکل خالی۔

مجھے یہ سمجھنے میں چالیس سال لگ گئے کہ تم میرے دوست نہیں دشمن تھے۔ حالانکہ یہ سامنے کی بات تھی۔ دادی کہتے کہتے مر گئی "وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ ابا کی زبان ڈالتے اور نصیحتیں کرتے کرتے اکڑ گئی، دن کی لاشی بھی بے اثر ثابت ہوئی۔ لیکن میں وہاں ہوتا تو پلٹتا؟ میں تو کسی الف لیلولی دنیا میں رہا تھا۔ جہاں جوش تھا، خوشیاں تھیں، دوسرے کی خوشیاں اپنے کھاتے میں ڈالنے کا حق تھا۔ ہر بات اور ہر خواہش جائز تھی۔ کوئی حرام حلال کا ٹھکانہ تھا۔ ہر شے جس کی تمنا ہوتی، چھیننے کا حق تھا۔ ساری دنیا اپنی دسترس میں تھی۔

ہوش تو تب آیا جب میری بیٹی کا جسم دن بدن برہنہ ہوتا گیا۔ پہلے اس کے کپڑے تنگ ہوئے، میں نے دھیان نہ دیا۔ پھر اس کی آستینیں غائب ہو گئیں، مجھے پتا نہ چلا۔ آنکھیں اس قدر عادی ہو گئیں۔ پھر میرا بیٹا نشے میں دھت یمن فجر کے وقت آنے لگا۔ پہلے وہ

دیر سے آتا۔ میں نے دھیان نہ دیا۔ آخر یہی تو دن تھے زندگی سے لطف اندوز ہونے کے! پھر وہ شراب پینے لگا۔ میں نے نظر انداز کیا۔ یہ امرا کی تحض ایک علامت ہی تو تھی۔ لیکن جب دھیان دیا تو سب ختم ہو چکا تھا۔ وہ خطوات الشیطان کی مکمل تفسیر بن کر میرے سامنے آ گئے۔ وہ "میرے" بنے تھے۔ وہ ایسے نہ ہوتے تو کیسے نکلتے؟ وہ جو کرتے، سو کم تھا۔ میں انہیں کیا کہتا؟ کیسے کہتا؟ کس منہ سے کہتا؟ یہ میرا اپنا پویا ہوا ننگ تھا اور اسے میں نے ہی کاٹنا ہے۔ اس بول کے درخت کا ایک ایک کاٹا مجھے اپنے ہاتھ سے چٹنا ہے، چاہے میرے ہاتھ کتنے ہی بولہبان ہو جائیں۔

زندگی کس قدر عجیب ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ ہم غویہ ہیں۔ ہمارا دل بھی کس قدر عجیب ہے! کب کیا مانگ بیٹھے، کب کس کا ساتھ چھوڑ دے، کب کس گلی کا رکتا بنے، کب کس در کا گدا بن جائے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ سب پتا چلتا ہے۔ کون سی گلی دلدل کی طرف جاتی ہے اور کون سا راستہ منزل تک جاتا ہے، ہمیں علم ہوتا ہے۔ مگر یہ دل، نہیں! دل نہیں مجھے ٹکس کہنا چاہیے۔ نفس اماردا ہاں وہی نفس امارہ جو صرف برائی کی خواہش کرتا ہے جس کی خواہشات لامحدود اور بے لگام ہیں۔ جسے ہم دونوں نے مل کر پوچھا۔ دل سے اپنا مہبود تسلیم کیا۔ اور ساری زندگی پر محیط ایک ایسا طویل سجدہ اسے کیا کہ اب چاہنے کے باوجود نہ سر اٹھایا جاتا ہے نہ کمر ہی سیدھی ہونے پر آمادہ ہے۔ لیکن میں یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں؟ تم تو سب جانتے ہو۔

تم میرے ساتھ جتنا کھیلنا چاہتے تھے تم نے جی بھر کے کھیلنا اور میں تمہارے ہاتھ کا کھلونا بنا رہا۔ کس کی

غزل

پھر زرخ بدل رہی ہے ہوا حوصلہ رکھو
تبدیل ہو رہی ہے فضا حوصلہ رکھو
آندھی کا زور ٹوٹا تو ہو چکا شروع
پھر جل اٹھے گا بجھتا دیا حوصلہ رکھو
اک ذر کے بند ہونے پہ سو در کلیں گے پھر
پھر آ رہی ہے کوئی صدا حوصلہ رکھو
نتے نہیں کسی کی رہتی خدا تو کیا
نتا ہے سب کی عرش خدا حوصلہ رکھو
گمراہیوں کے دور بھی آتے ہیں راہ میں
آئے گا وہ چاہتا حوصلہ رکھو
کچھ مارے حیات کا حصہ ہیں لازمی
کیسا ہی سانچہ ہو صدا حوصلہ رکھو
کچھ احتیاطیں اور ضروری ہے کچھ علاج
پاؤ گے ہر مرض سے شفا حوصلہ رکھو
آئے گی زندگی میں قیامت بھی بار بار
ہر روز ہو گا حشر ہوا حوصلہ رکھو
ظالم کی رہی کرنا ہے کچھ دیر کو دراز
ورنہ خدا ہے سب کا خدا حوصلہ رکھو
دم توڑنے کو ہیں یہ پرانی سیاستیں
وہ آ رہا ہے دور نیا حوصلہ رکھو
روحی زیادہ ہوتے ہو بے چین کس لیے
خود ہی گلے ملے گی فضا حوصلہ رکھو
(روحی کنجاہی لاہور)

مرضی سے؟ اپنی مرضی سے۔ میں نہیں جانتا، اپنی تکلیف
اور فریاد لے کے کس کے پاس جاؤں؟ میں اپنا لہو کس
کے ہاتھ پہ ڈھونڈوں اور اپنے لاشے کا بوجھ کس کے
کاندھے پہ بھینکوں؟ میں اپنا مجرم آپ ہوں اور قاتل
بھی! میں نے خدا کے واضح کردہ دو راستوں میں سے
غلط راستہ خود چنا جو رنگین مگر تباہی کا تھا۔ کیا آج میں خدا
سے سوال کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ جو ہو رہا ہے
کیوں ہوا؟ کیا میں تم سے..... اپنے بدترین دشمن سے
یہ سوال کر سکتا ہوں؟ کیا زندگی کے ایسے موڑ پر ہمیں
سوال کرنے کا اختیار ہے؟ یقیناً نہیں۔

جو بھی ہے، اب میں یہ بھیانک کھیل، تھیں،
اپنے بچوں کی زندگی سے نہیں کھیلنے دوں گا۔ حالانکہ میں
جانتا ہوں کہ اس عزم کے لیے نہایت حقیر ہوں۔ اسی
لئے کہوں گا کہ اگر اللہ نے چاہا تو

میں جانتا ہوں میں یہ کام تنہا نہیں کر سکتا۔ مجھے
اس کا در مطلق کی مدد لینی ہوگی جو ساری طاقت رکھتا
ہے۔ جس کی ساری خدائی ہے اور جو ہر چیز پر قدرت
رکھتا ہے..... تم پر بھی۔ میں اس سے مدد لوں گا اور اس
غفور الرحیم سے مغفرت طلب کروں گا۔ ہر چند کہ
میرے گناہ سمندر کے جھاگ برابر ہیں مگر میں اس سے
اعانت کی استدعا ضرور کروں گا۔

آج سے ہمارے راستے الگ ہیں۔ ہر چند کہ تم
قبر تک میرا ساتھ نہ چوڑو گے کہ روز ازل تم اس کی
مہلت لے چکے۔ مگر میں بھی اسی ذات سے تمھارے
خلاف مدد مانگتا رہوں گا جس نے تمھیں مہلت دی،
ہمیں تو بہ کی توفیق بخشی اور یقیناً وہ چلنے والوں کا
ساتھ دیتا ہے۔

دیرینہ دوست، ایلین ملون کو ملے۔

اسلامی خبرنامہ
تقریب میں شریک ہوئے۔

ویٹیکن سٹی میں پہلی اذان

دنیا کے اسلام کی تازہ اور اچھوتی
خبروں کا مشک بار تحفہ

فاروق حسناٹ

اس تقریب کی خاص بات یہ ہے کہ ویٹیکن سٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہاں کی فضاؤں میں اذان کی صدا گونجی۔ نیز قرآنی آیات بھی پڑھی گئیں۔ اور اصل محمود عباس اور شمعون پیریز دونوں اپنی مذہبی دعائوں کی وساطت سے خطے میں امن و محبت کے طلب گار ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسطین میں اسرائیلی حکومت کی ہٹ دھرمی اور ظلم کے باعث امن علقا ہے۔ جیسے ہی وہ راہ راست پر آئی، فلسطین خود بخود خطہ امن بن جائے گا۔ بہر حال امن کی خواہش ہی نے کچھولک عیسائیوں کے گڑھ ویٹیکن سٹی میں صدائے اذان بلند کرا دی۔ امید ہے کہ یہ منہادک موقع فلسطینیوں کے لیے خوش خبری لائے گا۔ حماس اور ان کے مابین معاہدہ دقتی ہوئی چکا۔ اب فلسطینیوں کی متحد قوت اسرائیل کو شکست دے سکتی ہے۔

ملاوی میں اشاعت اسلام

جنوب مشرقی افریقہ میں واقع ملک ملاوی میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ لوگ آباد ہیں۔ ان میں سے تقریباً

کچھ عرصہ قبل کیتھولک عیسائیوں کے پوپ فرانس نے اسرائیل اور فلسطین کا دورہ کیا تھا۔ وہیں انھوں نے فلسطینی صدر، محمود عباس اور اسرائیلی صدر شمعون پیریز کو ویٹیکن سٹی آنے کی دعوت دی۔ مدعا یہ تھا کہ وہ علاقے میں قیام امن کی خاطر دعائیہ تقریب میں شرکت کر سکیں۔

چنانچہ جون کو پوپ فرانس شمعون پیریز اور محمود عباس ویٹیکن سٹی میں منعقد ہونے والی دعائیہ



دقتاً برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

البتہ جمہوری حکومتیں آنے سے مسلمانوں کو یہ سنہرا موقع بھی ملا کہ وہ سیاست میں حصہ لے سکیں۔ چنانچہ اب وہ ایک سیاسی جماعت، مسلم فورم فار ڈیموکریسی اینڈ ڈویلپمنٹ کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ متحد ہو کر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔

مذکورہ بالا اسلامی جماعت کے سربراہ شیخ حاجی جعفری کوہنگا ہیں۔ وہ بتاتے ہیں: "ملاوی میں بعض انتہا پسند عیسائی تنظیموں کی سعی ہے کہ اسلام اور دہشت گردی کو لازم و ملزوم قرار دیا جائے۔ ہم بھرپور طریقے سے ان کی کوششوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔"

مشکلات کے باوجود یہ خبر خوش آمد ہے کہ ملاوی میں اسلام کی اشاعت تیزی سے جاری ہے۔ آج سے بیس سال قبل باشندگان ملاوی میں ۲۵ فیصد لوگ مسلمان تھے۔ اب ان کی تعداد ۳۵ فیصد تک جا چکی ہے۔ اگر بڑھوتری کی یہی رفتار رہی، تو اسید ہے اگلے چار پانچ مشروں میں ملاوی مسلم اکثریت کا حامل ملک بن جائے گا۔

مذہبی لوگ مختیر ہوتے ہیں

پچھلے ماہ مشہور برطانوی خبر رساں ایجنسی بی بی سی نے برطانیہ میں ایک انوکھا سروے کرایا۔ سروے میں چار ہزار مرد و زن سے پوچھا گیا کہ وہ ہر مہینے کتنی رقم فلاحی و خیراتی سرگرمیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ آخر میں یہ دریافت کیا گیا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

سروے کے مطابق ایک ہزار مرد و زن نے خود کو لاد مذہب قرار دیا۔ اور انکشاف ہوا کہ وہی فلاحی

۳۵ فیصد مسلمان بقیہ عیسائی ہیں۔ ملاوی ایک غریب ملک ہے اور یہاں طویل عرصہ آمریت کا دور دورہ رہا۔ تاہم ۱۹۹۳ء میں جمہوریت متعارف ہوئی، تو یہ تبدیلی مسلمانوں کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔

سولہویں صدی میں عرب اور صومالی مسلمان تاجر اسلام کا پیغام لے کر ملاوی پہنچے۔ ان کی تبلیغ سے کئی مقامی باشندے مسلمان ہو گئے۔ لیکن جب برطانیہ نے اسے نوآبادی بنالیا، تو سرکاری سرپرستی میں پوری وسیع پیمانے پر عیسائیت پھیلانے میں کامیاب رہے۔



ملاوی مسلمان

تاہم اب جمہوریت کے باعث ملاوی میں اسلام بہ سرعت پھیل رہا ہے۔ اس ضمن میں مملکت کے مشہور عالم دین ڈاکٹر عمران شریف بتاتے ہیں: "۱۹۹۳ء سے قبل آمریت کے باعث مسلمان مختلف پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن جمہوریت آئی، تو ہمیں موقع ملا کہ ملک میں مدارس، طبی مراکز اور اسکول قائم کر سکیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کا معاشی و معاشرتی درجہ پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہے۔"

ازدوئے جمہوریت اب عیسائی ہوں یا مسلمان، سب شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ تاہم جمہوریت پنپنے سے معاشرے میں کچھ خرابیوں نے بھی جنم لیا۔ مثلاً خواتین کی محفلوں کا رواج ہو گیا۔ بہر حال مسلمان گھرانوں کی بہو بیٹیاں اپنا پردہ اور

حکمران بڑے روادار اور دینی انسانیت کے بہادر تھے۔
۲۰۱۲ء میں آخر ہلدیہ دروغیہ نے سلطان عبدالحمید
کی امداد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ویسٹ کورٹ
ہاؤس میں ایک یادگاری تختی نصب کر دی۔ ڈیڑھ صدی
قبل یہ ہاؤس ”سنی ہال“ تھا۔ ترک ملاحوں نے وہیں
قیام و طعام کیا تھا۔

جاپانی یونیورسٹیوں میں حلال کھانا

یہ خبر خوش آئند ہے کہ پچھلے چار برس کے دوران
ٹوکیو یونیورسٹی سمیت کئی جاپانی یونیورسٹیوں نے اپنے
ہوشلوں اور کپے ٹیریا میں حلال کھانا متعارف کرا دیا ہے۔
چنانچہ جاپانی یونیورسٹیوں میں مقیم ہزار ہا مسلمان طلبہ و
طالبات اب بلا کھٹکے من پسند حلال کھانا کھا سکتے ہیں۔

دراصل جاپانی حکومت چاہتی ہے کہ ۲۰۲۰ء تک
مقامی یونیورسٹی میں تین لاکھ غیر ملکی طلبہ و طالبات زیر
تعلیم ہوں۔ اس وقت ان کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ
ہے۔ چونکہ بہت سے طالبان علم، مسلم ممالک مثلاً
لائبیا، اندونیشیا، مشرق وسطیٰ وغیرہ سے آتے ہیں، لہذا
ان کی سہولت کی خاطر یونیورسٹیوں میں حلال کھانے
متعارف کرا دیے گئے۔

یاد رہے، جاپان میں اسلام بہ سرعت پھیل رہا
ہے، حالانکہ وہ وہاں صرف ایک سو سال قبل ہی پہنچا۔
فی الوقت ملک میں سو لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ ان میں
اکثریت جاپانی مسلمانوں کی ہے۔ جاپانی زبان میں
قرآن پاک کے عمدہ ترجمے بھی ہو چکے۔ حقیقتاً انہی
ترجمہ قرآن پاک کے ذریعے جاپان میں اشاعت
اسلام بڑھ چڑھ کر ہوئی۔

برطانوی ہلدیہ میں انتخابات اور مسلمان

ماہ مئی میں برطانیہ میں ہلدیہ میں انتخابات منعقد

ہوئے۔ ان میں برطانوی مسلمانوں نے بھی بڑھ چڑھ
کر حصہ لیا۔ یوں ثابت ہو گیا کہ برطانیہ کی سیاست
میں مسلمان رفتہ رفتہ سیاسی قوت بن کر ابھر رہے ہیں۔
وہ وقت دور نہیں جب سیاسی و حکومتی معاملات میں
مسلمانوں کی رائے کو بھی اہمیت دی جائے گی۔

برطانوی ہلدیہ میں ”۸۹ء“ مسلمان
امیدوار شریک ہوئے۔ ان میں سے ”۳۵۳“ لیبر پارٹی
کے پلیٹ فارم سے کھڑے ہوئے۔ اس امر سے احساس
ہوتا ہے کہ برطانوی مسلمانوں میں لیبر پارٹی سب سے
زیادہ مقبول ہے۔ اس کے بعد ۱۲۳۶ امیدواروں نے
کنزرویٹو پارٹی کی طرف سے انتخاب لڑا۔

برطانیہ کی نئی سیاسی پارٹی، لبرل ڈیموکریسی نے بھی
”۲۳“ مسلم امیدوار کھڑے کئے۔ ۲۳ مسلمانوں نے
مرکزی پارٹی کی طرف سے الیکشن میں حصہ لیا۔
۲۰ مسلمان بہ حیثیت آزاد امیدوار کھڑے ہوئے۔ حد یہ
ہے کہ بظاہر مسلمانوں کی مختلف جماعت، پو کے
انڈیپنڈنس پارٹی نے بھی مسلم امیدواروں کو ووٹ دیا۔
ہلدیہ میں انتخابات ”۶۱“ کونسلوں میں منعقد ہوئے۔

ان میں سے ”۱۰۰“ کونسلوں میں مسلمان امیدواروں
نے بھی انتخاب لڑا۔ ان کونسلوں میں سے ”۶۳“ فیصد
لندن ”۷۷ فیصد“ پارک شائر (بریز فورڈ)، مل، لیڈز،
روتھرم، شیفلڈ، ویک فیلڈ اور ۵۳ فیصد ویسٹ
لینڈز، برمنگھم، کوڈنٹری، ڈیولڈی میں واقع ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۹۸ مسلم امیدواروں میں
۱۹۳ خواتین بھی شامل تھیں۔ اب تک کی اطلاعات کے
مطابق مسلمان امیدواروں کی اکثریت الیکشن میں
کامیاب ہو چکی۔ امید ہے کہ وہ اپنی مسلم کیونٹی کی حالت
بہتر بنانے کے لیے سرگرم عمل ہوں گے۔ ♦♦♦

اسلامی واقعہ

کہیں اور باجماعت نماز ادا کریں۔ چاہے بارش ہو، آندھی یا طوفان آئے، ان کے معمولات میں کبھی فرق نہ آتا۔ وہ صبح فجر کے وقت سب سے پہلے اذان دیتے۔ پھر تمام گلیوں میں آواز لگاتے پھرتے کہ اے ایمان والو! نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ نماز ادا کر لیں۔

بعض گھروں کے دروازوں پر دستک بھی دیتے۔ اکثر لوگ نیکی کی دعوت پہ لبیک کہتے اور مسجد کا رخ کرتے۔ بعض دنیا دار خواب خرگوش کے مزے لیتے



مغرور انسانوں کا آخری سہارا

اللہ کی رحمت

توکل پر یقین رکھنے اور نیکی کی ترغیب دینے والے ایک خدا رسیدہ شخص کی دل افروز کھٹا

حبیب اشرف حبیبی

گھر کے نزدیک ہی ایک مسجد واقع ہمارے تھی۔ وہاں ہم سب بھائی نماز پڑھنے جاتے۔ قرآن شریف بھی مولوی صاحب سے پڑھتے۔ مسجد کی کوئی لگی بندھی آمدن نہیں تھی۔ مولوی صاحب کو گھر والے بے وقتوں وقت کھانا آجاتا۔ وہ بچوں کو قرآنی تعلیم دیتے تو اتنی رقم مل جاتی کہ روزمرہ کا خرچ چل جائے۔ رمضان شریف میں شتم قرآن کے موقع پر تمام محلے سے چندہ اکٹھا ہوتا۔ یوں بھی مولوی صاحب کی اچھی خاصی مدد ہو جاتی۔ سستا زمانہ تھا، گزر بسر آسانی سے ہو جاتی۔

مسجد میں ایک نمازی ہاتھ ادھکی سے آتے۔ ان کا نام پیراں دتا تھا۔ میں ان کی شخصیت اور خدمات کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ مسجد میں سب سے پہلے آئیں، اذان دیں، تکبیر

ہے۔ وہ میری خبر گیری کر رہا ہے اور بہت خیال رکھتا ہے۔ آپ سب لوگوں سے بس یہی درخواست ہے کہ دعا کریں، میرا خاتمہ بالآخر ہو جائے اور باقی منزلیں آسان ہو جائیں۔“

یہ سن کر میں نے کہا ”بھائی پیراں دتا! آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟ آپ نے زندگی بہت اچھی گزاری۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے ادا کیے۔ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی جس کے لیے آپ ناجائز طریقے سے دولت کھاتے نہ کوئی جائداد نہیں بنائی۔ حق حلال کی کمائی کھائی ہے۔ نماز روزے کی پابندی کی فکر تو میرے جیسے دنیا دار کو ہونی چاہیے۔ ہم خدا جانے ان میں کتنی ہار دنیا داری کے لیے جھوٹ جج بولتے ہیں۔“

پیراں دتا نے کہا ”میں محض عبادت ہی نہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نگاہ کرم کی وجہ سے بھی جنت میں جانا چاہتا ہوں۔“ اس کے بعد انھوں نے ایک حکایت سنائی کہ ایک آدمی وفات پا گیا جس کے اعمال میں بظاہر کوئی گناہ شامل نہ تھا۔ فرشتوں نے اس سے پوچھا کہ تم اپنے اعمال کی بنا پر جنت میں جانا چاہتے ہو یا اللہ کی رحمت کی بنا پر؟

آدمی کو اپنے اعمال پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اس نے فرشتوں سے کہا کہ جب میرے عمل ٹھیک رہے ہیں تو میں صرف انہی کی بنا پر جنت میں جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی یہ شجی پسند نہ آئی۔ حکم ہوا کہ اس پر دوزخ کی کھڑکی کھول دی جائے۔ جب اسے سخت تپش پہنچی، تو کہنے لگا، مجھے بچاؤ اور پانی پلاؤ۔

رہتے۔ نماز مغرب سے پہلے وہ مسجد کے صحن کی صفائی کرتے اور صفیں بچھاتے۔ سختے میں ایک روز پوری مسجد اچھی طرح پانی سے دھوتے۔ دروازے اور کھڑکیاں خوب صاف کرتے۔ وہ یہ سب کام بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے انجام دیتے۔

وہ مولوی صاحب کے کھانے وغیرہ کا بھی انتظام کرتے تھے۔ کسی دن کہیں سے کھانا نہ آتا، تو اپنے گھر سے لا دیتے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، شاید اسی لیے ان کی زندگی کا مقصد مسجد کی خدمت کرنا اور لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا بن گیا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں بطور کلرک ایمانداری سے ڈیوٹی انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے تھے۔

وہ آرام و سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔ نہ انھیں دولت کی ہوس اور نہ ہی بہتر مستقبل کی فکر، وہ اللہ پر توکل رکھتے۔ ہر جگہ نیکی کی ترغیب دیتے اور دعوت حق پہنچاتے تھے۔ دینی معاملات اور مسائل میں کبھی نہ الجھتے۔

کچھ دنوں سے لوگوں نے دیکھا کہ پیراں دتا نماز پڑھتے نہیں آ رہے۔ مسجد کے نمازی ان کی غیر حاضری محسوس کرتے ہوئے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ سخت بیمار ہیں، حتیٰ کہ چار پائی سے بھی نہیں اٹھ سکتے۔ چند دن بعد ہم چند نمازی ان کے گھر بیمار داری کرنے پہنچے۔ ہمیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم نے ان کی خیر و عافیت دریافت کی اور کہا کہ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔

انھوں نے کہا ”میرا بھتیجا گھر کے نزدیک ہی رہتا

سے معافی کا خواستگار ہوں۔" آخر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو جوش آیا اور اسے بخش دیا گیا۔

واپسی پہ میں سوچتا رہا کہ میرا کچھ کم پڑھے لکھے انسان ہیں لیکن ان کی سوچ کتنی بلند اور اعلیٰ ہے۔ اس واقعے کے چند روز بعد مجھے ایک کام سے کراچی جانا پڑا۔ چند دن بعد واپس آیا تو پتا چلا کہ پچھلے جمعہ کے بعد ان کا جنازہ ہوا جس میں بے شمار لوگ شریک ہوئے۔ تدفین کے وقت اہل رحمت چھا گیا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ یہ ان کے ہمتی ہونے کی گواہی تھی۔ سچ ہے کہ انسان کو نیکیوں کا صلہ مرنے کے بعد یقیناً ملتا ہے مگر عاجز بندے کو تب بھی رحمت الہی کا طلب گار ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رب کا نواب کی رحمت اور کرم سے نوازے۔ (آمین) ♦♦♦

فرشتوں نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس شخص نے کہا، مجھ سے ساری زندگی کے اعمال لے لو اور خدا کے لیے ایک کنورا پانی کا چلا دو۔

چناں چہ اس کے اعمال لے کر پانی دے دیا گیا۔ پانی پی کر اسے سکون ہوا۔ لیکن جلد ہی تپش کے باعث اسے پھر پیاس لگی، تو پھر پیچھے چلانے لگا کہ اس عذاب سے بچاؤ۔ فرشتوں نے پھر پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس آدمی نے کہا، میرے پاس وہی اعمال ہیں، ان کے علاوہ کچھ نہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ جن اعمال پر تمہیں اتنا غرور اور گھمنڈ تھا، ان کی حیثیت پانی کے ایک کنورے جتنی تھی۔

وہ آدمی بڑا گڑگڑایا اور عرض کی "یا اللہ میں غلطی پر تھا۔ میں تیری رحمت کا بھی طلب گار ہوں۔ میں تجھ

چوک پراگ داس کا حادثہ

امر تسر چوک پراگ دس دہار صاحب اور بابا اہل کے قریب تھوڑے فاصلے پر واقع ہے جس کے گرد زیادہ سکھ اور اس سے کم ہندو آباد تھے۔ اس کی ایک دو گلیوں میں چار پانچ سو مسلمان آباد تھے مگر فسادات کی خبر سن کر بہت سے لوگ چلے گئے اور ستر اسی نفوس وہی رہ گئے۔ ان پر چند کانگریسی اور حراری لیڈروں کا اثر تھا۔ جنہوں نے یقین دلایا کہ وہ ہرگز نہ جائیں ان کا بال بکا نہ ہوگا۔ سکھ لیڈروں نے بھی ان کے امن و حفاظت کی ذمہ داری لی اور عہد واثق کیا کہ ان کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

شام کو انہیں کہا گیا کہ حملے کا خطرہ ہے، مرد اور عورتیں علیحدہ علیحدہ مکانوں میں چلے جائیں۔ وہ مجبور تھے انہوں نے ایسا ہی کیا مگر جس وقت انہیں شب ہوا انہوں نے اندر سے کنڈیاں لگالیں۔ سکھ آئے اور کنڈیاں لگی دیکھ کر مکانوں کے اوپر چڑھ گئے۔ ہتھیں پھاڑ کر نیچے اترے اور قتل عام شروع کر دیا۔ بعض عورتوں کو کھونٹیوں سے لٹکا کر ان کے پیٹ چاک کیے۔ بعض کے نیچے آگ جلا دی گئی۔ بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے قتل کر کے ان کے جھولی میں ڈالا۔ پھر ان پر ہاتھ صاف کیا اور طرح طرح کے مظالم سے ان کی جانیں لیں۔

(فرخ امر تسری)

اسلامی زندگی

رب کی طرف سے سوتا پا

روشن دلیل

نبی کریم ﷺ

کی تکریم کرنے

والے درخت

ان مقدس درختوں کا ایمان افروز بیان

جنہوں نے مقام نبوت کو پہچان لیا

ڈاکٹر محمد نوید انور

حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس جامع
الغیرات ہے۔ انبیائے سابقین کو فرما
فرما جو معجزے عطا کیے گئے، وہ سب
آپ ﷺ کے وجود مبارک میں جمع ہوئے۔ یہاں تک
کہ آپ ﷺ کا ہاں ہاں معجزہ قرار پایا۔ ارشاد ربانی
ہے "لوگو! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف
سے ایک برتاؤ روشن دلیل آئی۔" (۱۷۴:۳)

آپ کے معجزات میں سے کئی جمادات، نباتات
اور حیوانات سے متعلق ہیں۔ کنکریاں آپ ﷺ کے
ہاتھ میں بیج کرتیں۔ شجرہ خیر آپ ﷺ پر سلام بھیجتے اور
سجدہ کرتے۔ ہرنیاں آپ ﷺ کو ضامن تسلیم کرتیں،
اونٹ آپ سے افسانہ غم بیان کرتے۔ کتب احادیث
ہجرت میں ایسے متعدد خوش نصیب درختوں کا ذکر بھی
ملا ہے جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کی تعلیم و تکریم



کی اور مقام نبوت کو پہچانا۔ کئی درخت آپ کی پکار پر زمین کو چیرتے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور اقرار نبوت ﷺ کی سعادت حاصل کی۔ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے نعتیہ قصیدہ میں اس معجزے کا ذکر یوں کیا ہے:

ترجمہ: اور جب آپ ﷺ نے درختوں کو بلایا تو وہ فرمان بردار بن کر، دوڑتے ہوئے، آپ ﷺ کے حکم پر ٹپک کپتے، آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

یہی مضمون امام شرف الدین بصریؒ نے قصیدہ بردہ شریف میں یوں بیان کیا ہے:

ترجمہ: ان کی پکار پر اشجار، بغیر قدموں کے، اپنی پنڈلیوں پر چلتے ہوئے، ان کی طرف چل پڑے۔

ان درختوں میں سے سب سے خوش نصیب درخت "حنانہ" ہے، جس کا ذکر بخاری شریف میں اجمالاً اور دیگر کئی کتب احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے لیے ایک صحابی نے نکڑی کا منبر بنا کر مسجد نبوی ﷺ میں رکھ دیا۔ آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے اس پر رونق افروز ہوئے تو خشک درخت کا بنا ہوا وہ ستون، جس سے ٹپک لگا کر آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تھے، ہلک ہلک کر رونے لگا۔

اس کے مالہ و شیون میں اتنا درد تھا کہ مجلس میں موجود تمام صحابہ کرامؓ آبدیدہ ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے جب ستون کی بے قراری ملاحظہ فرمائی تو خطبہ موخر فرما کر اس ستون کے پاس آئے اور اسے سینے سے لپٹا لیا۔ پھر صحابہ کرامؓ سے فرمایا "یہ میری جدائی میں گریہ کنال ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میں اسے سینے سے لپٹا کر دلاسانہ دیتا تو یہ قیامت تک اسی طرح میری جدائی کے غم میں روتا رہتا۔"

حضور اکرم ﷺ نے پھر نکڑی کے اس تنے سے پوچھا "کیا تو پسند کرتا ہے کہ میں تجھے واپس اسی باغ میں اگا دوں جہاں سے تجھے کاٹا گیا ہے۔ وہاں تجھے ہرا بھرا کر دیا جائے۔ یہیں تک کہ قیامت تک مشرق و مغرب سے آنے والے اللہ کے دوست حجاج کرام تیرا پھل کھائیں؟"

اس نے عرض کیا: "اے ہیکر رحمت میں تو آپ ﷺ کی لحاظی جدائی برداشت نہ کر سکا، قیامت تک کی تنہائی کیسے برداشت کروں گا؟"

آپ ﷺ نے پوچھا "کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں تجھے جنت میں سرسبز و شاداب درخت بنا کر اگا دوں اور تو جنت کی بہاروں کے مزے لوٹے؟"

ستون حنانہ نے یہ انعام قبول کر لیا۔ چنانچہ اسے منبر اقدس کے قریب زمین میں دفن کر دیا گیا۔ یہ زمین کے بعد حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "اس نے دارالینا پر دار بقا کو ترجیح دی ہے۔" (بخاری شریف، کتاب الجمعہ، سنن دارمی)۔ اس درخت کی یادگار کے طور پر اسی مقام پر ایک ستون استوانہ حنانہ کے نام سے مسجد نبویؐ میں آج بھی موجود ہے۔

منقول ہے کہ جب حضرت حسن بصریؒ یہ حدیث بیان کرتے تو رو پڑتے اور فرماتے "اے اللہ کے بندو! نکڑی جبر رسول ﷺ میں روتی اور آپ ﷺ کے دیدار کا اشتیاق رکھتی ہے۔ انسان تو اس سے زیادہ حق رکھتا ہے کہ فراق رسول ﷺ میں بے قرار رہے۔"

ادب رسول ﷺ بجا لانے والا ایک ایسا ہی درخت طائف کے مقام پر تھا۔ شفاء شریف میں آیا ہے کہ غزوہ طائف میں حضور اکرم ﷺ غنودگی کی حالت میں غودا سا چلے۔ سانے ایک چری کا درخت تھا۔ قریب تھا کہ آپ ﷺ کا سراقد اس درخت سے ٹکرا

جاتا۔ اچانک وہ پھٹ کر دو ٹکڑے ہوا اور حضور ﷺ کو راستہ دے دیا۔ قاضی عیاض مالکی نے فوزک کے حوالے سے لکھا ہے، وہ سعادت مند درخت (۱۰۸۳ء۔ ۱۱۴۵ء) آج بھی دو تنوں پر ہی جگہ موجود ہے۔ اس کے شرف صحابیت کی وجہ سے وہ جگہ لوگوں میں مشہور ہے اور قابل تعظیم بھی۔ (شفائ شریف، ج اول، باب چہارم) ایسا ہی ایک خوش بخت اور سعادت مند درخت اردن میں موجود ہے۔ اسے بھی تعظیم رسول ﷺ کے طفیل بقائے دوام حاصل ہوئی۔ یہ درخت حجاز سے دمشق جانے والی قدیم تجارتی شاہراہ پر استادہ خیر القرون کی یادیں تازہ کر رہا ہے۔ حیرت کی بات یہ کہ پوری شاہراہ پر اس درخت کے علاوہ ایک پودا بھی پنپ نہیں سکا۔ لیکن اس صحابی درخت کو آب و ہوا کی شدت اور موسموں کے تغیر و تبدل سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس درخت کا ذکر ترمذی شریف میں ابواب المناقب میں موجود ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی عمر مبارک بارہ برس تھی جب جناب ابوطالب نے رؤسائے قریش کے ہمراہ تجارت کی غرض سے سفر شام کا عزم کیا۔ حضور ﷺ نے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ آپ ﷺ کو بھی ساتھ لے لیا گیا۔ مورخین کے نزدیک یہ سفر ۵۸۶ء میں ہوا۔ جب یہ قافلہ بیت المقدس کے شمال میں نزد دمشق واقع مقام نصریٰ پہنچا، تو ایک گھنے درخت کے قریب جناب ابوطالب سواری سے نیچے اترے۔ باقی اہل قافلہ نے بھی آرام کی غرض سے سواریوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں یہ علاقہ رومی سلطنت کے زیر انتظام تھا۔ وہاں ایک گرجا میں ایک راہب رہتا تھا۔

راہب کا لقب بحیرا (Bahira) یعنی پارسا اور نام جرجیس (Georges) یا سر جیس تھا۔ بحیرا اناجیل اربعہ کا بہت بڑا عالم اور کتاب مقدس کا درس دیا کرتا تھا۔ اسی باعث علاقے میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ اس کے گرد تحصیل علم کرنے والے عیسائی علما کا ہجوم رہتا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے بھی قبل از اسلام اسی سے علم حاصل کیا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مدارج النبوة، جلد دوم میں لکھا ہے کہ بحیرا کے اس صومعہ میں مقیم ہونے کی وجہ اسی کی یہ تحقیق تھی کہ ادھر سے نبی آخر الزماں ﷺ کا گزر ہو گا۔ چنانچہ وہ حجاز سے آنے والے ہر قافلے کو اپنی کھڑکی سے دیکھتا رہتا۔ مگر اسے وہ ہمت نظر نہ آتی جس کے لیے وہ سرپا انتظار تھا۔

بحیرا بلا کا نامک الدنیا اور گوشہ نشین بزرگ تھا۔ کبھی گرجا سے باہر آیا تھا اور نہ ہی کبھی قافلے والوں سے ملاقات کرتا۔ لیکن اس مرتبہ وہ خلاف دستور قافلے پر نظریں جمائے گرجا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ جب قافلے نے درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا تو وہ اہل مکہ کے قریب پہنچا اور حضور اکرم ﷺ کا دست اقدس تمام کر لوگوں سے مخاطب ہو کر باوازل بلند کہنے لگا:

”یہ سرکار دو عالم ﷺ ہیں۔ یہ رب العالمین کے رسول ﷺ ہیں۔ اللہ انھیں رحمتہ اللعالمین ﷺ بنا کر معبود فرمائے گا۔“ (ترمذی)

اہل قافلہ بحیرا کا یہ عمل دیکھ کر حیرت و استعجاب میں ادب گئے۔ رؤسائے قریش میں سے ایک نے پوچھا: ”اے بزرگ محترم! آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“ اس نے جواب دیا: ”جب سبھی لوگ گھائی سے اتر کر آ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ تمام درخت اور پتھر آپ ﷺ کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ خصوصیت

قافلے میں نظر نہ آئے، تو اس نے آپ ﷺ کے بارے میں پوچھا۔ چنانچہ ایک قریشی یہ کہتے ہوئے اٹھا کہ لات وعزنی کی قسم! ہمارے لیے اہل شرم ہے کہ ہم تو کھانا کھالیں اور عبداللہ بن عبدالمطلب کا فرزند رہ جائے۔ وہ پھر حضور ﷺ کو آغوش میں اٹھا لایا۔

ابونعیم نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ جب آپ ﷺ گر جا میں داخل ہوئے تو دو نو رہوت سے چمک اٹھا۔ یہ دیکھ کر بھرا کہنے لگا: "یہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، انھیں اللہ عرب میں منوت فرمائے گا۔" بھرا آپ ﷺ کو بغور دیکھتا اور اپنی کتب میں مذکور

علامات نبوت کی شناخت کرتا رہا۔ جب قافلے والے کھانے سے فارغ ہو کر چلے گئے، تو وہ حضور ﷺ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور چند سوالی و جواب کیے۔ بھرا نے کہا: "بچے! میں تمہیں لات وعزنی کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے میرے سوالوں کے جواب دو۔" اس نے لات وعزنی کا واسطہ اس لیے دیا کیونکہ

وہ اہل قافلہ کو ان کی قسمیں کھاتے ہوئے سن چکا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "آپ لات وعزنی کا نام لے کر مجھ سے کچھ نہ پوچھیں کیونکہ مجھے ان سے جتنی نفرت ہے اتنی کسی اور سے نہیں۔"

بھرا نے اللہ کا واسطہ دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اب جو مرضی ہے پوچھو۔"

بھرا نے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ کی نیند پورا نہیں ہوتی؟

صرف انبیائے کرام کو حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ انہیں میں آپ ﷺ کو میر نبوت سے بھی پہچان سکتا ہوں۔"

بھرا پھر صومعہ میں واپس چلا گیا تاکہ اہل قافلہ کے لیے ضیافت کا اہتمام کر سکے۔ جب وہ کھانا لے کر اہل قافلہ کے پاس پہنچا تو حضور اکرم ﷺ اونٹ چرانے تشریف لے گئے تھے۔ اس نے آپ ﷺ کے بارے میں پوچھا۔ چنانچہ آپ ﷺ کو بلایا گیا۔ آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو ایک بدلی آپ ﷺ کے سر اقدس پر سایہ کناں تھی۔ جب گر جا کے قریب پہنچے تو اہل قافلہ درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔



آپ ﷺ نے ارزاو ادب سب سے پیچھے بیٹھنا گوارا کیا، جہاں دھوپ تھی اور درخت کا سایہ ختم ہو جاتا تھا۔ فوراً درخت نے جھک کر آپ ﷺ کے سر اقدس پر سایہ کر دیا۔ الہدایہ والنہایہ اور سیرت ابن ہشام کے مطابق درخت کی شاخیں بے تابانہ

آپ ﷺ کے سر اقدس پر جھک گئیں۔ یہ دیکھ کر راہب بے ساختہ پکار اٹھا "وکیھو درخت کا سایہ ان کی طرف جھک گیا ہے۔"

وام تنقی نے اس واقعہ کو قدرے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق بھرا نے اہل قریش کو صومعہ کے اندر کھانے پر مدعو کیا۔ تمام اہل قافلہ چلے گئے جب کہ حضور ﷺ نو عمری کے باعث اسی درخت کے نیچے تشریف فرما رہے۔ جب بھرا کو حضور ﷺ

آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری آنکھیں سو جاتی ہیں مگر دلی نہیں سوتا۔“

پھر آپ کے احوال اور دیگر امور کے بارے میں استفسار کیا۔ حضور ﷺ نے اسے آگاہ فرمایا۔ تمام جوابات بحیرا کی معلومات کے مطابق تھے۔ پھر اس نے آپ ﷺ کی پشت مبارک کی طرف دیکھا تو شانوں کے درمیان سب سے مشابہ مہر نبوت دکھائی دی۔ تمام علامات کی تصدیق کرنے کے بعد بحیرا نے جناب ابوطالب کے پاس آکر پوچھا: ”اس بچے سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

انھوں نے جواب دیا: ”میرا بیٹا ہے۔“

بحیرا نے کہا: ”یہ آپ کا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ میرے علم کے مطابق بچے کے والد کو زندہ نہیں ہونا چاہیے۔“

بحیرا نے کہا: ”آپ کی بات بالکل درست ہے۔ آپ کے بھتیجے کی بڑی شان ہوگی۔ اس کا چہرہ انبیاء کا چہرہ آنکھ نبی کی آنکھ ہے۔“

اب بحیرا نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر باداز بلند قسمیں کھا کھا کر لوگوں سے کہا کہ آپ کو اپنے ساتھ روم لے کر نہ جاؤ۔ رومی جب آپ ﷺ کو دیکھیں گے تو علامات نبوت اور معجزات کی مدد سے پہچان کر آپ ﷺ کی جان کے درپے ہوں گے۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ دور ایک غبار اڑتا ہوا نظر آیا۔ غور سے دیکھا تو روم کی جانب سے سات آدمی چلے آ رہے تھے۔ بحیرا نے ان کا استقبال کیا اور آنے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: ”ہم اس لیے آئے کہ نبی آخر الزماں ﷺ اس مہینے سفر پر نکلنے والے ہیں۔ ہمارے آدمی ہر راستے پر پھیل گئے ہیں۔ ہمیں خبر ملی کہ وہ اس راستے سے آ رہے ہیں لہذا ہم

نے ادھر کا رخ کر لیا۔“

بحیرا نے ان سے کہا: ”یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ جس معاملے کو تکمیل تک پہنچانا چاہے کیا کوئی آدمی اس میں رکاوٹ بن سکتا ہے؟“

انھوں نے انکار میں جواب دیا تو اس نے انھیں سمجھایا کہ تمہیں چاہیے، نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لو، اور آپ کے ساتھی بن جاؤ۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے۔ جناب ابوطالب حضور اکرم ﷺ کو لے کر مکہ مکرمہ چلتے آئے یا کسی کے ہمراہ واپس بھیج دیا۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے

دو شمع کیا سمجھے جسے روشن خدا کرے

قافلہ اس مقام سے روانہ ہو گیا لیکن یہ ایمان افروز درخت آج بھی تروتازہ ہے۔ موجودہ جغرافیائی حدود کے مطابق یہ درخت مشرقی اردن میں، صفونی کے مقام پر، وادی سرہان کے قریب واقع ہے۔ حکومت اردن نے اس کے قریب جہاز سے شام کو جانے والی تجارتی شاہراہ کے کنارے بھی تلاش کر لیے ہیں۔ اس کی اہم نشانی یہ ہے کہ یہ سیکڑوں مربع کلومیٹر میں تنہا اگا ہوا درخت ہے۔

انٹرنیٹ پر اس صحابی درخت کی تفصیل ملاحظہ کرنے کے لیے ”The Blessed Tree“ اور ”The only living Sahabi Tree“ کے عنوانات سے تحقیق کی جاسکتی ہے۔

کتب میرت میں سے سیرۃ حلیمیہ، المصانف الکبریٰ، المواہب اللدیہ اور مدارج النبوة میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ اگر ایک درخت کو حب رسول ﷺ کی بدولت حیات دائمی نصیب ہو سکتی ہے تو اس دل پر موت کیسے وارد ہو سکتی ہے جو محبت رسول ﷺ کا گنجینہ بن جائے؟

مجھے یہ مبالغہ آمیز لگتی ہے۔“ میں نے موقع قیمت جان کر عرض کیا کہ آپریشن سے قبل آبادی اور ہجرت کا اندازہ درست نہ لگانا اور اسلام آباد، لاہور یا کسی دوسرے شہر میں تعداد کے مطابق نیچے، پچھے، واٹر کولر، بستر، چولہے، راشن کا بندوبست نہ کرنا بھی سرپرانز پالیسی کا حصہ تھا یا نا اہل غفلت اور بے تدبیری کا شاہکار؟ جناب الطاف حسن قریشی نے آئی ڈی بیز کے مسائل و مصائب سے آگہی کے لیے ”پاکنا“ اور روشن بیکھر کے تعاون سے اس خوبصورت تقریب کا اہتمام کیا تھا اور طیب و عجاز قریشی، کامران قریشی اور سعادت اعجاز قریشی نے شہر بھر کے صاحب ثروت اہل خیر کے علاوہ دانشوروں، اخبار نویسوں اور سماجی خدمت میں مصروف راہنما دکھتے کر لیے۔ الخدمت فاؤنڈیشن کے ڈاکٹر حفیظ خان اور کسٹم ہیلتھ کیئر سوسائٹی کے ڈاکٹر آصف محمود جاہ نے ہوں میں مہاجرین کی حالت زار بیان کی اور اپنے تجربات شیئر کیے۔ ڈاکٹر حفیظ خان نے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ ایسے بارہو خاندان جن کی ماؤں، بہو، بیٹیوں کے چہرے اور سر کے بال کبھی سورج کی کرنوں نے دیکھے نہ چاند کی روشنی نے نہ وہ کھلے آسمان تلے پڑے ہیں۔ سر پر چھت نہ پردے کا کوئی انتظام۔ ایک باپ کا دکھ بیان کیا جو طویل سفر، بھوک، پیاس اور گرمی کے سبب نہ حال اور نیم مردہ دو بچوں کو یہ کہہ کر میرے سپرد کر گیا کہ اگر بچ جائیں تو آپ کے ہوئے۔ جاں بردہ ہوں تو کفن و دفن کا انتظام کر لیجیے گا۔ میں اپنی بیوی اور بیٹیوں کے لیے کوئی آسرا تلاش کروں جو میری ذمہ داری ہیں اور تاحال جینے کی امید سے مرشار۔

سجاد میر کے کالم سے اقتباس

ابھی کل ہی ایک تقریب تھی جو اردو ڈائجسٹ نے روشن بیکھر کے تعاون سے منعقد کی تھی۔ الطاف حسن قریشی ایسے مواقع پر ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ اس بار بھی انھوں نے یہ محفل جمالی۔ جنرل عبدالقادر بلوچ کہ وفاقی حکومت کی طرف سے نوکل پرسن ہیں، خاص طور پر آئے تھے تاکہ اہل لاہور کو بتا سکیں کہ ان کے بھائی کن مشکلات سے گزر رہے ہیں اور حکومت ان کے لیے کیا کر رہی ہے۔ یہاں ڈاکٹر امجد ثاقب نے ایک بڑی چونکا دینے والی بات کی جس کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں وہاں موجود ایک شخص نے کہا کہ ہماری وہ عورتیں جن کا چہرہ کبھی سورج کی روشنی اور چاند کی چاندالی سے بھی نہیں دیکھا تھا، آج نیگے سروں راشن تلاش کر رہی ہیں۔ دو تین دن بڑے مشکل تھے، مگر وہاں کی آبادی نے کمال مواخات کا مظاہرہ کیا۔ ہجرت مدینہ کے مناظر یاد آ گئے، جب مدینہ کے انصار نے اپنے دروازے اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے کھول دیے تھے۔ اخوت و مواخات کا یہ جذبہ آج بھی ہمارے اندر زندہ ہے۔ یہاں کے عمائدین نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہر شخص اپنے گھر کے ایک آدھ کمرے میں سٹ جائے اور آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دے۔ ایسا بھی ہوا کہ آنے والا جس گھر میں اترا، اس سے اور اس کے خاندان سے اس کا جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ قبائلی معاشرے میں اس طرح کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے، مگر آج وہ مہمان اور میزبان کے طور پر رہ رہے ہیں۔ یہاں الخدمت کے پروفیسر حفیظ الرحمن اور کسٹم وائلوں کی تنظیم کے سربراہ خلوص ڈاکٹر آصف محمود جاہ نے بھی وہاں کے حالات سنائے۔ بہر حال اس وقت حالات کنٹرول میں ہیں۔ وفاقی حکومت نے انھیں ۲ ہزار فی کس، پنجاب حکومت نے ۷ ہزار اور خیبر پختونخواہ حکومت نے کرایے کی مد میں ۳ ہزار ادا کیے ہیں۔ اب انھیں عید جیکب کے طور پر بھی وفاق میں، میں ہزار دے رہا ہے۔

بین الاقوامی سیاست

پاکستان اور بدلتا عالمی منظر نامہ

طیب انجاز قریشی

قومی تناظر میں تیزی سے جنم لیتی بین الاقوامی دور رس
اور انقلابی تبدیلیوں کی معلومات افروز داستان

۲۰۲۰ء کے کروڑ روپے خرچ کر کے ۱۰۰ سمارٹ
شہر بنائے جائیں گے۔

پانچویں بین الاقوامی انوسٹمنٹ فرسٹ اور انفراسٹرکچر
انوسٹمنٹ فرسٹ جیسے اداروں کے ذریعے ملکی اور غیر ملکی
سرمایہ کاروں کو رقم لگانے کی ترغیب دی جائے گی۔
وزیر کیمبل منصوبے جو عظیم سرمایہ کاری کی وجہ سے بند ہو
چکے، ان کی بحالی کے لیے اب ایک عام آدمی بھی ریکل
انوسٹمنٹ کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر سکے گا۔ غارت

کے نئے وزیراعظم فریدر مودی
بھارت کمزور لیڈر کی حیثیت سے مشہور
ہیں۔ تاہم انھوں نے حکومت
سنبھالتے ہی ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ملک کو ترقی و
خوشحالی کی راہ پر ڈالنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اپنے دلیس کو
عالمی طاقت بنانے کے لیے ان کے پاس ڈن ہے اور
قابل عمل منصوبے بھی! اس منصوبے کی کچھ جھلکیاں حالیہ
بھارتی بجٹ میں سامنے آئیں جو درج ذیل ہیں۔



اردو ڈائجسٹ 50 اگست 2014ء

کرنے کے لیے موبائل لیبارٹریز قائم کی جائیں گی جن پر ۱۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے۔ ذراعت کی ترقی کا ہدف کم از کم چالیس فیصد رکھا گیا ہے۔

وزیراعظم مودی نے برسرِ اقتدار آتے ہی دفاعی بجٹ میں بھی اضافہ کر دیا۔ نیز نئی کمپنیوں کو اسلحہ بنانے کی اجازت دے ڈالی۔ اب ٹاٹا گروپ، ریلیانس انڈسٹری، مہاندرو گروپ جیسے بھارتی ملٹی نیشنل ادارے غیر ملکی اسلحہ ساز کمپنیوں کے اشتراک سے نئے اسلحہ ساز کارخانے قائم کریں گے۔

بھارتی سرکاری اسلحہ ساز کارخانے ٹینک، چھوٹی توپیں، لڑاکا طیارے اور میزائل بنا رہے ہیں۔ اب بھارتی نئی شعبہ غیر ملکی اداروں کے اشتراک سے جنگی بحری جہاز، لانڈورٹ طیارے اور بڑی توپیں بھی تیار کرے گا۔ یوں جدید ترین عسکری ٹیکنالوجی بھارتیوں کو حاصل ہو سکے گی۔

نریندر مودی کا وژن یہ ہے کہ اگلے دس برس میں بھارتی افواج کو جدید ترین اسلحے سے فیس کر دیا جائے۔ اس ضمن میں انھوں نے "۲۳۸ ارب ڈالر" کی خطیر رقم مختص کر دی ہے۔ یوں اگلے دس سال میں بھارت ایک بڑی عسکری طاقت بن کر نمودار ہو گا اور کم از کم ایشیائی سطح پر اس کا دائرہ اثر بڑھ جائے گا۔

اقتدار سنبھالتے ہی مودی بین الاقوامی سطح پر بھی سرگرم ہو گئے۔ وہ برازیل میں منعقدہ برکس (BRICS) کی سربراہ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ چین، روس، برازیل، بھارت اور جنوبی افریقہ اس اہم عالمی تنظیم کے ارکان ہیں جو عالمی سطح پر امریکی چودھراہٹ ختم کرنے کے لیے وجود میں آئی۔ وہاں انھیں کانفرنس کا صدر بنا کر مودی کی ذہانت و متحرک

تیار ہونے کے بعد کرائے پر چڑھا دی جائے گی۔ کرایہ کی آمدنی سے سرمایہ کاروں کو منافع تقسیم کرنا ہوگا۔

☆ ۱۰۰۰ کروڑ روپوں کے ذریعہ آب پاشی کا نظام بہتر بنایا جائے گا۔

☆ ۱۳ نئے میڈیکل کالجز کا قیام اور ۳۱ ڈرگ ٹیسنگ لیبارٹریز کو جدید بنانے کا فیصلہ۔

☆ بھارت کے تمام گرلز اسکولوں میں بیت الخلا کا قیام اور پینے کے صاف پانی کی سہولت کے لیے بالترتیب ۲۸۶۳۵ کروڑ اور ۴۹۶۶ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

☆ اساتذہ کی تربیت کے لیے ۵۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے

☆ ورچوئل کلاس روم یعنی آن لائن تعلیم کے لیے ۱۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے۔

☆ اعلیٰ تعلیم کے لیے ۵۰۰ کروڑ روپے بجٹ میں رکھے گئے ہیں۔

☆ کسانوں کو بروقت معلومات پہنچانے والی تکنیک پانی بچانے کے طریقوں اور نامیاتی فارمگ سے روشناس کرائے کی خاطر کسانوں کی وی کے لیے ۱۰۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

☆ عوام خصوصاً نوجوان افراد کو گھر خریدنے کے لیے سستے قرضے دیے جائیں گے جس کے لیے ۴۰۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

☆ مسلمانوں کے مدرسوں کو جدید بنانے کے لیے ۱۰۰ کروڑ رکھے ہیں۔

☆ ۱۰۰ کروڑ روپے سے دو نئے تحقیقی انسٹیٹیوٹ بنائے جائیں گے۔ مزید ایگرکلچر اور ہارٹی کلچر یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ زمین کا معائنہ

یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ زمین کا معائنہ

کی پینگیں جھولنے میں مصروف ہے جو امریکی حکومت کو آسرو جابر سمجھتے ہیں۔

بعض ماہرین کا دھوکا ہے کہ امریکا ملائیشیائی طیارے کے حادثے کو "حادثہ ٹیکنالوجی" کی طرح استعمال کرے گا۔ یعنی اپنے حواریوں کو جمع کر کے روس پر چڑھ دوڑے گا۔ یوں نئی سرد جنگ کا آغاز متوقع ہے۔

☆.....☆

بھارتی بجٹ سے عیاں ہے کہ یہ عوام دوست اور واضح مقاصد رکھنے والا پروگرام ہے۔ مودی حکومت کے دیگر اقدامات سے بھی آشکارا ہوا کہ وہ عوامی بھلائی کے کام کرنا چاہتی ہے۔ مثال کے طور پر بھارتی سپریم کورٹ نے فیصلہ دے چکا کہ حکومت بجلی کی قیمت میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔

پچھلے دنوں دہلی میں بجلی مہیا کرنے والی فوجی کمپنی نے قیمت میں اضافہ کر دیا۔ مودی حکومت نے فوراً بجلی پر لگے سرچارج ختم کر ڈالا۔ یوں بجلی کی سہولت قیمت بحال رہی۔ اس اقدام کا مقصد یہی تھا کہ قیمت میں اضافے سے عوام پر مالی بوجھ نہ پڑے۔

مودی حکومت کی نئی پالیسی کے مطابق اب کم یونٹ استعمال کرنے والے گھریلو صارفین کو 4 روپے فی یونٹ والی بجلی ایک روپیہ بیس پیسے میں مل سکے گی۔ یوں دہلی کے لاکھوں خاندان مالی بچت سے مستفید ہوں گے۔

ایک حکومت عوام دوست اقدامات کے ذریعے ہی مقبولیت حاصل کرتی اور ساتھ ساتھ اپنا اعتماد بڑھاتی ہے۔ اگر وزیراعظم مودی اور ان کے وزرا اسی تہذیبی اور ذہانت سے اہم قومی اور عالمی فیصلے کرتے رہے، تو وہ بھارت کو اہم معاشی و عسکری قوت بنا سکتے ہیں۔

دوسری طرف پہلے ایک سال پاکستانی حکومت کی

شخصیت تسلیم کی گئی۔

برکس کانفرنس میں دو اہم فیصلے سامنے آئے۔ اول ۱۰۰ ارب ڈالر سے ایک ریڑرو فنڈ قائم کیا گیا جو آئی ایم ایف کے طرز پر کام کرے گا۔ یہ فنڈ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے ہتھ کنڈوں اور سازشوں سے محفوظ رہنے کی خاطر بنایا گیا۔ دوسرے ۵۰ ارب ڈالر کے سرمائے سے ترقیاتی بینک کھولنے کی بھی تجویز ہے۔ یہ دونوں مالیاتی ادارے امریکا کے علاوہ دیگر ممالک کو بھی بطور قرض سرمایہ فراہم کریں گے۔

برکس ممالک کے اقدامات سے عیاں ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عالمی سطح پر امریکی حاکمیت کو چیلنج کر رہے ہیں۔ گو انہوں نے فی الوقت براہ راست لڑائی مول نہیں لی تاہم روس اور امریکا بعض معاملات میں آمنے سامنے آچکے۔

بھارتی کو جب مشرقی یوکرین میں ملائیشیا کا مسافر بردار طیارہ پراسرار میزائل سے تباہ ہوا، تو امریکی میڈیا فوراً یہ راگ الاپنے لگا کہ یہ روسی نواز باغیوں نے چھوڑا ہے۔ نیز صدر پوٹن کو بھی زبردست تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ انہی نے یوکرینی باغیوں کو میزائل فراہم کیے۔ جب کہ روس کا کہنا ہے کہ یہ میزائل یوکرینی فوج نے داغا ہے۔

بہر حال ملائیشین طیارے کی تباہی کے تنازع نے روس، امریکا تعلقات کو مزید الجھا دیا جو شام، عراق اور یوکرین کی وجہ سے پہلے ہی خاصے خراب ہو چکے۔ امریکیوں کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے روس بھی اب آہستہ آہستہ ساتھ مودیت یونین کے زیر اثر ممالک سے تعلقات بڑھا رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے کیوبا میں طویل عرصے سے بند اپنا فوجی اڈہ کھول دیا ہے۔ نیز وہ لاطینی امریکا میں ان ممالک سے دوستی

کارکردگی ہائیکل سٹارٹ کن نہیں رہی۔ اب شعبہ بجلی ہی کو لیجیے۔ نواز شریف حکومت نے ۱۳ ماہ قبل آتے ہی بجلی کی کمپنیوں کو ۵۰۰ ارب روپے کی بھاری رقم ادا کی تھی۔ مقصد لوڈ شیڈنگ پر قابو پانا تھا۔

لوڈ شیڈنگ میں کچھ کی تو آئی، لیکن اس نے اب بھی کروڑوں پاکستانیوں کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ مزید براں تقسیم کار کمپنیوں سے وابستہ گردش قرضہ دوبارہ ۲۰۰ ارب روپے تک پہنچ چکا۔ نیز بجلی کی قیمتوں میں وقفے وقفے سے اضافہ جاری ہے۔

نو بہت یہاں تک پہنچ گئی کہ وزیر بجلی نے عوام سے اپیل کہ بارش کے لیے دعائیں مانگیں۔ اب حکومتی ٹیم کی یہ نئی منطق سامنے آئی ہے کہ ملک میں بجلی کی تقسیم کا نظام یعنی گرڈ، ٹرانسفارمر، تاریں، کھمبے وغیرہ اس قابل ہی نہیں کہ مطلوبہ بجلی کا بار یا لوڈ برداشت کر سکے۔ لہذا کسی طرح مطلوبہ بجلی تیار ہو بھی جائے، تو اسے صارفین تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔ یہ منطق دیکھ کر تو غلٹا ہے، افسر شاہی کمانی کا نیا کھانا کھولنا چاہتی ہے۔

میاں شہباز شریف اور اسحاق ڈار بجلی کے نئے منصوبے بنانے کی خاطر مختلف ممالک کا دورہ کر چکے۔ وہ نوید سناتے ہیں کہ آنے والے برسوں میں لوڈ شیڈنگ ختم ہو جائے گی۔ طرفہ تماشایہ ہے کہ یہ منصوبے کئی برس بعد مکمل ہوں گے۔ مگر ان کی تشہیر پر کروڑوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ یہ قتل عوام کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ صاحبان گمنامی کے چند من پسند بیوروکریٹس، دوستوں اور رشتے دار وزرا کے درمیان گھر چکے۔ کابینہ کی اکثریت تھکے ماندے، بوڑھے، فلسفہ بگھارنے کے شوقین اور گروپ

بندی کرنے کے چیمپین وزرا پر مشتمل ہے جو گزشتہ ایک برس میں موٹر کارکردگی نہیں دکھاسکے۔

ایک گہیر مسئلہ یہ ہے کہ حکومت عوام سے کٹ چکی اور اس کا معاشی و سیاسی ایجنڈا سراب ثابت ہوا۔ محض بڑے منصوبے بنانے، لیپ ٹاپ تقسیم کرنے اور سڑکیں دہل بنانے سے ملک میں خوشحالی نہیں آسکتی۔ یہ ہدف حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام بڑے مسائل بیک وقت حل کرنے کی کوششیں کی جائیں۔

نٹ ہال ورلڈ کپ کے فائنل میں مقررہ مدت تک جرمنی اور آئرلینڈ کا میچ برابر تھا۔ زائد وقت میں جرمن کوچ، لوے نے فیصلہ کیا کہ مشہور مگر بوڑھے دھمکے کھلاڑی، میرو سٹاف کلوز کی جگہ نوجوان و تازہ دم کھلاڑی، ماریو گوٹے کو میدان میں بھیجا جائے۔

کوچ نے ماریو کو گراؤنڈ میں بھیجنے سے قبل کہا: ”نوجوان! ایسا زبردست کھیل دکھاؤ کہ گول کر کے مشہور ترین فٹ بالر جیسی سے بھی بڑے کھلاڑی بن جاؤ۔“ ماریو بڑے جوش و جذبے سے کھیل ادا کر گول کر کے جرمنی کو عالمی چیمپئن بنا دیا۔

وزیراعظم نواز شریف کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی ٹیم میں موجود تھکے ہارے وزراء و مشیروں کو خدا حافظ کہہ دیں اور ان کی جگہ پر جوش، ذہن اور محنتی نوجوان ٹیم میں لائیں۔ وزیراعظم پھر ان کی شراکت سے اہداف مقرر کریں اور اپنی جماعت کو فعال بنائیں۔ مسلم لیگ ق میں ایسے نوجوانوں کی شمولیت ضروری ہے جو حکومت کے اچھے کاموں کی تشہیر موثر انداز میں کر سکیں۔

حکومت وقت عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر معیاری کارکردگی ہی اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

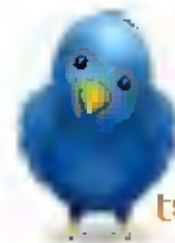
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

حملہ آور ہوئی۔ اس نے معصوم بچوں اور عورتوں کو بھی نہ بخشا اور ان کا بے دریغ قتل عام کیا۔ حسب روایت اسلامی ممالک زبانی کھائی احتجاج کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔

۱۱ نومبر ۱۹۴۷ء کو اسرائیلی حملوں کی زد میں آکر ۵۹۰ فلسطینی شہید جب کہ ۳۲۰۰ سے زائد زخمی ہو چکے۔ شہداء میں "۶۷ فیصد" شہری ہیں۔ جب کہ ان میں بڑی تعداد بچوں اور خواتین کی بھی ہے۔

اس خوفناک انسانی الیے پر مغرب سے نبرد آزما عالمی قومیں روس اور چین بھی خاموش رہیں۔ چونکہ ان کا اہل غزوہ سے کوئی مفاد وابستہ نہیں، اس لیے انھوں نے اسرائیلی ظلم کے خلاف سلامتی کونسل میں کوئی قرارداد پیش نہ کی۔ یقیناً دونوں عالمی طاقتوں نے طاقتور یہودی لابی کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھا جو مغرب میں میڈیا سے معیشت تک چھائی ہوئی ہے۔

انڈیا، برما اور سری لنکا میں نشے و مقہور مسلمان انتہا پسند بدھیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ یہ انتہا پسند بدھی مسلمانوں کو ملکی معیشت پر بوجھ اور کینزے ٹکڑے سمجھتے ہیں۔ ان دونوں ممالک میں روزانہ مسلمان شہید ہوتے ہیں۔ ان کے گھر بار جلا دیے جاتے ہیں۔ مگر کوئی اسلامی ملک بے بس بری دوسری لشکر مسلمانوں کی ٹھوس مدد کرنے نہیں پہنچا۔

غرض عالمی طاقتوں کی سازشوں، اپنوں کی غداری اور اپنی ملکیوں کے باعث عالم اسلام میں مالی و صوبائی سے لے کر لیویا و عراق اور ترکستان (سکیانگ) تک جگہ جگہ آگ لگی ہوئی ہے۔ کہیں غاصب و اغیار مسلمانوں کو شہید کر رہے ہیں، تو کہیں اپنے ہی آپس میں دست و گریباں ہیں۔ قرآن و سنت سے نانا توڑ کر اندھا دھند مغربی تہذیب اپنا لینے کا نتیجہ بدلتو نکلتا ہی تھا۔

مزید برآں اس پڑوس کے ممالک اور دنیا میں چیزی سے جو تہذیبیاں جنم لے رہی ہیں، ان پر بھی نظر رکھنا نہایت اہم ہے۔

لگتا ہے کہ چینی حکومت کے مانند زیندر مودی بھی پڑوسیوں سے غیر ضروری طور پر الجھے بغیر اگلے دس برس میں بھارت کو بڑی عسکری و معاشی طاقت بنانا چاہتے ہیں۔ زبردست عوامی پذیرائی نے انھیں یہ موقع عطا کیا ہے کہ بھارت میں حزب اختلاف نیم مردہ ہو چکا۔

اُدھر افغانستان میں امریکا ہر قیمت پر اپنی پنھن حکومت لانا چاہتا ہے۔ امریکا نواز اشرف غنی اس کے پسندیدہ امیدوار ہیں۔ اسی لیے امریکی وزیر خارجہ جان کیری افغانستان آئے اور دونوں کی گفتی کا مسئلہ سلجھایا۔ گو بھارت نواز معاصر امیدوار، عبداللہ عبداللہ اب بھی صدر بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ سودہ گاہے بگا ہے نیا مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

ایران بظاہر امریکا سے مفاہمت کر چکا، مگر اندرون خانہ دو اپنا اٹشی منصوبہ کامیابی سے مکمل کر رہا ہے۔ فی الوقت ایرانیوں کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ عراق کی شکست و ریخت سے پڑوس میں یہ شکل کردستان نئی ریاست نہ بن جائے۔ تب امریکی اس نئی ریاست میں دخول کر کے ایرانیوں کے لیے مستقل دوسرے بن سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل مصر میں امریکی پٹو، جنرل السیسی کی آئینہ باد سے اسرائیل اسلام پسند جماعت، حماس پر چڑھ دوڑا۔ جنرل السیسی ظلم و جبر سے اخوان المسلمون کا وقتی طور پر خاتمہ کر چکا۔ پھر حماس کی باری آئی جس کے رہنما بنیادی طور پر اخوانی ہی ہیں۔

یہ مصری حکومت کی کھلی حمایت ہی کا نتیجہ ہے کہ اسرائیلی حکومت درندوں کی طرح غزوہ کے فلسطینیوں پر

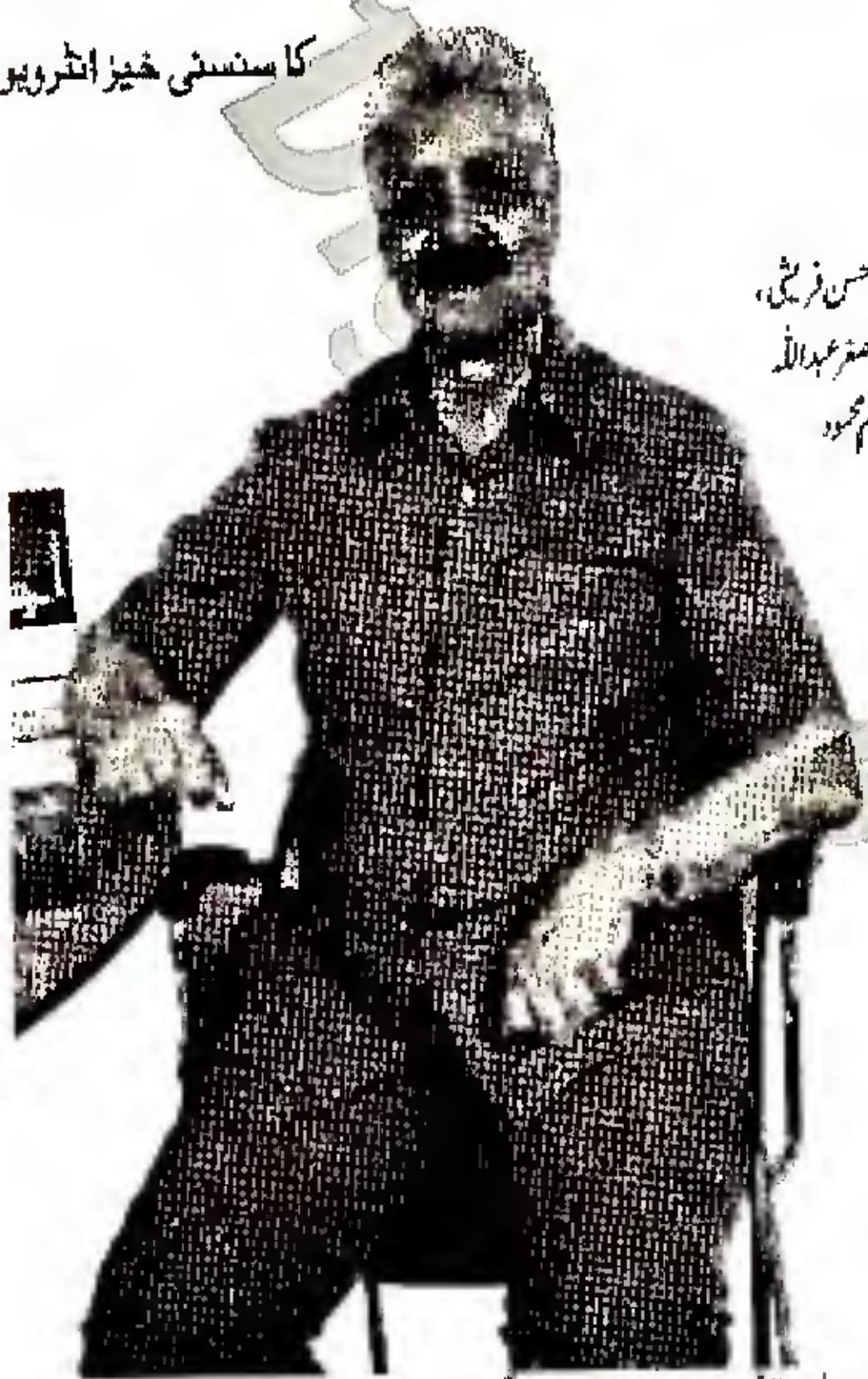


انٹرویو

ریاست خاران کے عام گھرانے کا ہونہار فرزند
بلوچستان سے بننے والا پہلا لیفٹیننٹ جنرل
اصولوں کی خاطر استعفا دینے والا پہلا گورنر
عسکری و سیاسی راز ہائے سر بستہ کا امین

عبدالقادر بلوچ

کا سنسنی خیز انٹرویو



شریک گفتگو: الطاف حسن فریدی،
طیب اعجاز قریشی، اصغر عبداللہ
تحریر: سید عامر محمود

تازک کانڈھوں پر آپڑی۔ چٹاں چہ وزارت کی اہمیت دوچند ہو گئی۔

اوائل میں روزانہ ایک لاکھ متاثرین مضافاتی شہروں میں پہنچنے لگے۔ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو جائے رہائش و خوراک وغیرہ مہیا کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اسی لیے ابتداً پاک فوج اور سہلان، دونوں کو متاثرین کے لیے امدادی سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت، اس لیے غلطیاں بھی ہوئیں اور سہلان کو تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔

جاہم جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کی قیادت میں سہلان کے عملے نے جانفشانی سے کام کیا اور وہ شب و روز نمبر وقف رہے۔ نتیجتاً متاثرین شمالی وزیرستان کی مشکلات کسی حد تک کم ہوئیں اور پریشان کن زندگی میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔

۱۶ جولائی بروز بدھ صبح تقریباً دس بجے جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ بغرض ملاقات دفتر اردو ڈائجسٹ پہنچے، تو حالات کسی حد تک حکومت وقت کے قابو میں آچکے تھے۔ اسی دن ایک حیران کن واقعہ یہ رونما ہوا کہ کئی روز شدید گرمی ہونے کے بعد دفعۃً ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور موسم خوش گوار ہو گیا۔ محسوس ہوا، کسی بھلے لباس کی آمد آمد ہے اور جلد جنرل صاحب آپہنچے۔

جناب الطاف حسن قریشی کی قیادت میں ہم نے ان کا استقبال کیا۔ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ دجیبہ و خوبصورت ہستی ہیں۔ بعد ازاں ان کی باتوں اور رویے سے عیاں ہوا کہ آپ منکسر المزاج و سادگی پسند، خوش وضع و خوش اطوار شخص ہیں۔

جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کو یہ اعزاز حاصل ہے

۱۲ جولائی کی بات ہے کہ جناب طیب اعجاز قریشی نے مطلع کیا، وفاقی وزیر قبائلی علاقہ جات و فائنا لینٹنٹ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ سے ملاقات طے ہو گئی ہے۔ نیٹ اور ساتھیوں سے ان کے متعلق معلومات حاصل کر لیجیے۔

دنیا نے انٹرنیٹ کی وسیع و عریض دنیا میں جنرل صاحب کے بارے میں چند ہی باتیں معلوم ہو سکیں۔ حیرت ہوئی کیونکہ آج نیٹ پر ہر وفاقی وزیر کے متعلق اتنی خاصی بری بھلی معلومات مل جاتی ہیں۔ تبھی احساس ہوا کہ شاید جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ شہرت و خود نمائی سے بے نیاز شخصیت ہیں۔ بہر حال دستیاب نکات ہمارے ممدوح کی اہمیت ضرور اجاگر کر گئے۔

پچھلے دس برس سے قبائلی علاقہ جات اور فائنا جنگ و جدل کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ چٹاں چہ وزیراعظم نواز شریف نے یقیناً دانا و جینا اور تجربے کا رخصت کیا کو وہاں کے صحیہ معاملات سوچنے تھے۔ وزیراعظم کی نگاہ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ پر پڑی۔ چٹاں چہ آپ کو وزارت قبائلی علاقہ جات و فائنا (سنٹر آف سٹیشن اینڈ فرمنیر ایکٹس) سونپ دی گئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہائی پاکستان، قائد اعظم محمد علی جناح کی ذاتی دلچسپی سے اس وزارت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ ”سہلان“ کے مختصر لفظ سے جانی جاتی ہے۔

۱۵ جون کو پاک افواج نے دہشت گردوں کے خلاف آپریشن ضرب عضب کا آغاز کیا، تو شمالی وزیرستان سے متاثرین کی بڑی تعداد مضافاتی شہروں، بٹوں، کرک، لکی مروت وغیرہ پہنچنے لگی۔ ان متاثرین کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی سہلان کے

جاری رہی۔ ۱۹۵۹ء میں واپس خاران آیا اور وہیں سے ۱۹۶۲ء میں میٹرک کیا۔

اس زمانے میں میٹرک پاس کو اچھا خاصا تعلیم یافتہ سمجھا جاتا تھا۔ تاہم میں نے اس پر اکتفا نہیں کیا اور اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ چنانچہ کوئٹہ پہنچا اور وہاں سرکاری کالج میں تعلیم پانے لگا۔ اس زمانے میں وہ بلوچستان کا واحد سرکاری کالج تھا۔ بعد ازاں لورالائی، خضدار اور مستونگ میں بھی کالج کھل گئے۔ چونکہ خضدار میرے آبائی علاقے سے قریب تھا، سو میں وہاں چلا آیا۔ خضدار کالج سے انٹر کیا۔ بعد ازاں کوئٹہ کالج سے گریجویشن کی ڈگری لی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت بلوچستان میں تمام امتحانات لاہور بورڈ کے تحت ہوتے تھے۔ سو میں نے بھی لاہور بورڈ سے میٹرک و انٹر پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔

۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی چلا گیا۔ وہیں ایک دن فوج میں بھرتی کا اشتہار نظر سے گزرا۔ خیال آیا کہ فوج میں جانا چاہیے۔ انٹرویو دیا، تو مجھے منتخب کر لیا گیا۔ میرا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا۔ تعلیمی اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے ہو رہے تھے۔ مگر میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ کیڈٹ کالج جانے کے لیے سفر اختیار کر سکوں۔ سو چتا رہا کہ کس سے مدد مانگی جائے؟

میرے ساتھ بعض بلوچ لڑکے بھی ذریعہ تعلیم تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ فوج والوں نے مجھے منتخب کر لیا ہے۔ میں کیڈٹ کالج چلا جاؤں یا نہیں؟ وہ کہنے لگے، ارے یہ تو خوشی کی بات ہے۔ تم ضرور جاؤ۔ تب انہیں بتایا کہ بھائیو! میرے پاس کرائے کی رقم نہیں۔ انہوں

کہ آپ لفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچنے والے پہلے بلوچ ہیں۔ آپ پہاڑوں، صحراؤں اور پہاڑوں کے دیس، بلوچستان میں پیدا ہوئے۔۔۔۔۔ وہ بلوچستان جس کے مکین، غیور بلوچوں نے تحریک آزادی پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میر یوسف عزیز گھسی سے لے کر نواب محمد جوگیزئی اور قاضی محمد عیسیٰ تک بلوچ رہنماؤں کی جوشیلی سرگرمیاں اس امر کا ثبوت ہیں۔ آج بھی محبت وطن بلوچ پاکستان کی خاطر جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔

جلد ہی انٹرویو کا مرحلہ آن پہنچا۔ جنرل صاحب سے جو سچ و شیریں باتیں ہوئیں، وہ قارئین کی نذر ہیں۔

☆.....

سوال: آپ سب سے پہلے خاندانی پس منظر اور تعلیم و تربیت کے متعلق کچھ بتائیے؟

جواب: آزادی پاکستان کے وقت بلوچستان تین ریاستوں..... قلات، خاران اور لسبیلہ پر مشتمل تھا۔ میں ۱۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو خاران میں پیدا ہوا۔ میرے والد میر رحیم داخان کا تعلق زہری قبیلے سے تھا۔ بیسویں صدی کے وسط تک خاران پاس مانڈہ علاقہ رہا۔ حتیٰ کہ ہمارے علاقے میں پہلا پرائمری اسکول ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔ میرے والدین ناخواندہ تھے، مگر اس زمانے کی روایت کے مطابق غازی رودانی سے بولتے۔ سبھی والدین کے مانند ان کی بھی تمنا تھی کہ میں لکھ پڑھ کر ”صاحب“ بن جاؤں۔

چنانچہ ۱۹۵۶ء میں مجھے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میرے بڑے بھائی نواب شاہ میں مقیم تھے۔ جلد ہی ان کے پاس چلا گیا۔ وہاں بھائی کے زیر سایہ تعلیم

نے بھائی چارے کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے آپس میں رقم جمع کی اور مجھے تھما دی۔ یوں میں اپنے نئے تعلیمی مستقر پہنچا اور میری زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہوا۔

یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ الحمد للہ میں نے خوب محنت کی اور تعلیم و تربیت کے مدارج طے کرتا رہا۔ جب میں کیڈٹ کالج پہنچا تو مجھے پتلون تک پہنچنا نہیں آتی تھی۔ دیگر شہری طور طریقوں سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے کرم سے رفتہ رفتہ میں نے کبھی مشکلات پر قابو پا لیا۔ تربیت پا کر مجھے بلوچ رجمنٹ میں کمیشن ملا۔

میری زندگی کا سنہرا دور تب شروع ہوا جب میں بریگیڈیئر بنا۔ مجھے آزاد کشمیر میں ایک بریگیڈ کی کمان سونپی گئی۔ تب وہاں امن و امان کی صورت حال بڑی مندوش تھی۔ تقریباً روزانہ قاتلنگ ہوتی۔ کبھی بھارتی فوج ہمارے جوانوں کو شہید کرتے، کبھی ہم انھیں مار ڈالتے۔ آزاد کشمیر میں میرا تجربہ مد نظر رکھتے ہوئے ہی بعد ازاں مجھے لیفٹیننٹ جنرل بنا کر ۱۲ ڈویژن کی کمانڈ دی گئی۔ یہ ڈویژن طویل عرصے سے آزاد کشمیر کے دفاع پر متعین ہے۔ دفاع وطن کی خاطر خدمات انجام دینے پر ۱۹۹۵ء میں ستارہٴ بسانت پایا۔ یہ نان آپریشنل شعبے میں سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے۔

جب ۱۹۹۸ء میں پرویز مشرف چیف آف آرمی اسٹاف مقرر ہوئے، تو مری میں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں کراچی کے حالات بڑے خراب تھے۔ روزانہ ۴۰ سے ۲۵ افراد قتل ہو جاتے۔ امن و امان کی صورت حال بہت مندوش تھی۔ جب کراچی کی صورت پر گفتگو ہوئی، تو انھیں بتایا کہ میں شہر قائد کے ناگفتہ بہ حالات سے شناسائی رکھتا اور انھیں قاعدے میں لاسکتا

ہوں۔ یہ جان کر مجھے سندھ ریجنرز کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا۔ میں ۲۰۰۱ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ الحمد للہ اس دوران کراچی کے حالات بہت بہتر ہو گئے اور قتل و غارت میں خاطر خواہ کمی آئی۔

اکتوبر ۲۰۰۱ء میں مجھے لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی ملی اور میں XII کور کمانڈر بن کر کوئٹہ پہنچ گیا۔ ۲۰۰۳ء میں جنرل پرویز مشرف اور اکبر بگٹی کے مابین اختلافات کا آغاز ہوا۔ جنرل صاحب تنازع طے کرانے کے سلسلے میں میری ہمدردی چاہتے تھے۔ سو میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لی اور فروری ۲۰۰۳ء میں گورنر بلوچستان بن گیا۔

لیکن جلد ہی اکبر بگٹی کے معائنے پر جنرل پرویز مشرف سے میرا اختلاف ہو گیا۔ وہ طاقت کے بل پر اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ جب کہ میں بذریعہ گفت و شنید مسئلہ حل کرانے کے حق میں تھا۔ تب تک اکبر بگٹی میرے ساتھ رابطے میں آچکے تھے۔

میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ بات چیت کا راستہ ہی درست تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر بگٹی مغرور اور انا پرست انسان تھے۔ مگر وہ محبت الوطن پاکستانی تھے۔ انھوں نے سرعام پاکستان کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہا، بس وہ اپنے ڈھنگ سے زندگی گزارتے تھے۔

میں نے جنرل مشرف کو بتایا تھا، یہ ۸۰ سالہ بوڑھا آدمی ہے۔ جلد چل بیسے گا۔ اگر اس کے خلاف طاقت استعمال ہوئی اور یہ لڑتے ہوئے مارا گیا، تو امر ہو جائے گا۔ تب مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔

۲۰۰۶ء سے قبل آزادی بلوچستان کی باتیں صرف ڈرائنگ روم تک محدود تھیں۔ لیکن اکبر بگٹی کی موت کے بعد آزادی کے لیے جلسے جلوس نکلنے لگے اور

تقریریں ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں میں پرچم لہرا کر جرم قرار پایا۔ اکبر مکنی صرف یہ چاہتے تھے کہ مقامی وسائل پر صوبائی حکومت کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ اور میں بھی اس مطالبے سے اتفاق کرتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ وسائل صوبائی حکومت کے کنٹرول میں نہ ہونے کی وجہ سے بلوچستان پس ماندہ رہ گیا۔ تاہم پچھلے دو تین برس سے وہاں زور شور کے ساتھ ترقیاتی منصوبے جاری ہیں۔ انھیں کامیابی سے مکمل کرانے کے لیے ہماری حکومت بھرپور توجہ دے رہی ہے۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ قومی اسمبلی میں بلوچستان سے صرف ۱۶ ارکان منتخب ہیں۔ چنانچہ وہ توانا آواز سے صوبے کے مسائل پر گفتگو نہیں کر پاتے۔ نمائندگی کم ہونے کی وجہ سے بھی بلوچستان کو نظر انداز کیا گیا۔

سوال: عام خیال یہ ہے کہ بلوچستان میں فوج کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ سو اس خاص ماحول میں آپ کا فوج کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

جواب: جب میں بھرتی ہوا، تو بلوچستان میں فوج سے متعلق منفی تاثر موجود نہیں تھا۔ تب صرف ۱۹۵۸ء میں ایک دفعہ بلوچوں پر لشکر کشی ہوئی تھی۔ ویسے بھی میرا فوج میں جانا ایک اتفاق تھا۔ میرے والد ۱۹۶۲ء میں وفات پا چکے تھے۔ لہذا ترنگ آئی، تو فوج میں انٹرویو دے آیا۔ میری والدہ اور بھائیوں کو تین ماہ بعد پتا چلا کہ میں فوج میں بھرتی ہو چکا۔

سوال: آپ فوج میں رہے، پھر سیاست کی طرف چلے آئے۔ ان دونوں شعبوں میں زندگی گزارتے ہوئے آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟

جواب: میں بچے بولوں گا، شاید کچھ لوگ ناراض ہو

جائیں۔ فوج میں فوجی سے کچھ پوچھا جائے، تو جھوٹ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر سیاست میں جھوٹ کا بہت چلن ہے۔ بہر حال مجھ پر اللہ کا کرم ہے، میں نے سیاسی زندگی میں کبھی غلط بیانی نہیں کی۔

سوال: مگر حکومت تو سیاست دان ہی کرتے ہیں اور انہی کو کرنی چاہیے، نہ کہ معاملات فوج کے سپرد کر دیے جائیں۔ چنانچہ سیاست کو جھوٹ اور منافقت سے کیسے جھٹکارا دلایا جائے؟

جواب: اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عوام حکمرانوں پر نظر رکھیں اور وہ کوئی غلط کام کریں، تو ان کا فوراً احتساب کیا جائے۔ لیکن عوام یہ ذمے داری اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب ملک میں جمہوریت مضبوط ہو۔

اگر پاکستان میں مسلسل انتخابات ہوتے رہتے، تو آج یہاں بھی جمہوریت مستحکم ہوتی۔ انتخابات کے ذریعے ہی سیاست سے گندے انڈے نکل جاتے اور اہل دیانت دار اور محبت وطن سیاست دان سامنے آتے۔ بد قسمتی سے ملک میں وہاں فوٹا ہارشل لا لگتے رہے جنہوں نے سیاسی و معاشرتی نظام تباہ کر دیا۔ یوں فوج کا وہاں بھی بری طرح متاثر ہوا۔

اگر اب تک تیرہ چودہ الیکشن ہو جاتے تو ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگ آج سیاست کے بادشاہ نہ ہوتے۔ تب سیاست دان ہر بار جھوٹ نہ بول پاتے اور تب خلوص و سچائی سے کام کرتے یا منظر عام سے ہٹ جاتے۔ اگر آپ ایک فیکٹری لگائیں تو اُسے اپنے ہیروں پر کھڑا ہونے میں تین چار سال لگ جاتے ہیں۔ حکومت سازی پانچ سال کا عرصہ ہے جسے ہر سیاسی جماعت کو مکمل کرنا چاہیے۔

مانے ہے۔ قبائلی علاقہ جات سے لے کر بلوچستان تک فوجی آپریشنوں پر اربوں روپے خرچ ہو چکے، مگر کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اگر گفت و شنید سے مسائل سلجھائے جاتے، تو بہت پہلے حل نکل آتا۔

مسلم لیگ ن میں آنے کی ایک اہم وجہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پنجاب وطن عزیز کے تمام مسائل حل کرنے کی صلاحیت و قدرت رکھتا ہے۔ قومی اسمبلی میں سب سے زیادہ نمائندگی بھی اسی صوبے کی ہے۔ لہذا میں نے یہ سوچ کر مسلم لیگ ن میں شمولیت اختیار کی کہ یہاں تو اوز شریف کے تعاون سے مسئلہ بلوچستان سلجھا سکیں۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ جنرل راجیل شریف کی لہجائی آپ کے مشورے سے ہوئی؟

جواب: جنرل راجیل نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔ میں ان کے متعلق اچھی رائے رکھتا ہوں۔ مگر چیف آف جنرل اسٹاف کے انتخاب سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

سوال: آپ کراچی میں ڈی جی رینجرز رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں کراچی کی صورت حال کو درست کرنا کس طرح ممکن ہے؟

جواب: کراچی اور دیگر شہروں میں پچھلے دو عشروں سے ایک بڑی غلط رہت چل پڑی ہے۔ وہ یہ کہ سیاسی جماعتوں نے اپنے مسلح دھڑے بنا لیے۔ ان دھڑوں میں جرائم پیشہ لوگ بھی شامل ہوئے۔ رفتہ رفتہ انہی کے ذریعے سیاست بھی کی جانے لگی۔ پھر گولی کی زبان بولی گئی، تو معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے چلے گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کراچی کے حالات اسی وقت بہتر ہوں گے جب تمام سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مسلح دھج

اب پاکستان کی بقا اسی صورت میں ممکن ہے کہ جمہوریت جیسی بھی ہو، اسے چلتے دیا جائے۔ متواتر انتخابات ہونے سے عوام خود بخود ان امیدواروں کو ووٹ دیں گے جو کچھ کر دکھانے کی صلاحیت اور جذبہ رکھتے ہوں۔ انتخابات کے عملی تقصیر سے سیاسی جماعتیں بھی مضبوط ہوں گی اور رشوت و زانی مفادات ترجیح پس منظر میں چلے جائیں گے۔

سوال: جمہوریت بھی مضبوط ہوگی جب عوام ہاشور ہو جائیں۔ فی الوقت ان کی اکثریت تو ناخواندہ ہے۔

جواب: یقیناً بہت سے پاکستانی ناخواندہ ہیں۔ مگر پچھلے ایک عشرے کے دوران پاکستان میں زبردست تہذیبی آئی ہے۔ وہ یہ کہ اب میڈیا آزاد ہے۔ اب دو وزراء سے لے کر سیاست دانوں اور سرکاری افسروں تک، سبھی پر نظر رکھتا ہے۔ خاص و عام کے سامنے حکومتی کارکردگی لاتا ہے۔ آزاد میڈیا کے باعث عوام کو خود بخود آگہی اور شعور مل رہا ہے۔

سوال: جنرل (ر) پرویز مشرف آپ کو سیاست میں لائے۔ تاہم اب آپ مسلم لیگ ن میں شامل ہیں۔ اس انتخاب کے پیچھے کوئی مصلحت کارفرما تھی؟

جواب: یہ درست ہے کہ جنرل (ر) مشرف نے مجھے گورنر بلوچستان مقرر کیا۔ یہ ایک طرح سے ان کی عنایت تھی۔ یوں میں میدان سیاست میں بھی چلا آیا۔ لیکن مملکت شخصیات سے بالاتر چیز ہے۔ اسی لیے جب میرا ان سے اختلاف ہوا، تو میں نے مملکت کے مفاد ہی کو مقدم رکھا۔

جنرل مشرف طاقت کے ذریعے مسائل حل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس سے جو نتیجہ نکلا، وہ آپ کے

ختم کر دیں اور جو بھی اختلاف ہیں، وہ گفت و شنید سے حل کیے جائیں۔ کراچی ماضی کے مانند پرامن و خوشحال شہر بن جائے گا۔

کراچی پاکستانی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی جیسی بچا دیا..... عمران خاں نعرہ دھاندلی بلند کرنے لگے تو

ڈاکٹر طاہر القادری انقلاب کے نعرے لگاتے آ رہے تھے۔

حالانکہ ہمارا ملک حالت جنگ میں تھا..... ایسی جنگ جو ایک لحاظ سے پچھلی تمام جنگوں سے بڑی اور سنگین ہے۔ وجہ یہ کہ یہ نامعلوم دشمن کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ یہ دشمن رہن سہن اور بول چال میں ہم سے ملتا جلتا ہے۔ پھر وہ کبھی قبائلی علاقوں میں ہوتا، کبھی سرحد پار پہنچ جاتا ہے۔ اسلام آباد لاہور اور کراچی میں بھی اس کے اڑے واقع ہیں۔ سو ہمیں ہر جگہ اس سے لڑنا ہے۔

اس نازک موقع پر ہونا یہ چاہیے تھا کہ عمران خاں یا ڈاکٹر صاحب کو کچھ شکایات ہیں تو وہ آپریشن کے خاتمے تک صبر کرتے۔ مگر انھوں نے اتنا دبا دبا کر دیا کہ ملک میں پھیلی بد امنی اور بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

خاں صاحب کی شاید سوچ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے

میں دوستوں سے اُدھار رقم لے کر کیڈٹ کالج پہنچا اور یوں عسکری تعلیمی سفر کا آغاز ہوا۔

جب میں کیڈٹ کالج پہنچا تو مجھے پتہ نہ تھا کہ باندھنا نہیں آتی تھی۔ دیگر شہری طور طریقوں سے بھی ناواقف تھا۔

میں نے ۱۹۹۵ء میں ستارہ برسات پایا۔ یہ تین آپریشنل شعبے میں سب سے بڑا فوجی اعزاز ہے۔

اکبر بگٹی کے معاملے پر میرا جنرل مشرف سے اختلاف ہوا۔ وہ طاقت کا استعمال چاہتے تھے میں گفت و شنید کا حامی تھا۔

اکبر بگٹی مغرور اور اتنا پسند انسان تھے مگر انھوں نے کبھی سرعام پاکستان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ وہ محبت الوطن پاکستانی تھے۔

فوج میں کوئی جوان یا افسر جھوٹ بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتا، مگر سیاست میں دروغ گوئی کا خاصا چلن ہے۔

میں مسلم لیگ ن میں اس لیے شامل ہوا کہ یہی سیاسی جماعت مسئلہ بلوچستان حل کرانے کی اہلیت و طاقت رکھتی ہے۔

منیٹ رکھتا ہے۔ وہاں امن ہونے سے پاکستانی معیشت خود بخود ترقی کرے گی۔ اسی لیے میاں نواز شریف بھرپور کوشش کر رہے ہیں کہ وہاں سے دہشت گردی کا خاتمہ کر دیں۔

سوال: آپریشن ضرب عضب شروع ہوا تو ضروری تھا کہ تمام قومی سیاسی جماعتیں حکومت کے شانہ بشانہ کھڑی ہو جائیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ وجہ کیا ہیں؟

جواب: بد قسمتی سے کوئی سیاسی جماعت اچھے کام کرنے لگے تو دیگر پارٹیاں اس کی ٹانگ نہ کھینچنے لگتی ہیں۔ انھیں خوف ہوتا ہے کہ اگر اس

جماعت نے اسٹیج بیانے پر ترقیاتی کام کرائے ملک کو ترقی و خوشحالی کی راہ پر ڈال دیا تو پانچ سال بعد اسی کو دوث ملیں گے۔ مسلم لیگ ن کے معاملے میں بھی

لیے خاں صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے چلے حکومت کا بال بیکا نہیں کر سکے اور نہ کر سکیں گے۔

پیری مریدی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے گرد چند لاکھ مرد و زن جمع ہیں۔ اسی زعم میں وہ کہنے لگے کہ میں جو چاہوں کروں گا۔ لیکن کیا ہم پاکستانی عوام کو قیدی بنا کر ان کے حوالے کر دیں؟ اگر یہ ریت پڑی تو دوسرے ہم رنگ مطالبات لیے سامنے آ جائیں گے۔

سوال: بھارت میں لاکھ ہزارے نے بھی بہت بڑے چلے جلوس نکالے تھے مگر کانگریس حکومت ختم نہ ہو سکی۔ پاکستان میں محسوس ہوتا ہے کہ حزب اختلاف کے لانگ مارچ سے ابتری ضرور پھیلے گی؟

جواب: اٹا ہمارے کچر وال وغیرہ اپنی حکومت کے اسکینڈلوں کی وجہ سے عوام میں آئے اور انہیں احتجاج پر ابھارا۔ میں یہ بات فر سے کہتا ہوں کہ ہماری حکومت کو آئے ۱۳ ماہ گزر چکے لیکن کوئی مالی یا اخلاقی اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں راہ راست پر رکھے۔

سوال: چند ماہ حکومت اور فوج کے مابین سرد مہری رہی۔ اس وجہ سے بھی حزب اختلاف کی احتجاجی مہم ضرور شور سے چل پڑی۔

جواب: فوج اور حکومت کے مابین کوئی اختلاف نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج اور حکومت ایک ہی اکائی کے دو رخ ہیں۔ فوجی جوان و افسر حکومت کے ملازم ہیں۔ جب کہیں امن و امان کا مسئلہ درپیش ہو تو حکومت اسے حل کرنے کی خاطر فوج سے بھی مدد لے سکتی ہے اور لیتی ہے۔

دراصل جنرل (ر) پرویز مشرف نے کچھ عسکری و سول شخصیات کو قانون کے دائرے سے ہٹ کر فوائد

اکھوتے لیڈر ہیں۔ مگر وہ اس بابت ایک لفٹ منٹ سے نہیں نکالتے کہ بلوچستان، خیبر پختون خواہ اور سندھ میں کیونکر ایکشن ہوئے۔ وہ بس پنجاب کی چار نشستوں کو لے کر بیٹھ گئے۔ فرض کریں ان کے مطالبے پر اسمبلیاں توڑ دی جائیں تو بلوچستان، سندھ اور خیبر پختونخواہ کے لوگوں کا کیا تصور ہے کہ ان سے پانچ سال حکومت کرنے کا حق چھین لیا جائے؟

شکایات دور کرنے کی خاطر پاکستان میں قانونی طریق کار موجود ہے۔ خاں صاحب کو چاہیے کہ عوامی سطح پر دنگ فساد کرنے کے بجائے وہ ایکشن کمیشن سے رجوع کریں۔ وہاں شکایت دور نہ ہو تو ایکشن ٹریبونل جائیں۔ وہاں حسب دل خواہ فیصلہ نہ ملے تو سپریم کورٹ چلے جائیں۔ لیکن سڑکوں پر احتجاج تو کوئی طریقہ نہ ہوا۔

یہ بھی دیکھئے کہ حکومت کے خلاف وہ لوگ شور مچا رہے ہیں جنہیں ایکشن میں عوام مسترد کر چکے۔ مثال کے طور پر چودھری برادران کو لیجیے۔ انہوں نے جنرل (ر) مشرف اور بھر پی بی پی حکومت کے ساتھ طویل وقت حکومت میں گزارا مگر پچھلے ایکشن میں انہیں صرف دو نشستیں ہی مل سکیں۔

سوال: ۱۹۷۷ء میں پی این اے کی بھی قومی اسمبلی میں نشستیں نہیں تھیں مگر وہ بھٹو حکومت پہ حاوی ہو گئی۔ آپ کے خیال میں نواز شریف حکومت کو بھی حزب اختلاف کی تحریک سے خطرہ درپیش ہے؟

جواب: بھٹو صاحب نے تو فراڈ ایکشن کرائے تھے اسی لیے کسی نے قبول نہیں کیے۔ لیکن ۲۰۱۳ء کے ایکشن تمام سیاسی جماعتوں نے تسلیم کیے۔ اب ایک سال بعد ہاسی کڑھی میں اقبال آ گیا۔ مگر حکومت چلے جلوہوں سے نہیں اپنے برے کرتوتوں کی وجہ سے گرا کرتی ہے۔ اسی

لائگ مارچ کرتے ڈی چوک (اسلام آباد) پہنچیں گے۔ لیکن حکومت نے اسی جگہ ہم آزادی کی تقریب رکھ لی۔ اس فیصلے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

جواب: پاکستان میں یوم آزادی ہمیشہ شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔ یہ جنرل (ر) مشرف تھے کہ انھوں نے اسلام آباد میں یہ موقع یوم آزادی پر بندہ پابندی لگا دی۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ یوم آزادی شایان طریقے سے منایا جائے۔ اس فیصلے کا کسی سیاسی جماعت کے جلسے سے تعلق جوڑنا صحیح نہیں۔ دنیا میں سبھی باعزت قومیں چوک و احتشام سے اپنا یوم آزادی مناتی ہیں۔

سوال: تصادم کی تہاوری تو نہیں ہو رہی؟
جواب: جہادی حکومت کسی سے تصادم نہیں چاہتی۔ بلکہ وہ افہام و تفہیم سے معاملات سلجھانے کی سعی کرتی ہے۔

سوال: یوم آزادی کے موقع پر نو جوانان پاکستان کے نام کوئی پیغام؟

جواب: میرا یہی پیغام ہے کہ جمہوریت کی حفاظت کیجیے اور اسے مضبوط سے مضبوط تر بنائیے۔ پاکستان میں آمریت کے بجائے جمہوریت کو پھلنا پھولنا چاہیے۔ خدا نخواستہ اگر اب مارشل لا آیا اور جمہوریت کی گاڑی پٹری سے اتری تو حالات بہت حساس و خراب ہو جائیں گے۔

جب بھی مارشل لا لگئے خاص طور پر سندھ اور بلوچستان میں لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب سب کچھ جنرلوں کے ہاتھ میں آ گیا اور انھیں سرکاری ملازمت نہیں ملے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف جمہوریت کے ذریعے ہی پاکستان کی بہتر ترقی و خوشحالی ممکن ہے۔

جواب: بات یہ ہے کہ جب بھی نئی حکومت آئے تو عوام اس سے از حد توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ اور جب حکومت نتائج دے سکے تو عوام مایوسی کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ بہر حال ہماری حکومت کی بھرپور سعی ہے کہ عوام کی مشکلات اور مسائل حل کیے جائیں۔

سوال: حکومت میں خاصی بدانتظامی نظر آتی ہے۔ یہ بھی دیکھئے کہ دو کئی سرکاری اداروں اور محکموں کے سربراہ تک مقرر نہیں کر سکی۔

جواب: دراصل ہم ہر ادارے میں صاف ستھرے کردار کے افسر متعین کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے افسر منتخب کرنے میں دیر ہو گئی۔ تاہم جلد فرض شناس و ایماندار لوگ سرکاری ادارے سنبھال لیں گے۔

سوال: لیکن حکومت نے جن شخصیات کو سرکاری اداروں کا سربراہ بنایا عدالتوں نے انھیں برطرف کر دیا۔ ایسے چار پانچ واقعات ہو چکے۔ مثلاً لیٹل دی ٹی سی بی اور ہتھرا کے سربراہ ہٹا دیے گئے۔ یوں ایک دفعہ کوئی سربراہ برطرف ہو جائے تو اس کی اخلاقی قوت کو ضعف پہنچتا ہے۔

جواب: مگر یہ بھی دیکھئے کہ جو عدالت جس سرکاری افسر کو برطرف کرنے دوسری عدالت اُسے بحال کر دیتی ہے۔

سوال: مگر حکومت بھی رات کو ایک دو بچے مخالف افسروں کو خارج کر دیتی ہے۔ نادرا کے طارق ملک کو اسی تلخ صورت حال سے گزرنا پڑا۔ ایک مہذب ملک میں ایسا تو نہیں ہوتا۔

جواب: ہم نے طارق صاحب کو بہت پہلے خارج کر دیا تھا۔ بہر حال میں اس امر سے اتفاق کرتا ہوں کہ افسروں کو گھر بھجوانے کا معقول و باعزت طریقہ کار ہونا چاہیے۔

سوال: عمران خاں کا کہنا تھا کہ وہ ۱۳/اگست کو



چشم کشا

قائد کی

تصویر بنانا دو

ایک فرض شناس پولیس انسٹرکشنر کا سیاسی حکومت سے انوکھا مطالبہ

ذوالفقار احمد چیمہ (آئی جی منور سے پولیس)



باقی سب کچھ بھول گیا۔ پھر ایک ہی ذہن تھی اور ایک ہی مقصد..... مسلمانوں کو علیحدہ شناخت، پہچان اور شخص دانا اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنا۔ اسی مقصد کے پھیل کے لیے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ صحت، خاندان، زندگی..... اپنے ٹی بی زدہ نحیف جسم کے ساتھ وہ طاقتور ترین قوتوں سے لڑا اور ان سے دنیا کی سب سے بڑی نعمت..... آزادی چھین کر مسلمانوں کی جھولی میں ڈال دی۔

یوں ہمیں غلامی چھین بدترین ذلت سے بچا لیا۔ نیا ملک بنا کر دیا اور پھر جاتے جاتے بھی کچھ لے کر نہیں گیا بلکہ اپنا سب کچھ اپنی قوم کو دے گیا..... خون کا ایک ایک قطرہ تجڑ چکا تو اپنی جائیدادیں بھی اسی ملک کے مختلف تعلیمی اداروں کے نام کر گیا۔

کہتے ہیں قائد جاتے ہوئے یہ عظیم میراث، یہ

کی ڈگری بیٹے کے بعد میں نے مقابلاً کا امتحان پاس کیا اور پولیس میں اسے ایس پی بن گیا۔ خیال تھا کہ مقابلے کا

امتحان آخری ہو گا۔ وردی پہنی تو معلوم ہوا کہ اب ہر روز ایک نئے امتحان کا سامنا ہے..... ایک سے ایک مشکل۔ پہلے روز دفتر داخل ہوا تو کسی کے سین اوپر قائد کا پورٹریٹ لگا تھا۔ سیوٹ کر کے باپ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو محسوس ہوا یاد دہانی کر رہے ہیں کہ

"ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کر

اس ملک کو رکھنا میرے بچے سنبھال کر"

ذہن کی اسکرین پر قائد کی پوری زندگی اور جدوجہد کی فلم چلنے لگی۔ نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والا ہمیشہ کا امیر ترین وکیل..... مسلمانوں کے حقوق کا پرچم تھامے نکلا تو

اردو ڈائجسٹ 64 (1)

اگست 2014ء

وطن عزیز پاکستان نئی نسل کے سپرد کر کے کہہ گئے تھے ”اب اس کی حفاظت تمہارے ذمے ہے۔ لہذا اپنے فرائض ایمانداری سے ادا کریں اور قانون کی حکمرانی کا پرچم ہمیشہ بلند رکھیں۔“ مجھے یوں لگا قائد مجھ سے حلف لیتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ تحفظ وطن کا فریضہ ادا کرو گے؟ میں نے پھر سیلوٹ کیا میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”ہاں بابا! کروں گا۔“ (Yes! I will do it)

دو مہینے ہی بیتے تھے کہ میرے علاقے میں ملک کے بہت بڑے اور انتہائی بااثر گدی نشین نے ایک جرم کا ارتکاب کر ڈالا۔ قانون کے مطابق کارروائی ہونی چاہیے تھی۔ میرے سینئر انسپکٹر گدی نشین ہر صاحب کے عقیدت مند تھے اس لیے قحانے والے کسی کارروائی سے گریزاں رہے۔ مقامی رکن اسمبلی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔ کہنے لگا ”جو کام پانچ سو سال میں نہ ہوا“ اُسے انجام دے کر آپ غلط روایت نہ ڈالیں۔“

دفتر آکر بابا کی طرف دیکھا تو مسئلے کا حل واضح نظر آ گیا ”قانون کی حکمرانی.....“ قحانے خود جانا پڑا، شاید پہلی بار گدی نشین گھرانے کے اہم ترین فرد کے خلاف پرچہ درج ہوا اور قانون کے مطابق کارروائی ہوئی۔

اس کے بعد دوران ملازمت تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اگلی منزل بھلائی تھی۔ قتل کے ایک اہم کیس کی تفتیش میں خود کر رہا تھا۔ دفتر بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف ملک کے وزیر داخلہ تھے۔ اسی قتل کے دو ملزموں کو چھڑوانا چاہتے تھے۔ فون سننے کے بعد پھر بابا کی طرف دیکھا تو ساری ہدایات نظروں کے

سامنے آ گئیں ”ہر قیمت پر انصاف۔“

بابا وزیر ایک جو نیر اے ایس پی سے دھکی آمیز لہجے میں ملزموں کو چھوڑنے پر اصرار کرتے رہے مگر نوجوان پولیس افسر کو اللہ نے بہت دی اور اس نے دہاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے انصاف کے تقاضے پورے کر ڈالے۔

پولیس افسر کے عہدے اور پڑاؤ بدلتے رہے۔ اب وہ بہت بڑے شہر میں تعینات تھا اور کندھوں پر ستاروں کی جگہ چاند نے لے لی۔ حکومتی مخالفین میں سے ایک شخص بڑا منہ پھٹ تھا، حکمران اس سے بہت زیادہ تنگ تھے مگر وہ اپنے حلقے میں مقبول تھا۔ انتخاب سے ایک روز پہلے کسی خاص جگہ اہم ترین میٹنگ ہوئی جس میں ہدایات دے دی گئیں کہ چاہے ڈبے اٹھانے پڑیں مگر اسے کسی صورت نہیں جیتنا چاہیے۔

پولنگ کے روز پولیس افسر نے راؤنڈ لگا کر دیکھا تو اس کے کیپ دونوں سے بھرے ہوئے تھے اور حکومتی امیدوار کی حالت پتلی تھی۔ وائرلیس پر اطلاع ملی کہ ایک بہت بڑے انتظامی افسر نے پولنگ روک دینے کا حکم دیا ہے۔ میٹنگ میں ملنے والی ہدایات پر عمل شروع ہو گیا تھا۔

پولیس کمانڈر کرسی سے اٹھا تو بابا پر نظر پڑی۔ غور سے دیکھا تو واضح راہنمائی مل گئی ”ہر قیمت پر غیر جانبداری“ وہ فوراً اس حلقے میں پہنچا تو دیکھا کہ پولنگ بڑے پرامن طریقے سے ہو رہی تھی۔ ڈی ایس پی اور بمسٹریٹ پولنگ بند کرانے لگے تو پولیس کمانڈر نے یہ کہہ کر روک دیا ”اس سے حالات

خراب ہوں گے۔ ہمارا فرض امن وامان بحال رکھنا ہے خراب کرنا نہیں۔“

اسی وقت پولیس افسر کو اس کے آپریٹر نے فون پکڑا دیا۔ وہی بڑے انتظامی افسر لائن پر تھے۔ کہنے لگے ”آپ جانتے ہیں..... صاحب کی واضح ہدایات موجود ہیں۔“

پولیس کمانڈر نے کہا ”میزے پاس ان سے ”بڑے صاحب“ کی ہدایات ہیں کہ ہر قیمت پر غیر جانبدار رہنا ہے۔

چونکہ کر پوچھنے لگے ”کس کی؟“
”جس کے طفیل انہیں حکمرانی اور آپ کو اور مجھے افسریاں ملی ہیں..... پاکستان کے بانی محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی۔“ فون بند ہو گیا۔

اب کندھے پر چاند کے ساتھ دو ستارے بھی لگ چکے تھے۔ وہ ایک بڑے ضلع میں پولیس کا سربراہ تھا۔ کچھ با اثر لوگ متنازع زمینوں اور پلاٹوں پر قبضہ کرنے کے ماہر تھے۔ انھوں نے ایک ایسے مکان پر بھی قبضہ کر لیا جو غریب بیوہ کا تھا۔ اخبار میں خبر پڑھ کر پولیس افسر دفتر میں داخل ہوا تو وہ بابا سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر سکا۔ اسے ڈر سا لگنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے قائد فیس میں کہہ رہے ہوں ”تم کیسے محافظ ہو؟ میرے ملک میں ایک غریب بیوہ کو تحفظ نہیں دے سکتے تو تمہیں وردی پینے کا کوئی حق نہیں۔ جاؤ کوئی اور نوکری کر لو۔“

اس نے انسپکٹر اور ڈی ایس پی کو ہدایت دی کہ بیوہ کو ہر ممکن مدد دی جائے۔ مگر وہ بے بس لگے

کہ قابض افراد اس وزیر کے بندے تھے جو افسروں کی تقرری و تہادلے میں کلیدی کردار ادا کرتا تھا۔ پولیس افسر ساری رات نہ سو سکا۔ اسے ایسے لگا کہ بابا لعن طعن کر رہے ہیں۔ علی الصبح وہ موقع پر خود پہنچا۔ قبضہ گروپ کا تالا توڑ مکان بیوہ کے حوالے کیا۔ قبضہ کرنے والے بد معاشوں کو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ دفتر پہنچا۔ اس نے سیلٹ کیا تو بابا اسے بہت خوش نظر آئے۔

اسے دریاں اور کندھوں کے بیچ بڑھ گئے۔ اب وہ ایک ڈویژن میں پولیس کا سربراہ تھا۔

ایک جابر ڈکٹینر نے چھٹی، ساتویں صدی والے احکام جاری کر کے عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاریوں کے احکام سن کر وہ بوجھل دل سے کواہٹ کے ڈی آئی جی اسٹس داخل ہوا تو پھر بابا سے سامنا ہوا بابا آج بہت مغموم نظر آ رہے تھے۔ ان کا مغموم چہرہ دیکھ کر پولیس افسر کی آنکھیں نم اور دل دکھی ہو گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے جھکا سر اوپر اٹھایا تو سامنے قائد کے واضح احکامات نکر کی طرح چلتے نظر آئے۔ صرف قانونی (lawful) احکامات پر عمل درآمد کیا جائے۔ اسے راہنمائی مل گئی تھی: ”صرف قانونی احکامات پر عملدرآمد“! ڈویژن کے ضلعی پولیس سربراہ ہدایات لینے دفتر آئے تو انہیں بتا دیا گیا کہ قانون کی حکمرانی قائم ہوگی۔ کسی بے گناہ کو گرفتار نہ کیا جائے اور کسی غیر قانونی حکم پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔ مشرف کے کہنے کے باوجود کواہٹ ڈویژن میں کوئی وکیل، صحافی یا

ایران اسپلی اپنی مرضی کے افسر لگوائیں جو ذاتی ملازموں کی طرح ان کے کام کریں تو پھر ایک اور کام بھی کر ڈالیں۔ ایک انتظامی حکم کے تحت دفاتر سے فائدہ کی تصاویر ہٹا دیں تاکہ باغیہ سرکاری افسروں کو ہانپا کا سامنا کرتے وقت شرمساری کا احساس نہ ہو۔ ♦♦♦

شرانگیز ماسٹر تارا سنگھ

مہاتما گاندھی پھڑت نہرو اور سردار پٹیل نے پنجاب میں اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کو دانہ بیہوشی کھلا رکھا تھا جس کے اثر سے وہ طرز طرح کی دل خراش بولیاں بولے اور ایک زراغ کہیں سال یا دوڑھا کر گس ہو کر شاہین ہولے کا دموتی کرنا تھا اس نے کئی مواقع پر یہ پھندہ بانہ بڑا لگی تھی

”اگر مسلمانوں کو ان کے مطلوبہ حقوق دیے گئے تو خون کی ندیاں بہا دی جائیں گی۔“
”وہ نہ صرف مشرق پنجاب بلکہ سارے پنجاب سے مسلمانوں کو نکال دے گا۔“
”سکھ پنجاب کے مالک ہیں۔ انگریزوں نے پنجاب سکھوں سے لیا تھا۔“

”سکھ عنقریب خون کی ہولی کھیلیں گے۔“
چنانچہ ۱۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو اس نے اسپلی ہال (لاہور) کے باہر نکلتے ہوئے فتنہ پروازی کا آغاز کر دیا اور ایک شرانگیز تقریر کی۔ ممکن تھا کہ اسی موقع پر مسلمانوں اور ہندو سکھوں میں تصادم ہو جاتا مگر خان افتخار حسین صدر مسلم لیگ پنجاب کے تدبیر سے معاملہ ٹل گیا۔

(وہ امر تر تھا سے اقتباس)

سیاسی کارکن گرفتار نہ ہوا۔ وہ کسی اور کی نہیں ہالی پاکستان کی ہدایات کے باعث گرفتار نہیں ہوئے۔

پڑاؤ پھر تبدیل ہو گیا۔ اگلی منزل ملک کا سب سے بڑا صوبہ اور اس کا سب سے بڑا ڈویژن بنا۔ جلد ہی امتحان بھی پڑاؤ آن پڑا۔ ضمنی انتخاب کا معرکہ درپیش تھا۔ دونوں بڑی پارٹیاں غم ٹھوک کر میدان میں آگئیں۔ صوبے کی حکمران جماعت کے سب سے طاقتور وزیر نے آکر ڈیرہ جمالیا وہ ہر قیمت پر الیکشن جیتنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا ”الیکشن ہارنا ہمیں وارہ نہیں کھاتا۔ اس سے حکومت کی ہوا اکھڑ جائے گی۔“

پولیس افسر کا کہنا تھا ”آپ غیر قانونی کریں گے تو حکومت کی سادھ ختم ہو جائے گی۔ اس سے حکومت کا زیادہ نقصان ہو گا“ ادھر سے پولیس کے استعمال پر اصرار ادھر سے انکار ہوا۔ اصرار میں اضافہ ہوا تو پولیس افسر نے صاف صاف الفاظ میں بتا دیا ”مجھے یہاں سے تبدیل کرادیں۔ اگر میں رہا تو آپ کی خواہشات نہیں اس کی ہدایات پر عمل ہو گا جس نے ملک بنایا جس کے طفیل آپ وزیر ہیں اور میں ڈی آئی جی لہذا میں قائد کے حکم پر عمل کرنے کا پابند ہوں۔ اس کی ہدایات کے مطابق پولیس غیر جانبدار رہے گی۔“

پولیس کمانڈر نے الیکشن کے نتائج تبدیل نہ ہونے دیے تو وہ خود تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ قائد کے سامنے شرمسار نہیں سرخورد ہوا ہے۔

اگرچہ کچھ سیاسی راہنماؤں کا یہی ایجنڈا ہے کہ صرف انتخابی مہم میں قائد اعظم کا نام استعمال کریں اور الیکشن جیتنے کے بعد ان کے وژن کی دھجیاں اڑا دیں۔

PREQUALIFICATION NOTICE
5th PROVINCIAL BUILDINGS DIVISION, LAHORE

Applications are invited for prequalification of Contractors who have been registered in PEC in the relevant categories and reviewed for the year 2014-15 in Construction & Works Department having good repute and experience of executing works of similar nature in the public sector for participating in the tenders of the following works:-

SRL NO	NAME OF WORK	APPROXIMATE COST	CATEGORY
1.	Balance work Construction of Additional Assembly Building Lahore (at Risk & Cost of M/s Huseain Orosix (Pvt) Ltd)	Rs. 950000 Million	C-3

The interested firms are required to submit the following information / documents (in duplicate with chain mark in the booklet) to the Executive Engineer 5th Provincial Buildings Division, Lahore to reach him by 11/08/2014 during office hours.

1. Name / full address & partnership deed of the contractor / firm with power of Attorney in favour of person authorized.
2. Year of establishment supported by certificate from the registrar of the firms.
3. Name & particulars of special firms to be associated.
4. List of cases pending in Arbitration / litigation if any.
5. Certificate of Registration from Pakistan Engineering Council Islamabad in the relevant category (only attested by 1st class officer).
6. Copy of endorsement / approval for the year 2014-15 with C&W Department.
7. List of complete personnel Business Management, Finance Management and Engineering / Technical Staff with their complete Bio-data and photo of stay with the firm.
8. List of equipment with its No. make / model condition and location alongwith the proof of ownership.
9. Detail of similar projects completed by the contractor / giving location, approximate cost and time taken for completion duly supported with a certificate from the client department.
10. List of similar projects handled during the last three years giving their location, approximate cost, time allowed / taken duly supported with a certificate from client department.
11. Performance certificates from the Executive Engineer / Client under whom the works have been executed during last three years.
12. Detail of works in hand indicating name of Client Department, consultants, scope of works, Authentic proof of their financial position such as Bank statement of the previous one year.
13. Authentic proof of their financial position such as Bank statement of the previous one year.
14. Total assets work capital and liabilities duly certified.
15. Income Tax Registration Certificate.
16. Any further particulars, the firms wish to furnish.

The pre-qualification application shall be evaluated on the basis of PPRA / Planning & Development Department criteria for pre-qualification. The other related information required in this regard should also be provided.

Any further information / queries in this connection may be had from the Executive Engineer 5th Provincial Building Division, Lahore on any working day. Only pre-qualified firms will be invited to participate in tendering. The competent authority reserves the right to accept / reject the prequalification as per PPRA Rules.

Executive Engineer,
 5th Provincial Building Division
 LAHORE

IPL-9522

اردو ڈائجسٹ 64 (1) اگست 2014ء

**PUNJAB HIGHWAY DEPARTMENT
PRE-QUALIFICATION NOTICE**

Applications for Pre-qualification of contractor for the work mentioned below are invited from the Contractors / Firms of repute having sufficient relevant experience of such work and duly enlisted / renewed for the year 2014-2015 with C&W Department Punjab for road works.

S. No.	Name of Schemes	Cost in Million
1.	ADP No. 1513 Dualization of Samanandi Hapurin Tola Vek Singh road from (45.00 KM to 94.00 KM) Length 49.00 KM.	
i)	Group No. I KM No. 45.00 to 51.75 KMS Length = 6.75 KM. District Faisalabad.	Rs. 392.00 Million
ii)	Group-II KM No. 51.75 to 58.50 Length = 6.75 KM. District Faisalabad.	Rs. 395.00 Million.
iii)	Group-III KM No. 58.50 to 65.25 Length = 6.75 KM. District Faisalabad	Rs. 393.00 Million.
iv)	Group-IV KM No. 65.25 to 72.00 Length = 6.75 KM District Faisalabad	Rs. 394.00 Million.
v)	Group - V KM No. 72.00 to 78.79 Length = 6.79 KM District Faisalabad	Rs. 392.00 Million.
vi)	Group - VI KM No. 78.79 to 85.79 Length = 7.00 KM District T.T. Singh	Rs. 380.00 Million.
vii)	Group - VII KM No. 85.79 to 89.00 Length = 3.21 KM District T.T. Singh	Rs. 393.00 Million.
viii)	Group-VIII KM No. 89.00 to 94.00 Length = 5.00 KM. District T.T. Singh	Rs. 380.00 Million.
2	ADP No. 1504 Widening / Improvement of Faisalabad Samanandi road Sakani Jhall Chak No. 522/GB to Chak No. 271/HL. District Faisalabad Length = 9.40 KM.	Rs. 121.769 Million.
3	ADP No. 1505 Widening / Improvement of road from Chak No. 259/HD Ghoseair to Chak No. 272/KB Patti Kani Length = 13.00 KM District Faisalabad	Rs. 162.135 Million.
4.	ADP No 1506 Widening / Improvement Salina road to 258/KB Dijkat more, Length = 20.20 KM, District Faisalabad.	Rs. 248.351 Million.
5.	ADP No 2534 (Allocation for priority projects) Widening / Improvement of road from Chak No. 377/GB to 378/GB, Length = 20.00 KM, District Faisalabad.	Rs. 263.215 Million.
6.	Widening / Improvement of road from Pindri Khaliara to chak to Rajana to Khan de Kori in Gujranwala length = 45.00 KM ADP No. 1508	
i)	Group - I KM No. 1 to 22.50 length = 22.50 KM	Rs. 273.600 Million
ii)	Group - II KM No. 22.50 to 45 length = 22.50 KM	Rs. 273.600 Million.
7	Improvement of road from Pir-Mahal Dankhara road to Shekari Canal Tola road via Chak No. 321/GB, 323/GB, 324/GB, 325/GB, 326/GB District T.T. Singh length = 39.70 KM ADP No. 1510	Rs. 310.00 Million.
8	Dualization of intercity in Pir-Mahal City length = 2.87 KM ADP No. 1511	Rs. 220.00 Million.
9	Construction of road Chak No. 312/GB, 313/GB & 314/GB Tehsil Gojra to Tolia road length = 6.75 KM ADP No. 1512	Rs. 62.310 Million.
10	Repair / rehabilitation of Chiniot - Jhanera road Chiniot (remaining length) length = 5.95 KM ADP No. 1654	Rs. 62.107 Million.

اردو ڈائجسٹ 84 (1) اگست 2014

The following documents should be submitted with the applications.

1. Name of firm alongwith Postal Address and telephone number.
2. Partnership deed of the firm.
3. Power of attorney in favour of the firm who will deal regarding the year wise master of the work.
4. (i). Name of Technical Supervisory Staff alongwith their qualification / experience and proof for their stay with the firm.
(ii). Permanent Staff, Business Management Staff, Finance Management Staff.
5. Details of Machinery such as Shastoring P.O.R Tandem Roller, Vibratory road Roller, water lorries, Tar Uniler, Grader and carpeting plant complete in all respect giving their model, make, condition and location. They should also give proof of possession of such machinery.
(i) Year of establish of firm.
(ii) No. of Project of similar nature (cost of project equal or more than the cost of project).
(iii) Financial outlay amount of similar / specialized.
7. Registration / Clearance from Income Tax Department.
8. Detail of Court cases if any / arbitration cases etc.
9. Enlistment / Renewal of C&W Department for the year 2014-2015.
10. License from Pakistan Engineering Council, Islamabad for the year 2014.
11. Details of financial soundness.
12. Owner Ship documents of asphalt plant alongwith allied machinery should also be provided, without which the Firm shall not be considered for pre-qualification.
13. The contractors / firms who have sufficient experience in the similar works alongwith Bridge construction shall only be eligible in this case.
14. The Firms capable to complete the work within six month should only apply for pre-qualification.
15. The application should reach in the office of the undersigned upto ~~31-8-2014~~ 31-8-2014 within office hours. Incomplete application will not be considered / entertained.
16. The Chief Engineer, (South Zone) Punjab Highway Department, Lahore (Competent Authority) reserves the rights to reject any application under PPR rules.

IPL-9520

Superintending Engineer,
Provincial Highway Circle,
Islamabad.

اردو ناگشت 64 (ر) اگست 2014ء

کتاب سے بہتر دوست کہاں !!! جُمہ پوری سے بہتر کتابیں کہاں !!!

”ترکی ہی ترکی“

تاریخ، تہذیب، ثقافت، سیاحت اور سیاست

ترکی پر ایک منفرد اور شاندار کتاب مصنف: فرخ جمیل گولہمدی

قیمت 400 روپے

1004	ریحانہ مونس	سندھ کی اور قیام پاکستان	234K	پاکستان	انٹرنیٹ - نئی نوا اور مسیور کا قلم
2511	مفتی اعظم	شیخ سلطان، مزارعت اور جدیدیت کی پاکستان	5811	پاکستان	پاکستان انٹرنیٹ طاقت کیسے بنا؟
1541	سیدہ حسن	مظہر (پیشہ ورانہ شہر)	111	پاکستان	اسلام کا معاشی نظام اور تحریک پاکستان
2000	غفری محمد	قانون دان اقبال	1001	پاکستان	عظیم مقدس جنگیں (Jeholy Wars)
5011	فیروز خان	حیات کا بکند	5011	پاکستان	پاکستان آزادی سے سوبائی ہے اعتبار کی تک
5111	پرویز احمد	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	5011	پاکستان	پاکستان سے بکند دیش - ان کی جدوجہد
5111	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	2001	پاکستان	پاکستان کا مستقبل
5200	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	1700	پاکستان	ورلڈ آرڈر کی حقیقت
5301	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	4500	پاکستان	سرکش ریاستیں
7810	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	4500	پاکستان	ریاستی دہشت گردی
6500	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	2500	پاکستان	اسرائیل میں یہودی قتل عام
3441	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	1700	پاکستان	عالمی بینکاروں کی دہشت گردی اور کرائے کے آقا
4100	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	125	پاکستان	اسلام کا معاشی نظام اور تحریک پاکستان
3100	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	2000	پاکستان	اسلام اور تاریخ و تعمیر
1500	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	4500	پاکستان	عالمی کاروباری دنیا - جاپانی خواہش طلباء کا نواز
1200	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	5300	پاکستان	مسلمانان عالمیہ - تاریخ و مستقبل
4301	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	7000	پاکستان	عالمی حکومتیں - تاریخ و مستقبل
4501	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	5000	پاکستان	عالمی حکومتیں - تاریخ و مستقبل
1501	پاکستان کے قانون	پاکستان کے دوران آزادی پاکستان کے قانون	2500	پاکستان	عالمی حکومتیں - تاریخ و مستقبل

Free Delivery ایک فون کال بریکسر پیشہ کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز 2 ایوان تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

اردو آن لائن مجلہ 64 (قسط 64) اگست 2014ء



پاکستانیات

جذبہ حب الوطنی سے مہکتی تحریر

وطن کی مٹی

اسے رشتہ

یوں

تو انسان زندگی بھر زمین کے سینے پر سڑ کرتا اور پھر اسی کی گود میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔ لیکن انسان کا زمین سے ایک اور رشتہ بھی ہے جو ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس رشتے کا احساس پہلی بار مجھے ایک غیر ملکی سفر کے دوران ہوا۔

اس سفر کے دوران انگلستان کے علاوہ چند ایک اور ممالک میں بھی جانے کا اتفاق ہوا جہاں کئی ہم وطنوں سے ملاقاتیں رہیں۔ لطف کی بات یہ اپنے ملک ہمیں اس امر کا اتنا احساس نہیں ہوتا کہ ہمارا ایک شدید جذباتی اور ابدی رشتہ اپنے ملک کی زمین سے بھی ہے۔ یہ ایسا لطیف جذباتی رشتہ ہے کہ غیر ممالک میں کئی وہائیاں گزرنے کے باوجود اپنے ملک سے ذرا بھر کمزور نہیں ہوتا۔ ہم چونکہ پاکستان سے عموماً باہر نہیں جاتے، اسی لیے شاید ہمیں اس تعلق کی گہرائی کا پوری طرح ادراک اور اندازہ نہیں ہوتا۔

مر زمین وطن سے رشتے کا انداز مجھے اس وقت ہوا جب قیام لندن کے دوران میرے پاکستانی میزبان نے ایک روز مجھ سے کہا ”آج میں آپ کو ایک پرانے دوست سے ملانے لے جا رہا ہوں۔“ ان صاحب کو میں نے گزشتہ بیس برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس حوالے سے خوش ہوا کہ ایک ہدم ایریئہ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹے کا سفر کے

ایک پاکستانی سات سمندر پار چلا جائے، مگر اپنے دیس سے اس کا تعلق کبھی کمزور نہیں پڑنے پاتا

ڈاکٹر صفدر محمود



عرصہ گزرا ہے۔ یہ مہینے پانچ ماہ رہ کر آئی ہے اور وہاں بالکل تندرست اور نارمل رہی ہے۔“

ہوم دیرینہ کی بات سن کر جہاں میری تشویش کم ہوئی، وہاں مجھے یہ احساس بھی شدت سے ہوا کہ انسان کا اپنے ملک، شہر، گھر، محلے اور گلیوں سے بھی عجیب سا جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔ وہ کبھی کمزور نہیں پڑتا اور جسمانی دوری کے باوجود قائم و دائم رہتا ہے۔ جیس، فریکلفٹ اور لندن جیسے خوبصورت شہروں میں رہنے کے باوجود اور یورپ میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد بھی پاکستانی اپنے ملک اور شہر کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ بعض حضرات تو سرور آئیں بھر کر پنجاب کے ماہیے گانے گیتے ہیں۔ ان خوبصورت، صاف ستھرے شہروں کا جادو ان حضرات کے ذہنوں سے اپنے ملک اور محلے کی یادیں مٹا نہیں سکا۔

وہ ملک جہاں پھروں، کھیلوں کی بہتات ہے اور وہ شہر جن کی گلیاں بدبو سے متعفن رہتی ہیں۔ ان تمام حضرات کی حالت اس خاتون کی سی تھی جس کا ذکر میں ایک دوست کے حوالے سے کر چکا۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ کمزور عورت وطن، شہر اور میکے کی محبت میں حواس کھو بیٹھتی تھی اور بلند آواز سے بین کرنے شروع کر دیتی۔ جب کہ یہ حضرات مضبوط اعصاب رکھتے تھے، اس لیے باطنی درد کو ظاہر نہ ہونے دیتے۔ البتہ میں نے جب بھی ان کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو ان کے باطن میں ادا کی کے مسند کاظم خیر پائے۔

بزرگ کہتے ہیں کہ وطن نصف ایمان ہوتا ہے، اس لیے کہ پورا ایمان تو بہر حال مذہب سے وابستہ ہے۔ مسلمان ملت کے تصور پر یقین رکھتا ہے اور وطن کو بہت

بعد جب ہم اس دوست کے گھر پہنچے، گھنٹی بجائی تو دروازہ ایک نوجوان نے کھولا۔ وہ ہمارے دوست کا بیٹا تھا۔ ابھی ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ اندرون خانہ سے ایک عورت کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں سنائی دیں جنہوں نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں عجیب محسوس میں مبتلا تھا کہ یا الٹی یہ کیا ماجرا ہے؟ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس گھر میں ابھی کسی عزیز کی وفات کی خبر موصول ہوئی ہے یا پھر اس بے چاری عورت کو بری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں الجھا ہوا تھا کہ ہمارا پرانا دوست مسکراتے ہوئے کھلے چہرے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ گلے ملنے کے بعد سب سے پہلے اس نے ہم سے معذرت چاہی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”بھائی معاف کیجیے گا، آپ کو اندر سے میری بیوی کی رونے اور آہ وزاری کی آوازیں سنائی دے رہی ہوں گی۔“

میں نے فوراً پوچھا ”خیر تو ہے نا؟ کہیں بھالی بھاری تو نہیں؟“

دوست نے بہت اداس اور پریشان لہجے میں جواب دیا ”بھار تو نہیں البتہ انھیں کبھی کبھی دورے پڑتے ہیں جن کے دوران یہ حالت ہو جاتی ہے۔ کئی ڈاکٹروں سے مل کر ان کا معائنہ کرا چکا۔ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ یہ دورے وطن سے دوری اور ادا کی کی وجہ سے پڑتے ہیں۔ علاج یہ ہے کہ انھیں واپس بھجوا دیا جائے۔ میں یہاں مزدوری کرتا ہوں اور دو سال سے پہلے انھیں واپس بھجوانا ”فورڈ“ نہیں کر سکتا۔ میری بیوی کو ابھی پاکستان سے آئے بمشکل ایک سال کا

بنا کر نہیں پوجتا۔ دنیائے اسلام کے کسی حصے میں بھی آنت آئے، ہر مسلمان کا جسم درد سے دیکھنے لگتا ہے۔ شاید اسی جذبے سے مغرب خوفزدہ ہے اور اسے دنیائے اسلام میں مذہب کی اٹھتی مہر سے خوف آتا ہے۔ ہمارے اکثر دانشور اس حقیقت کو مذاق کا نشانہ بناتے اور مولوی کا خواب سمجھتے ہیں۔ لیکن مجھ پر یہ حقیقت اس وقت منکشف ہوئی جب میں نے ایک ممتاز امریکی دانشور کی تحریریں پڑھیں۔

بہر حال اس موضوع پر پھر بھی بات ہوگی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ملت کے ساتھ ساتھ اور دنیائے اسلام سے براہ کر ہمارا رشتہ اپنی زمین سے کہیں زیادہ مضبوط، نازک، قلبی اور جذباتی ہے جس کا بہتر اندازہ ملک سے باہر جا کر ہوتا ہے۔ ایک پاکستانی واقف کار کی کار میں بیٹھا تو اس نے کار چلائے ہی پنجابی گانوں کی کیسٹ لگالی۔ جب اس کی کار لندن کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی تو مجھے یہ عجیب احساس ہوا کہ کار کے اندر پاکستان ہے اور باہر انگلستان! کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے دوست جنے سرد آہ بھری اور کہا ”مجھے لندن آئے نہیں برس بیت چکے۔ لیکن میں اب بھی رات کو اپنے شہر اور آبائی گھر کے خواب دیکھتا اور سونے سے پہلے پاکستانی گانے سنتا ہوں۔“

شام چائے پر چند پاکستانی دوست اکٹھے ہوئے تو

ایک صاحب نے دلچسپ بات کی۔ وطن کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے ”ہم اپنی مٹی سے اور جا کر عالم برزخ میں رہتے ہیں۔ تب وطن کی یاد ستاتی ہے اور مٹی کی محبت بے چین رکھتی ہے۔ لیکن جب وطن واپس لوٹیں تو وہاں بھی جی نہیں لگتا۔ وہاں کے مصائب سے گھبرا کر پھر دیار غیر کا رخ کرتے ہیں۔ اپنا یا مگر وہاں بھی پوری زندگی گزارنے کے باوجود ہمیں نہ جاتا ہے اور نہ ہی ہم کو اول درجے کے شہری کا مقام حاصل ہوتا ہے۔“

انسان کا مٹی سے عجیب رشتہ ہے۔ وہ ہواؤں میں پرواز، خلاؤں میں میر یا سمندروں کو فتح کرے یا ستاروں پر مکندیں ڈالے لیکن اسے صحیح چھین اور سکون اسی وقت ملتا ہے جب اپنی زمین پر قدم رکھے۔ انسان زمین کے سینے پر محلات تعمیر کرتا، اس پر جنگیں لڑتا اور خون کی ندیاں بہاتا ہے۔ پھر مٹی کا بنا ہوا انسان دھرتی کی گود میں ابدی نیند سو کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ لیکن مرتے وقت بھی اس کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ابدی نیند سونے کے لیے وطن کی مٹی نصیب ہو بلاشبہ انسان کا اپنے وطن کی خاک سے عجیب رشتہ ہے جس پر غور کیا جائے تو سوچ کے دروازے کھلتے اور نئے نئے حقائق منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پنڈتوں کی حکومت

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے قائد اعظم نے جو پریس کانفرنس بلائی اس میں ہندو صحافی مخالفانہ انداز سے سوال و جواب کر رہے تھے۔ ایک نے پوچھا: ”پاکستان کیا مذہبی ریاست ہوگی؟“ قائد اعظم نے جوابی سوال کیا: ”مذہبی ریاست کا کیا مطلب؟“ پھر سوچے سوال نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر ایک تیز صحافی نے اپنے خیال میں تیر مارا ”اس کا مطلب ہے ملاؤں کی حکومت۔“ قائد اعظم نے برجستہ جواب دیا ”پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ (اشارہ پنڈت نہرو کی طرف تھا) اور کراچیوں سے گونج اٹھا۔ (حیات قائد اعظم سے اقتباس)

قربانی

دفاع وطن

دشمن کا کیا جواب دے۔

”ٹھٹھٹھ ٹھٹھٹھ۔“

اب تو خاصے ہمارے انداز میں دروازہ بھجایا گیا۔
مار پیٹے جلدی سے ”جی“ کہا اور فوراً دروازہ کھل گیا۔
نئے ٹوپے دلجا میاں بھی دلہن کے مانند خاصے
بوکھلائے ہوئے تھے۔ کمر اکوایر جنسی میں صاف کرنی
نویل دلہن کے شایان شان بنایا گیا تھا۔ سفائی کی
دستہان کے نیچے سے ہمارے گھٹے پھڑکے اور
اقرائش کی لہائی اٹکار میں سے اودھ کھل پٹ بیان کر
رہے تھے۔ وہاں تکیروں کے گولے اور کتابوں کے
دبیر بھونسنے کی ماکام بوششیں انجام پائی تھیں۔

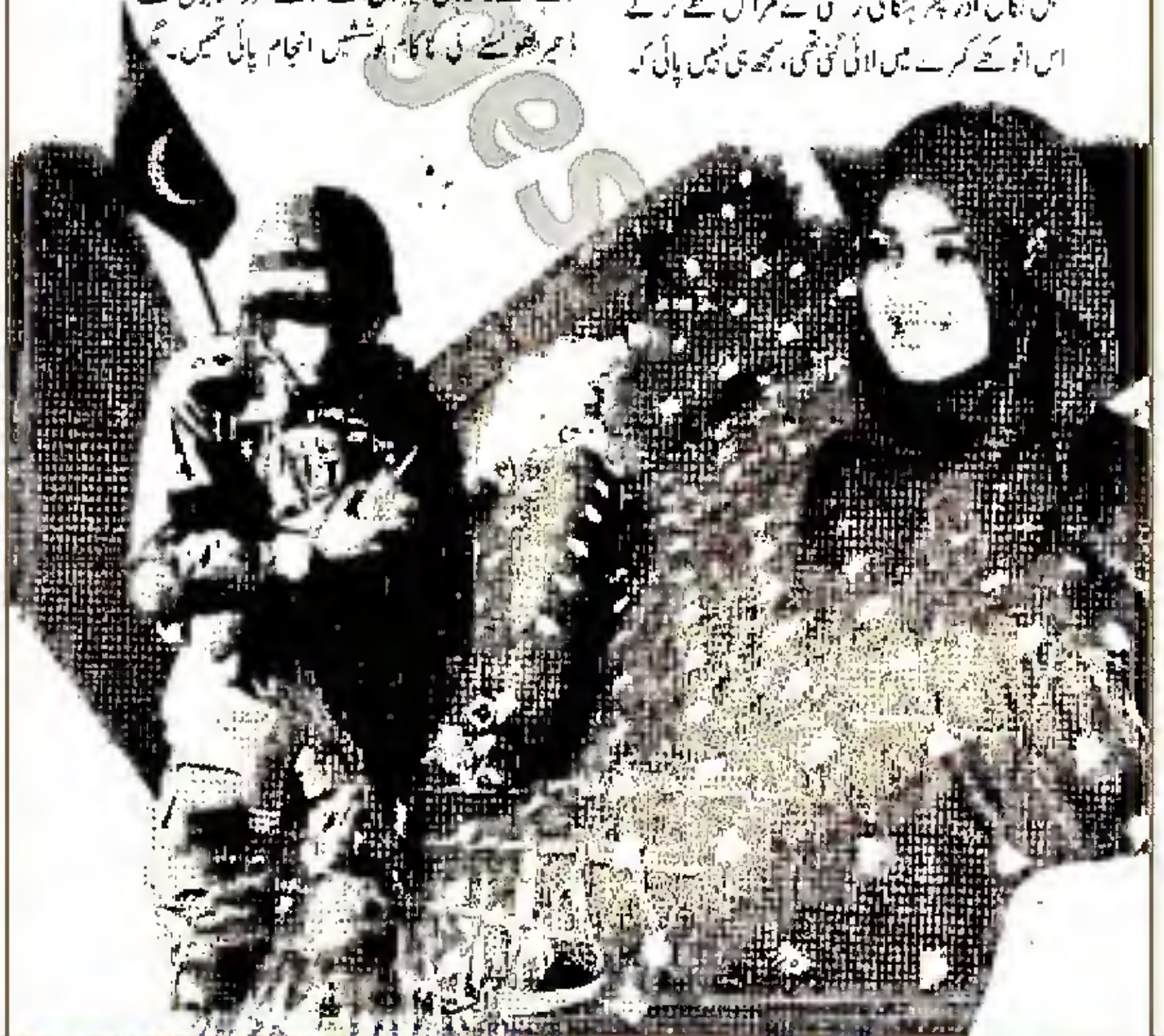
جان بٹھلی پر رکھ کے باطل قوتوں سے تہرہ آزما
ہوئے والے فوجی افسر کا قصہ دل افروز

سادہ محبوب

ٹھٹھٹھٹھ۔“

دروازہ آہستہ سے بھجایا گیا۔ ماریہ
سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ جو چند ٹھٹھٹھوں
قبل لکات اور پھر ہنگامی رقص کے مراحل طے کر کے
اس انوکھے کمرے میں الٹی گئی تھی، سمجھ ہی نہیں پائی کہ

دو ٹھٹھٹھ



موصوف کیپٹن عبدالواسع بذات خود سب سے زیادہ بدحواس دکھائی دیے۔

”اچھی خاتون ہیں آپ! ایک تو آتے ہی کمرے پر قبضہ کر لیا۔ اوپر سے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں دے رہیں..... وہ بھنا کر بولے اور ساتھ ہی فلپس سے یا عادتاً الماری کا پٹ کھول بیٹھے۔ جانے کون سا سامان ان کے اوپر آن گرا اور کمرے کی ہنگامی صفائی کا پول بھی کھل گیا۔ ماریہ اور عبدالواسع کمرے کی حالت دیکھ کر جو ہنسا شروع ہوئے، تو ہنستے ہی چلے گئے۔ گزشتہ چار گھنٹوں کی ساری لینیشن اس ایک قہقہے نے ختم کر دی۔

ماریہ اور عبدالواسع کا رشتہ کافی عرصے سے طے تھا۔ اب فوج میں کیپٹن کے عہدے پر تعینات عبدالواسع ایک ہفتے کی چھٹی پر گھر آئے تو صرف نکاح کے ارادے سے تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ رخصتی ماریہ کے تین ماہ بعد ختم ہونے والی ہاؤس جاب کے بعد رکھی گئی تھی۔ نکاح کی تقریب خاصی دھوم دھام سے انجام پائی۔ مگر نکاح کے بعد جانے کیسے اور کس کی شرارت سے دلہا کے ابا بغیر بہرہ کے گھر واپسی سے انکاری ہو گئے۔

ریٹائرڈ بریگیڈر صاحب کے اصرار کو نظر انداز کرنا کسی طور ممکن نہ تھا۔ سو واپسی پر دلہن سر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دلہا کے گھر آئیں۔ سب ہی سسرالی اس ہنگامی رخصتی سے خوش تھے، مگر کیپٹن صاحب کے لیے یہ قطعی غیر متوقع تھی۔ نکاح کی تیاریوں اور ہارات کی روانگی کی جلدی میں ان کا کمر میدان جنگ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

یہ کمر ان کا تھا بھی نہیں، دو عدد چھوٹے بھائی

ساتھ رہتے تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں نے کمال پھرتی سے کمر اسمینا تھا، جس میں زیادہ زور اپنا بستر اور چیزیں وہاں سے اٹھانے میں لگا دی۔ وہ تو بھلا ہوا ہی جان کا جنھوں نے عبدالواسع سے گدا اور ٹکیہ چھین کر کمرے میں بستر بچھا دیا۔ اب کیپٹن صاحب اس حادثاتی رخصتی کے بعد کمرے میں داخلے کی اجازت مانگ رہے تھے اور ماریہ دلہن بنی ہنوز صدمے کی ہی کیفیت میں تھی۔ ابا نے کچھ اس پھرتی سے اسے دلہا کے ہمراہ روانہ کیا تھا کہ ابا اور بہنوں سے بھی چلتے چلتے ہی ملاقات ہو سکی۔

”ماریہ دراصل میں اس اچانک رخصتی کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی لیے تمھارے لیے کوئی تحفہ نہیں خرید سکا۔ بہر حال تحفہ مجھ پر ادھار رہا، جلد ہی تمھیں مل جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے واسع ماریہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور بات جاری رکھی:

”اچھی زندگی گزارنے کے لیے میاں بیوی میں ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ میں تمھیں اپنی زندگی اور اس کی ترجیحات کے متعلق بتانا چاہتا ہوں۔ تم یقیناً فوج کی نوکری اور اس کے ”اسٹینڈس“ سے متاثر ہو گی۔ لیکن یہ نوکری تو ایک مشن اور فرض ہے..... اپنے ملک کی مرحدوں، نظریات اور قوم کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی خطرے میں ڈال دینا! اس سلسلے میں ہمیں بیوی سمیت پورے اہل خانہ کی مکمل حمایت درکار ہوتی ہے۔

”ہم دونوں اب اس مقدس رشتے میں بندھے ہیں، مگر میں تو آزاد پہلے بھی نہیں تھا۔ میں اپنی فوج کے ڈسپلن کا پابند ہوں..... اپنے سینئرز کے حکم کا پابند! اس ملک کے عوام کے تحفظ کو یقینی بنانے کا پابند..... ماریہ!

یہ ملازمت قربانی مانگتی ہے..... وقت، توانائیوں، جذبوں اور محبتوں کی قربانی۔ سب سے بڑھ کر جان کی قربانی اور ہماری زندگی میں شہادت بہت اہم مقام رکھتی ہے۔

”کل جب مجھے محاذ پر لڑنے جانا پڑا تو تم حوصلے و امت سے مجاہدہ کی طرح خوش دلی سے مجھے روانہ کرنا۔ خیال رکھنا تمھاری اداسی یا آنسو میرے قدموں میں زنجیریں نہ ڈال دیں۔“

مار یہ غور سے شوہر کی باتیں سن رہی تھی۔ محاذ اور قربانی، دونوں ہی اس کے لیے نئے لفظ تھے۔

”جانتی ہو میں نے اپنے لیے تمھارا یعنی ایک ڈاکٹر کا انتخاب کیوں کیا؟ مجھے مجاہدین کی مرہم پٹی کرنی صحابیات کی زندگی بہت پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی بھی مسیحا بنے۔ جب میں زخمی ہو کر آؤں تو تم میرا علاج کر کے جہاد اور جنگ میں بھی میری ہم قدم بن جاؤ۔“ عبدالواسع دھیسے لہجے میں بول رہے تھے۔

”فوجی کی زندگی عام لوگوں کی زندگیوں سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہ ہنستی مسکراتی ہے، مگر اپنے مقصد کے لیے گہری نگیں بھی رکھتی ہے۔ اگر شہادت کے حصول کی خواہش ہمارے دلوں میں نہ ہو تو ہم میدان جنگ میں لڑ ہی نہ سکیں۔ ہر فوجی غازی ہوتا ہے یا شہید! ان دو کے علاوہ کسی دوسرے نتیجے کی ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں۔ کیا اس راستے میں تم میرا ساتھ دو گی؟“ عبدالواسع خاصی سنجیدگی سے بولے۔

”ہم..... الماری کے بالائی خانے سے اچانک کوئی بھاری بھر کم چیز نیچے گری۔ دونوں جیسے خواب سے چونک اٹھے۔ یہ عبدالرافع کا کالج بیگ تھا جسے بڑی محنت سے الماری میں ٹھونسا گیا تھا۔

”شکر ہے یہ بیگ مل گیا، ورنہ صبح صبح وہ کمرے کا دروازہ ہی توڑ دیتا۔ میں یہ بیگ اور جوتے باہر رکھ کر آتا ہوں۔“ دولہا میاں چیزیں باہر رکھنے مگنے اور مار یہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی کہ کیا کسی اور کی شادی میں ایسے اتفاقات ہوئے ہوں گے؟ کمرے کی دیواروں پر دنیا کے نقشے گئے تھے اور نکلنے کی میز پر گلوب رکھا تھا۔ کیسا تضاد تھا! سامنے اس قدر پُرکشش اور حسین دنیا ہوتے ہوئے بھی عبدالواسع کی نگاہ شہادت اور ابدی زندگی پر جمی ہوئی تھی۔

شادی کے اگلے روز سادہ سا دلیمہ رکھا گیا۔ پھر مہمانوں کے ہمراہ دولہا میاں بھی روانہ ہو گئے۔ بنا کسی حسین وعدے کی ڈور تھمائے! مار یہ کا ہاؤس جاب جاری رہا۔ اس کی لاپرواہی امراض قلب کے دارو میں تھی۔ اب ہسپتال آنے جانے کا سفر بڑھ گیا۔ اس کا صلی کے علاوہ اور بھی بہت سی تہذیبیاں آئیں۔ چند ہی دن میں سسرال میں اس کا کمر سیٹ ہو گیا۔ سب اہل خانہ سے دوستی بھی ہو گئی۔

کیپٹن صاحب کی کپٹی دو ماہ کے لیے وزیرستان جاری تھی۔ مار یہ کو تہذیبی تو اب محسوس ہوئی۔ اس کی نمازیں طویل ہونے لگیں۔ دعائیں طویل تر اور رقت آمیز! وہ اپنی ساس کے حوصلے کی وار دیتی جو برسوں سے شوہر اور بیٹوں کو سرحدوں کی حفاظت کے لیے بھیج رہی تھیں۔ ان کی عبادتوں میں خضوع و خشوع کا راز اب مار یہ کو سمجھ میں آیا۔

یہ اللہ کے نام پر قائم رشتے کی محبت تھی جو وہ خود پور پور دعا بن گئی۔ جب کبھی عبدالواسع یاد کرتی تو اس کا بھرپور تہنہ مار یہ کے کانوں میں گونجنے لگتا۔ وہ چونک جاتی، ادھر دیکھتی جیسے وہ یہیں کہیں تھا..... اس کا

ساتھی، ہوم اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے خیمیں قربان کرتا ہوا!

مار یہ آئی سی یو وارڈ میں طویل دیوٹی کے دوران جب کبھی موت کی چاب سختی اور گھبراہٹ تو واسع کے حصول زندگی اسے حوصلہ دیتے۔ وہ بھی تو مجاہدہ اور حالت جنگ میں تھی، اپنے شوہر کو سرحدوں کی حفاظت کے لیے روانہ کر کے جہاد میں عملاً شامل!

”ہماری فوج باطل قوتوں کے ساتھ ہے، اسی لیے اس کے مرنے والے شہید نہیں مقتول ہیں۔“ مار یہ کو اکثر ٹی وی اور اخبارات پر یہ بحث ہوتی نظر آتی۔ اس کا یہ ذہن فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ عبدالواسع غازی اور مجاہد تھے یا شدت پسند اور طاغوتی طاقتوں کا آلہ کار؟ پاک فوج کا وہ کپٹن جس نے اپنا آج ملک کے کل پر قربان کر رکھا تھا، وہ حق پر تھا یا باطل پر؟

ایک رات ڈاکٹر مار یہ گہری سوچ کے قریب المرگ مریض کے سر ہانے لگے مانیٹر کی سرخ اور ہیز تپوں پر نظریں ٹکائے کھڑی شکوہ کناں تھی۔ بھلا مائیں شہادت کی خواہش کے بنا بیٹے کیسے ملک پر پھانسی لگا سکتی ہیں؟ اس جیسی کئی سہائیں تھیں جنہوں نے اپنے سہاگ رب کے راستے میں بھیج رکھے تھے۔ کتنے ہمدان

تھے وہ لوگ جو راتوں میں گرم بستروں پر چین کی نیند کے مزے لوٹتے ہوئے ان غازیوں اور شہیدوں کے مرتے سے انکاری تھے۔ شاید امت مسلمہ زندگی اور موت، حق اور باطل کا فرق پہچاننے سے قاصر تھی۔

مار یہ کے بیل فون پر اسی وقت گھنٹی بجی۔ آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے فون کی طرف دیکھا۔ ”میرے ہمسفر“ کا نام تصویر کے ساتھ چمک رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے فون کان سے لگا لیا۔

کپٹن صاحب نماز سے واپس آ رہے تھے۔ موصوف پھونے نماز کی طرف آنے سے قبل اپنے اصول اور ضابطے دہرانے لگے۔ مگر آج مار یہ کو پور ہونے کے بجائے یہ بہت اچھا لگا۔ بھلا ان کے غازی ہونے میں کیا شک تھا؟ اس کے دل کی گواہی کافی تھی۔ وہ کتنی ہی ماہر ڈاکٹر بن جاتی مگر جانتی تھی کہ دل کی گواہیاں غلط نہیں ہوتیں۔ ان میں کوئی ابہام نہیں ہوتا۔ انھیں کوئی متزلزل نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ شوہر، بیٹے اور بھائی یقیناً دکانوں پر بھی مل جایا کرتے جو اس ملک کی حفاظت کے لیے قربان ہونے پر تیار ہیں۔ قربانی شہادت کی تمنا کے بغیر بھلا کیسے ممکن ہو سکتی ہے!.....

اقوال علامہ اقبالؒ

- ☆ زندگی موت کا آغاز ہے اور موت زندگی کی شروعات.....
- ☆ استاد ایک سورج کی طرح ہے کہ اس کا فیض ہر شے پہ ایک جیسا ہوتا ہے۔
- ☆ انسان اپنے باطن میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پاسکتا ہے۔
- ☆ سخت سے سخت دل کوماں کی پریم آنکھوں سے سوہم کیا جاسکتا ہے۔
- ☆ مردہ جانوروں کے سر یا دھڑمکھڑ کر کے ان کی لمٹائش کرتا زندگی کی توہین کرتا ہے۔

(مراسلہ: مبشر حیات، ایمان، وادی سون)



جنگ آزادی

عوام میں ہر دل عزیز حاکم بنگال

کھائیو کو یقین ہو گیا کہ میر جعفر اس کا
راہرٹ مددگار بن چکا۔ اسی کی وساطت سے
راجا وہ لہجہ دوم حسین سیٹھ اور لطف
یار خان بھی طرفدار ہو گئے۔ چنانچہ وہ فوج لے کر ۱۳
جون ۱۷۵۷ء کو مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔

۱۶ تاریخ کو وہ کنوا تھے پہنچا جہاں نواب سراج
الدولہ کی طرف سے ایک حاکم متعین تھا۔ کھائیو نے
۱۷ تاریخ کو ایک جہاز سپاہ بھر آبر کوٹ کی سرکردگی
میں کنوا پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ حاکم کنوا کے پاس
صرف اڑھائی سو سپاہی تھے وہ مقابلہ کرنے کو تیار ہو
گیا۔ تھے پر گولہ باری شروع ہوئی۔ حاکم کنوا نے
مقابلہ شروع کیا۔ لیکن اس کے پاس سامان حرب ختم
ہو گیا۔ چنانچہ وہ ضروری سامان لیے نکل کھڑا ہوا۔
بعد ازاں انگریز تھے کے اندر پہنچے تو اسے خالی دیکھ

نواب سراج الدولہ

کے آخری ایام

ان فیصلہ کن لمحات کی المناک داستان جب
غاصب انگریزوں نے اپنوں ہی کی نمک
حرامی اور مکر و فریب کے باعث ہندوستان
میں قدم جمالیے

عمر صادق قریشی



کے بہت بگڑے۔
۱۸ جون ۱۷۵۷ء کو طوفانِ بادِ باران کے ساتھ ہی برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ کلائیو وہیں مقیم رہا۔ دراصل وہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میر جعفر اپنے عہد پر قائم ہے یا نہیں، رک کر چل رہا تھا۔ ۱۹ جون ۱۷۵۷ء کو اس کے پاس میر جعفر کا خط پہنچا جس میں لکھا تھا کہ میں نواب کے ساتھ ضرور ہوں، لیکن اپنے اقرار پر قائم۔ مجھے امید ہے کہ جو معاملہ میرے اور تمہارے درمیان ہوا، تم بھی اس پر قائم رہو گے۔

۲۰ تاریخ کو آفتاب طلوع ہوتے ہی فوج دریا پار کرنے لگی۔ چار بجے شام تک ساری فوج بھیریت دریا کے پار پہنچ گئی۔ یہاں اُسے میر جعفر کا ایک اور خط ملا جس میں لکھا تھا کہ نواب سراج الدولہ پلائی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کلائیو نے بھی اپنا رخ اسی طرف کر دیا۔ دوسرے دن صبح کوچ کر کے چھ میل دور موضع داد پور پہنچ گیا۔ ابھی تک کلائیو کو یہ خوف تھا کہ کہیں میر جعفر آخر دقت میں اپنی رائے بدل کے انگریزوں کی مدد کرنے سے انکار نہ کر دے۔ اس نے وہاں سے میر جعفر کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے: ”ہم موضع داد پور پہنچ چکے۔ اگر تم ہمارے ساتھ آن ملو تو اچھا ہے ورنہ ہم نواب صاحب سے صلح کر لیں گے۔“

جواب لکھنے کے دو ہی گھنٹے بعد اس نے فوج کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ جو فوجی لشکر چلا، موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ساری فوج پانی میں تر ہو گئی۔ بارشیں روزانہ ہو رہی تھیں اس لیے دریاؤں میں سیلاب آ رہے تھے۔ ندی نالے چڑھنے سے راستے دشوار گزار ہو گئے۔ کئی گھنٹے تک فوج کو گھٹنے گھٹنے پانی میں چلنا پڑا۔ آخر ۲۳ جون کو ایک بجے رات کے وقت پندرہ میل کا فاصلہ طے کر کے یہ لشکر پلاسی پہنچا اور آسمان کے ایک

کلائیو کو کچھ اطمینان ہوا لیکن پھر بھی شک باقی رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود وعدہ کا پکا نہیں تھا۔ بدعہد تھا اس لیے دوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھتا۔ اُسے خوف تھا کہ کہیں میر جعفر اُسے دغا نہ دے۔ اگر ایسا ہوا تو ایک انگریز بھی زندہ نہیں بچتا۔

۲۱ جون کو دوپہر کے وقت اس نے ایک کونسل منعقد کی جس میں چھوٹے بڑے افسر شریک ہوئے۔ کونسل کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ دریا عبور کر کے عظیم الشان نوابی لشکر سے مقابلہ کیا یا کنوا میں تھکے بند ہوا جائے؟ کلائیو نے رائے دی کہ دریا پار کر کے نواب سے لڑنا دانشمندی نہیں۔ یہ اس کلائیو کا ذکر ہے جس کی بہادری کا دستِ دراز انگریز پیٹے رہتے ہیں۔ اگر اس میں بہادری ہوتی تو وہ ایسا بزدلانہ مشورہ نہ دیتا۔ وہ مکرو فریب سے کام نہ لے جانتا تھا بہادری سے نہیں۔ نواب سراج الدولہ کے مقابلے میں اُس نے دھوکے اور فریب سے کام لیا بلکہ وہ آخر تک ڈرتا ہی رہا۔

کلائیو کی مخالفت کے باوجود زیادہ تر لوگ لڑائی کے حامی نکلے، مگر کلائیو نے ان کی رائے نہ مانی۔ کونسل پر خاست کردی اور وہاں سے اُنھ کو درختوں کے نیچے

بارغ میں خیمہ زن ہوا۔ انگریز یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نواب کی فوج وہاں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

دغا بازی کی داستان

یہ مقام جہاں غداروں نمک حرامی فریب اور دغا بازی کا مظاہرہ ہوا لڑائی میں انگریزوں کو ہزیمت ہونا پڑی تھی اور جہاں ہندوستانیوں کی خوش قسمتی کا آفتاب غروب ہوا ایک معمولی گاؤں تھا۔ مرشد آباد سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ایک جنگل کو پلاسی بارغ یا

پلاسی بن کہتے تھے۔ اسی بن کے قریب پلاسی نامی گاؤں واقع تھا۔ قریب ہی نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کی فوجیں مورچہ بند ہوئیں۔

انگریزوں نے آموں کے بارغ میں مورچہ بنایا جس میں درخت قطار در قطار لگے تھے۔ اس میں درختوں کی قطاریں سلسلہ وار لگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف کچی اور ادنیٰ سینڈھ تھی جو نصیل کا کام دیتی۔ مینڈھ

کے نیچے دریا بہ رہا تھا۔ دریا کے یمن کنارے پر سراج الدولہ کی شکار گاہ تھی جس کی چار دیواری پختہ تھی اور اس میں عمارتیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ کلائیو نے اپنی کچھ فوج توہان میں رکھی اور کچھ شکار گاہ میں۔

ایک میل دور نواب کے لشکر نے مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ جہاں نواب کا لشکر مقیم ہوا وہاں دریا گھوڑے کے سم کی طرح جھک گیا تھا۔ دریا کی لوکیں اس قدر کٹی ہوئی تھیں کہ زمین کی شکل جزیرہ نما جیسی ہو گئی۔ اس

اردو ڈائجسٹ

جزیرہ نما کا محیط قریباً تین میل کا تھا اور چوڑائی آدھ میل ہوگی۔ جزیرہ نما کے جنوبی گوشے سے دریا ملا ہوا تھا۔ اسی کے کنارے پر ایک ٹیلہ تھا جس پہ توپیں لگا دی گئیں۔ نیلے سے تین سو گز مشرق کی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس پر پلاسی بن واقع تھا۔

فریقین کی فوجی تعداد میں اختلاف ہے۔ نواب سراج الدولہ کے لشکر کی تعداد پچاس ہزار سے کچھ زیادہ تھی۔ اس میں ۴۵ ہزار سپاہ لطف یار خان راجا دولیہہ رام اور میر جعفر جیسے غداروں اور نمک حراموں کے ماتحت تھی۔ بارہ ہزار فوجی میرمن الدین (میردن) علی گوجر اور موبہن لال کے تحت تھے۔

کلائیو کے ساتھ تو سو پچاس یورپی پیادے دو سو محکومہ المسلمین پچاس گورنر اکیس سو ہندوستانی سپاہی اور بہت سے لشکری تھے۔ ان سب کی تعداد چار ہزار کے قریب تھی۔ اتنی تھوڑی تعداد سے ایسے

عظیم الشان لشکر کا مقابلہ کرنا قطعی ناممکن تھا۔ انگریز اتنی قلیل تعداد میں نواب کے عظیم لشکر سے لڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتے تھے۔ لیکن انہیں امید تھی کہ ان کی سازش کامیاب ہو کر رہے گی۔ جو غداروں اور نمک حرامی کا بیج انہوں نے بویا ہے وہ ضرور پھل لائے گا۔

لڑائی کا آغاز

۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو دونوں لشکر مقابل ہوئے۔ نواب کے لشکر میں چار سو بہادر فرانسیسی سردار سینٹ



رابرٹ کلائیو

میں دوسرے سپاہی کام آئے۔ اگرچہ وہ بارغ میں محفوظ تھے کیونکہ ان کی مینڈھ کچی فسیل کا کام دے رہی تھی پھر بھی جو گولہ بارغ میں گرنا وہ ایک دو انگریزوں کا کام ضرور تمام کر دیتا۔

کلائیو کے قاصد میر جعفر کے پاس آ جا رہے تھے۔ کلائیو چاہتا تھا کہ میر جعفر فوراً ۴۵ ہزار سپاہ لے کر اس کی طرف آ جائے اور نواب سے لڑے۔ مگر میر جعفر مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ میردن اور علی گوہر توپوں کے قریب کھڑے تھے۔ ایک شخص نے علی گوہر کے کان میں کوئی بات کہی۔ وہ وہاں سے ہٹا اور فوراً نواب کے حضور میں پہنچا۔ اس نے عرض کیا "اعلیٰ حضرت! مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ میر جعفر نے اپنی فوج کو انگریزوں کی طرف چلے جانے کا حکم دیا ہے۔"

نواب سراج الدولہ فکر مند ہو گئے۔ اس وقت انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ فریب کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے علی گوہر کو رخصت کر کے میر جعفر کو طلب کیا۔ وہ اس مکار بوڑھے کو اپنے خیمے میں لے گئے اور کہا "ماموں جان! یہ وقت میری نہیں ملک کی لحداد کا ہے۔ اس مسند کی مدد کا ہے جسے علی وردی خان نے قوت بازو کے زور سے حاصل کیا۔ اگر انگریزوں کی فتح ہوئی تو ہندوستان ان کے قبضے میں چلا جائے گا۔ اگر اس نے تم سے کوئی وعدہ کیا ہے تو پھر گز قائم نہ رہے گا۔ یہ پگڑی جس پر طرہ لگا ہوا ہے تم نے میرے سر پر رکھی تھی۔ اب اس کی لاج تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔"

نواب سراج الدولہ نے اپنی پگڑی میر جعفر کے پیروں میں رکھ دی۔ نمک حرام نے بڑے ادب سے جھک کر اسے اٹھایا اور نواب کے ہاتھ میں دے دوں ہاتھ اپنی چھاتی پر مار بڑے جوش سے کہا "میں

فریس کی قیادت میں شامل تھے۔ نواب کا لشکر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع ہوا۔ انگریز اس کو دیکھتے ہی سہم گئے۔ جس شان سے نوابی لشکر بڑھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کو مکمل ڈالے گا۔

سب سے آگے سینٹ فریس کا مختصر دستہ تھا۔ وہ اس تالاب کے پاس آ کر ٹھہرا جس میں کلائیو نے مورچہ بندی کی تھی۔ نواب کی فوج قوس کی صورت پھیل گئی جس کے ایک کنارے پر میردن علی گوہر اور موہن تھے اور باقی کناروں پر لطف یار خان راجا دولہہ رام اور میر جعفر کی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں۔

یوں انگریز تین اطراف سے گھر گئے۔ چوتھی طرف دریا تھا۔ انگریزوں کی جرات قابل تعریف ضرور ہے کہ انہوں نے میر جعفر نمک حرام کے وعدوں پر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا۔ اگر میر جعفر نواب کو دھوکا دینے کے بجائے اس کا وفادار رہتا تو انگریزوں کی خوش بختی کا آفتاب غروب ہو جاتا اور بقول نگار کے ایک انگریز بھی بچ کر وہیں نہ جاسکتا۔ دراصل انگریزوں کو نواب کی فوج سے کوئی خطرہ نہ تھا بلکہ وہ سینٹ فریس کے چار سو سپاہیوں سے گھبرا رہے تھے۔

پلاسی کے مقام پر جہلڑائی ہوئی وہ لڑائی کہلانے ہی کی مستحق نہیں..... وہ دغا بازی اور مکاری کا مظاہرہ تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو ہم اس کے حالات تفصیل لکھتے۔ لیکن چونکہ وہاں مکاری اور غداری عمل میں آئی اس لیے وہی واقعات قلمبند کریں گے۔

جنگ شروع ہو گئی۔ سینٹ فریس اور میردن کی توپیں ہولناک گرج کے ساتھ چلنے لگیں۔ انگریز کی توپوں نے بھی جواب دیا۔ آدھ گھنٹے کی گولہ باری نے انگریزوں پر ہر اس طاری کر دیا۔ ان کے دس یورپی اور

میر جعفر جس نے غداری کر کے شیر بنگال کو ختم کر دیا۔ ان دونوں پر قیامت تک لعنت و ملامت کی پھٹکار پڑتی رہے گی۔ یہ لڑائی مردانہ نہیں بلکہ دھوکے کی تھی۔ انگریز ایسی لڑائی ہی میں کامیاب رہتے ہیں۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے:

”صرف اس وقت جب کہ غدار اپنا کام کر چکے..... کلائیو بڑھ سکا۔ اس سے پہلے کلائیو کے بڑھنے میں فوج سمیت نیست و نابود ہو جانا یقینی تھا۔“

حادثہ جائگاہ

۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو یہ حادثہ رونما ہوا۔ اس تاریخ کو ہندوستان کی قسمت پلٹ گئی۔ میر جعفر لطف یار خان اور دلیپ رام کی غداری اور نمک حرامی کی وجہ سے انگریزوں کے قدم بنگال میں جم گئے۔ یہ وہ لعنتی لوگ ہیں جنہوں نے رشوت لالچ اور جھوٹے وعدوں میں آ کر ملت فردشی اور ایمان فردشی کی اور اپنے ایسے آقا کو دھوکا دیا جو ماں باپ سے زیادہ شفیق تھے۔

سراج الدولہ شام کو اپنے محل پہنچے۔ چہرے پر سخت پریشانی اور رنج و قلق کے آثار عیاں تھے۔ میرمدن کی بیٹی اور علی گھوہر کی زہدہ فردسیہ انہیں دیکھتے ہی جھٹ خواہگاہ میں چلی گئی۔ بیگم نے نواب کو سلام کیا اور کہا ”خیریت ہے؟ اعلیٰ حضرت خاموشی کے ساتھ تشریف لائے؟“

سراج الدولہ نے غمناک لہجے میں کہا ”خیریت ہوتی تو اس طرح کیوں آتے؟ ماموں جان میر جعفر نے نمک حرامی کی اور دشمن کا ساتھ دیا۔ ہمیں شکست ہو گئی۔ ہماری خوش بختی کا آفتاب غروب ہوا۔“

یہ سن کر بیگم سکتے میں آ گئیں۔ کچھ وقفے کے بعد کہا ”گھبراہیے نہیں خزانہ کافی ہے۔ نئی فوج بھرتی

نواب کا وفادار ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔“ اس نے پھر حلف اٹھا کر نواب کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ یہ واقعہ بہت سی تاریخوں میں اسی طرح رقم ہے۔

تھوڑی دیر جنگ کے بعد کلائیو کی بزدلی اور حماقت دونوں ظاہر ہو گئیں لیکن عین اس موقع پر میر جعفر کا رخ بدلتا دکھائی دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میر جعفر نے نواب کے ہاتھ میں گولی دے کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا وہ نواب اور اپنے خیمہ دونوں کو دھوکا دے رہا تھا۔

میر جعفر نے دیکھا کہ اگر لڑائی کی یہی صورت حال رہی تو انگریزوں کا ہچنا محال ہے۔ اور جب انگریز ہی نہ رہے تو اسے مسند پر کون بٹھائے گا؟ اس نے پھر وقت ضائع نہیں کیا فوراً لطف یار خان اور راجا دلیپ رام کو اطلاع دی کہ اپنا لشکر لے کر انگریزوں کی طرف چلو اور خود بھی چل پڑا۔

جلد ہی نواب سراج الدولہ کو احساں ہو گیا۔ دغا باز نمک حراموں نے انہیں دھوکا دیا۔ اس وقت انہیں اطلاع ملی کہ وفادار جاں نثار میرمدن اور علی گھوہر دونوں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ نواب کو ان کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔

جب نواب کی ۲۵ ہزار فوج انگریزوں سے جا ملی اور ان کے پاس صرف ہار و ہزار بلکہ اس سے بھی کم لشکر رہ گیا تو لڑنا بے کار تھا۔ وہ ہاتھی پر سوار مرشد آباد کی طرف چل پڑے اور اپنے لشکر کو پیچھے آنے کا حکم دے گئے۔

یہ تھی وہ جنگ جس نے ہندوستان کی قسمت پلٹ دی۔ ایک میر صادق دغا باز تھا جس نے شیردکن سلطان ٹیپو کا مکر و فریب اور نمک حرامی سے خاتمہ کیا۔ ایک

سیکھے اور دشمن کو شکست دیجیے۔"

سراج الدولہ: "یہی ارادہ ہے۔"

بیگم: "کیا میری بھی دشمن سے مل گئے؟"

سراج الدولہ: "نہیں وہ وفادار تھے جان نثار کر گئے۔ جب تک زندہ رہے دشمن کو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔"

فردوسیہ خوابگاہ کے دروازے سے لگی کھڑکی من رہی تھی۔ باپ کی موت کا حال سن کر بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ دل تلملا اٹھا۔

بیگم نے پوچھا "اور علی گوہر؟"

سراج الدولہ: "آہ! وفادار علی گوہر وہ بھی حق نمک ادا کرتے ہوئے شہید ہو گیا۔"

اب فردوسیہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ دردناک چیخ ماری اور دھڑام سے گری۔ عورت شوہر سے بے انتہا محبت کرتی ہے اور کیوں نہ کرے دنیا کی دل بستی شوہر ہی کے دم سے ہے۔ نواب اور بیگم دور کر خوابگاہ میں داخل ہوئے۔ بیگم فردوسیہ بے حس و حرکت پڑی تھیں۔ انھوں نے انتہائی غم بھرے لہجے میں نواب کو دیکھ کر کہا "وہ دیکھنا میری بہن کو کیا ہو گیا۔"

نامحرم عورت کو ٹٹولتے ہوئے سراج الدولہ لچکپائے لیکن موقع ایسا نازک تھا کہ پس و پیش کرنا نقصان دہ ثابت ہوتا۔ وہ اس کے اوپر جھک گئے۔ ہلیدی سے اُسے ٹٹولا۔ سانس دیکھا اور بغض دیکھی۔ وہ ساکت ہو چکی تھی۔ جسم میں گرمی نہ رہی تھی۔ افسوس بھرے لہجے میں کہا "افسوس غریب فردوسیہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔"

یہ سنتے ہی بیگم کے دل کو دھکا سا لگا اور وہ بیہوش ہو کر گر گئے۔ سراج الدولہ نے انھیں مسبری پر لے

جالا دیا۔ دو تین مرتبہ کراہنے کی آواز آہستہ سے آئی اور ان کا جسم بھی بے جان ہو گیا۔

سراج الدولہ نے یہ دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہا "بیگم! تم بھی میری قسمت کی طرح مجھے دھوکا دے گئیں۔ یہ امتحان اور باقی تھا۔ خدا نے وہ بھی لے لیا۔"

وہ کچھ دیر بیگم کے قریب بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھے۔ فردوسیہ کو بھی اٹھا کر بیگم کے پاس لٹایا۔ پھر خوابگاہ سے باہر آ کے کنیزوں کو بلوانے کا حکم دیا۔

بعد ازاں وہ درباری جو مرشد آباد میں رہ گئے تھے نواب نے چہل ستون میں ان سے ملاقات کی۔ بعض نے مشورہ دیا کہ فوج بھرتی کر کے دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ انھوں نے جواب دیا "میرا بھی یہی ارادہ تھا لیکن بیگم کی موت نے میرا دل توڑ دیا۔ اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ میں فقیری اختیار کروں گا۔"

کچھ لوگوں نے عرض کیا "حضور! انگریزوں کی شرانگہ مان لیں۔"

سراج الدولہ نے جوش میں آ کر کہا "کیا میں انگریز کی غلامی قبول کر لوں؟ حاشا مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ غلامی سے موت اچھی۔"

اس عرصے میں رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ اسی وقت مشہور ہوا کہ میر جعفر آ رہا ہے۔ نواب نے فقیر کا بھیس بدلا اور کل سراج کے پچھلے دروازے سے نکل رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔

خزانے کی لوٹ

جب نواب سراج الدولہ کی فوج میدان جنگ سے ہٹی تو میر جعفر نے کلائیو کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا۔

بجائے اس کے کہ کلائیو آتا اس نے ہی میر جعفر کو طلب کر لیا۔

اب میر جعفر مزید فکرمند ہوا۔ سہم گیا کہ کہیں انگریز اس کے ساتھ بھی دغا نہ کریں۔ بہر حال کلائیو کے حکم کی تعمیل کرنا ضروری تھی۔ اب اسے اپنی بے بسی کا خیال ستانے لگا۔ اپنے بیٹے میرن کو ساتھ لیا اور انگریز کیمپ کی طرف چلا۔ کرنل جی بی میلن نے اپنی کتاب "لارڈ کلائیو" کے صفحہ ۱۴ پر لکھا ہے:

"میر جعفر بڑا مضطرب تھا۔ وہ انگریز لشکر کی طرف

یہ سوچتا جا رہا تھا کہ دیکھو یہ

لوگ میرے ساتھ کیا سلوک

کرتے ہیں اور میری نمک

حرامی کا کیا انعام ملتا ہے۔

جب وہ بد بخت اور امن

شیطان انگریزی کیمپ میں

کلائیو کے سامنے پہنچا تو ہاتھی

سے اُترا۔ اسی وقت ایک

انگریزی دستہ اس کی طرف

بڑھا۔ میر جعفر کا چہرہ فق پڑ

گیا۔ کانپنے کی وجہ یہ ہوئی کہ

کلائیو خیمے کے سامنے

خاموش کھڑا تھا۔ قدرتی طور پر میر جعفر یہ سمجھا کہ وہ

دستہ اسے گرفتار کرنے بڑھ رہا ہے۔"

کلائیو اس کی پریشانی اور اضطراب بھانپ گیا۔

ممکن ہے کہ کلائیو کے دل میں بھی یہ بات آئی ہو کہ

میر جعفر کو اس کی دغا بازی اور نمک حرامی کی سزا دے۔

لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ مکار بوڑھے سے ابھی

کئی کام لینے تھے۔

اسے امید تھی کہ کلائیو اور تمام انگریز اس کے مشکور ہوں گے۔ اس نے آقا کے ساتھ غداری اور نمک حرامی کر کے انگریزوں کو وہ فتح دلائی جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ اس فتح نے کم از کم بنگال میں انگریزوں کے قدم جما دیے۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کلائیو نے توقع کے خلاف یہ پیغام بھیجا کہ کل موضع داؤد پور آ کر ملاقات کرو۔

یہ قدرتی بات تھی کہ میر جعفر کے دل میں اس جواب سے طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔



در اصل اس وقت میر جعفر اور

انگریز دونوں کی حیثیت لٹیروں

کی سی تھی۔ لٹیروں بہت جلد

ایک دوسرے سے بدظن ہو جایا

کرتے ہیں۔ میر جعفر نے وہ

رات بڑے کرب و اضطراب

میں بسر کی۔ صبح یعنی ۲۴ جون

۱۷۵۷ء بروز جمعہ جب میر

جعفر ناشن مکر رہا تھا کہ کلائیو کا

پیغام ظہی آ پہنچا۔

جو کچھ وہ کھا رہا تھا اس

کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس پہ

ہر اس طاری ہو گیا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب تک

نواب سراج الدولہ کا بدبہ رہا کسی انگریز کی خواہ وہ کتنا

بڑا افسر ہو یہ جرات نہیں تھی کہ اسے بلا سکے۔ انگریز اس

کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کرتے تھے۔

لیکن سراج الدولہ کو ہزیمت ہوتے ہی میر جعفر

کا اقبال بھی رخصت ہو گیا۔ اسی لیے جب کلائیو سے

ملاقات کرنا چاہی تو انکار کر دیا گیا۔ دوسرے روز

نہیں ہوئی۔ وہ شہر سے کچھ میل کے فاصلے پر سید آباد میں واقع فرانسیسی کونشی میں ٹھہرا۔

مرشد آباد میں آمد

جب میر جعفر نے مرشد آباد کے لوگوں کو ہموار کر لیا اور یہ اندیشہ دور ہو گیا کہ انگریزوں کے شہر آنے پر وہ حملہ نہیں کریں گے تب اس نے کلائیو کو شہر آنے کی دعوت دی۔ ۲۹ جون ۱۷۵۷ء کو دو سو گورے اور پانچ سو ہندوستانی سپاہی لیے مرشد آباد میں داخل ہوئے۔ اسی دن سہ پہر کے وقت کلائیو نے میر جعفر کو مسند نشینی کے لیے بلایا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جلد اس بوڑھے مردود کو مسند پر بٹھا کر نواب کے خزانے کی لوٹ مار شروع کرے۔۔۔۔۔ مہذب لوٹ یعنی لوٹے بھی اور نام بھی نہ آئے۔

اسی وقت نوبت و نقارے بجنے لگے۔ درباریوں نے باری باری تدریس پیش کیں۔ اس کے بعد نواب سراج الدولہ کے خزانے کی لوٹ شروع ہوئی۔ لارڈ کلائیو لارڈ ڈارک 'میجر کلپک' مسٹر وائسن اور دیگر انگریز افسروں نے لاکھوں روپے لوٹ لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ بوڑھے بدکار میر جعفر نے ملت کا مال سمجھ کر سب کچھ انگریزوں کو دے ڈالا۔ کلائیو وغیرہ نے تو اپنا حصہ نقد لیا۔ کہنی کے جھکے کا آدھا تو اسی وقت نقد لے کر کلکتہ بھیج دیا اور آدھے کی ہات تین قسطیں سال وار منظور کر لیں۔ اس طرح میر جعفر خزانے کی کوڑی کوڑی لٹا کر ایک طرح سے انگریزوں کا آوردہ اور محکوم بن کر مسند نشین ہوا۔

سراج الدولہ حکومت کرنا چاہتے تو ان کا خزانہ بھر پور تھا۔ رعایا خوش تھی۔ وہ مرشد آباد میں رہ کر پانچائی نئی فوج بنا سکتے تھے۔ رعیت ان کا ساتھ دیتی۔ لیکن اب ان کا دل

کلائیو یہ بات بھی سمجھتا تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو اس کی چال بازیوں کا پتا چلا تو وہ انگریزوں کا خاتمہ کر ڈالیں گے۔ میر جعفر اس کے دام میں پھنس چکا تھا۔ اس نے اسے آلہ کار بنانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وہ فوراً بڑھا اور صوبے دار صاحب کہہ کر میر جعفر کو سلام کیا۔ اظہار تشکر گزاری کے طور پر اس پر فرحت کو گلے لگایا اور کہا "میر جعفر اتم فکر و اندیشہ نہ کرو۔ انگریزوں نے تم سے جو وعدے کیے وہ اپنا مذہب سمجھ کر ایمان داری کے ساتھ انھیں پورا کریں گے۔ تم سراج الدولہ کے تعاقب میں فوراً جاؤ۔ ایسا نہ ہو وہ نیا لشکر بھرتی کر کے ہماری اور تمہاری مشکلات میں اضافہ کر دے۔ میں بھی تمہارے پیچھے تمہاری مدد کو آتا ہوں۔"

یوں انگریز نے نہایت چالاکي سے ہندوستانیوں کو ہم وطنوں کے ہاتھوں ہی تباہ کرادیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہاں مختلف قومیں آباد ہیں۔ ان میں آسانی سے نفرت اور دشمنی پیدا کرائی جاسکتی ہے۔ یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہیں، کسی ایک حکومت کی طرف داری کر کے دوسری کو زیر کرنا ممکن ہے۔ اجمعی ہندوستانی اپنی حکومتوں کو خود ہی تباہ کر سکتے ہیں۔ رشوت لالچ اور جھوٹے وعدوں سے انھیں اُلو بنایا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ سراج الدولہ اور میر جعفر کے معاملے میں انھیں تجربہ ہو ہی گیا۔

میر جعفر کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کلائیو کے احکام کی تعمیل کرے۔ چنانچہ لوٹا اور اپنا لشکر لیے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ ۲۵ جون کو شہر پہنچا۔ پیچھے پیچھے کلائیو بھی آیا۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں مرشد آباد کے لوگ بھڑک کر انگریزوں پر حملہ نہ کر دیں اسے مرشد آباد میں داخل ہونے کی جرأت

ٹوٹ گیا تھا۔ انہی لوگوں نے دھوکا دیا جن کے ساتھ انھوں نے نیک سلوک کیے تھے۔ جنھوں نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ پھر ان کی شریک حیات بھی انھیں دایع مفارقت دے گئی۔ اب دنیا اندھیر ہو گئی۔ حکومت تو کیا زندگی کی بھی خواہش نہیں رہی لیکن وہ مسلمان تھے خودکشی کو گناہ عظیم سمجھتے۔ اس لیے باقی زندگی فقیری میں بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اوجھڑاگریز اور میر جعفر دونوں خوب جانتے تھے کہ نواب سراج الدولہ رعایا میں ہر دلعزیز ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو فوج بھرتی کر کے دوبارہ عکبران بن سکیں۔ انھوں نے یہ خطرہ منانے کے لیے ان کی تلاش شروع کر دی۔ بے شمار آدمی ان کی گرفتاری پر مامور کیے۔ یہ لوگ میر جعفر کے نمک خوار تھے۔ انگریزوں نے جگت سیشنوں کو آمادہ کر لیا کہ وہ سراج الدولہ کے پکڑے جاتے ہی ان کا کام تمام کر دیں۔

اگرچہ نواب کی قوت جاتی رہی تھی۔ وہ مستند اور دارالسلطنت چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اپنا تمام خزانہ جوں کا توں چھوڑ گئے۔ خالی ہاتھ فقیر بن کر نکلے۔ لیکن کلاسیو اور انگریز اب بھی ان سے خوفزدہ تھے۔ سراج الدولہ کا نام سنتے ہی ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی۔ وہ خزانہ لوٹ کر اپنے آپ کو محفوظ اسی وقت سمجھتے جب سراج الدولہ دنیا میں نہ رہتے۔

آخر ان کی امید برآئی۔ نواب راج محل نامی مقام پر مقرر ہوئے۔ ۴ جولائی ۱۷۵۷ء کو میر جعفر کے سامنے لائے گئے۔ انھیں فقیری لباس میں دیکھ کر میر جعفر کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ نادام اور شرمندہ نظر آنے لگا۔

میر جعفر کو اپنا وہ زمانہ یاد آیا جب بہار سے غربت اور بے کسی کی حالت میں آیا تھا۔ تب سراج الدولہ کے

نانا علی وردی خان کے حضور درخواست ملازمت کی تھی۔ انھوں نے اسے شریف سمجھ کر فوجی افسر بنایا اور رزق رفتہ ترقی دے کر اپنے معتمد افسروں میں شامل کر لیا۔ پھر اسے اپنے عزیزوں میں شامل کر اس کی بہن سے شادی کر لی۔ اسے جو کچھ عروج حاصل ہوا وہ علی وردی خان کے طفیل تھا۔ اس کے عروج کو سراج الدولہ نے اور زیادہ ترقی دی۔

بہر حال میر جعفر نے سراج الدولہ کو نظر بند رکھنے کا حکم دیا۔ انگریز کا جگت سیشنوں سے خفیہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ سراج الدولہ کو ضرور قتل کرا دیں۔ چنانچہ ان نمک خراموں نے ایک شیطان سیرت شخص محمد بیگ کے ذریعہ انھیں قتل کرا دیا۔

صبح جب اسے حادثے کی خبر پہیلی تو شہر میں طوفان غضب اُمنڈ آیا۔ میر جعفر نے امیروں اور رئیسوں کو امن بحال کرنے بھیجا۔ بے چارے غوام کی راہبری کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے جوش و غضب کا طوفان جلد سرد پڑ گیا۔ ورنہ میر جعفر کا پتا چلتا نہ کسی انگریز کا.....

یہ قحطی داستان اس خدا رسید پر ہیزگار اور پر جوش مسلمان نواب سراج الدولہ کی جو نکر و فریب دھوکا اور دغا بازی سے شہید کر دیے گئے۔ جس طرح سلطان نیچو شیردکن تھے اسی طرح سراج الدولہ شیربنگال تھے..... سلطان نیچو شہید نکر و فریب کا شکار ہوئے اور نواب سراج الدولہ بھی اور ان دونوں کے نام تاریخ میں آفتاب کے مانند چمک رہے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
نگ ملت نگ دین نگ وطن



محترمی و کرمی جناب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

❀ کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قائدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آئمہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی ثواب بھی آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ ہے۔

❀ اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفاسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے۔ ان شاء اللہ

❀ دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن جب آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں، ہمارے کام تعلیم القرآن و عصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام بطریق احسن سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم و کتب حدیث عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

اردو ڈائجسٹ
اگست 2014ء

نولہ سال

بچوں کی تعلیم اور ترقی

اب نئے ڈیزائن اور جدید SAFE پیکنگ میں



© 2003

بھارتی انتہا پسندی

پچھلے ۶۷ برس سے

عمل میں ڈھلنا

سے مسلمانوں کو مٹانے والا

ہندوستان
منصوبہ سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں
ایک انتہا پسند ہندو رہنما، سوامی
ستیا دیو پری پراچک کی زبانی منظر عام پر آیا۔ انھوں
نے سائر (متوسط ہند) میں تقریر کرتے ہوئے اعلان
کیا تھا:

”ہندوؤں کو ستھپن کرنا مضبوط بنو۔ اس دنیا میں
طاقت ہی کی پوجا ہوتی ہے اور جب تم مضبوط بن جاؤ
گے تو یہی مسلمان خود بخود تمہارے قدموں پر اپنا سر
تھکا دیں گے۔ اس صورت میں ہم خود ان کے سامنے
اپنی یہ شرطیں پیش کریں گے۔
۱۔ قرآن کو الہامی کتاب نہ سمجھو۔

۲۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (نور اللہ)

رام راج کا

منصوبہ

بھارتی سرکار کی اس سوچی سمجھی سازش کا کچا
چٹھا جس کے ذریعے ہزار ہا مسلمانان
بھارت کو شدھی بنا لیا گیا

منشی عبدالرحمن خاں



رسول خدا نہ کہو۔ چنانچہ ہندوؤں نے بھی اپنے مذکور الصدر منصوبہ کو

عملی جامہ پہنانے کے لیے بھارت کی عنان حکومت سنبھالتے ہی انگریزوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ملک کی مقبول ترین زبان اردو کے بجائے ہندی کو قانوناً ذریعہ تعلیم بنایا جس کے بولنے اور سمجھنے والے ملک میں آنے میں تنگ کے برابر بھی نہیں تھے۔

جیزا توڑ ہندی

اردو کے وجود سے انکار کرنے کے بعد وہاں ایسی جناتی زبان مروج کرنے کے لیے تمام سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مصروف عمل ہو گئے جس کے متعلق خود وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان ہے:

”اس وقت تک جو ہندی سرکاری دفاتروں میں چلائی گئی وہ توڑے جیزا توڑ الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اس طرح کی ہندی کبھی بھی عامۃ الناس کی زبان نہیں بن سکتی۔ میں نے تو جب سرکاری استیصال کے لیے اس قسم کی لغت پر نظر ڈالی میرے سر میں درد ہونے لگا۔“

(صدق جدید ۲۹ جنوری ۱۹۵۳ء)

کایا پلٹ

بہر حال بھارتی افسر شاعری کی حوصلہ افزائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہندوؤں نے ہندی کی ترویج کو قومی مسئلہ بنا لیا اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے اسے تمام ملک میں فی الفور جگہ دینے اور اردو کو حرف غلط کی طرح مٹانے پر کمر بستہ ہو گئے۔ اسی سلسلے میں قاضی محمد عدیل عباسی ایم ایل اے، صدر استقبالیہ، اردو کانفرنس کا بیان غیرت انگیز ہے:

”اب اردو زبان کے ساتھ ایک بدیشی زبان سے

۳۔ عرب و غیرہ کا خیال دل سے دور کر دو۔

۴۔ سعدی و درویشی کے بجائے کبیر و تسلی داس کی تصانیف کا مطالعہ کرو۔

۵۔ اسلامی تیوہاروں اور تعطیلوں کے بجائے ہندو تیوہار و تعطیلات مناؤ۔

۶۔ اسلامی نام رکھنا چھوڑ دو۔

۷۔ عربی کے بجائے تمام عبادتیں ہندی میں کی جائیں۔

(اخبار دیکل امرتسر ۹ دسمبر ۲۵، ص ۴)

دستور جہانپانی

غیر مسلم حکمرانوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اسلامی ملک پر قبضہ و تسلط جانے کے بعد سب سے پہلے وہاں کی تہذیب و تمدن ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مخصوص انداز میں ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ اس ملک کے باشندے خود بخود حکمران طبقے کی تہذیب و تمدن اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ حملہ بالعموم تعلیم و تربیت کی راہ سے ہوتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ہمارے سامنے انگریزوں کی موجود ہے۔

انھوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے مسلمانوں کی سیرت بدلنے کے لیے ان کا وہ اخلاقی نصاب جو کریمیا سے شروع ہو کر گلستاں تک جاتا تھا اور جس کے اسباق ہر عمر میں پڑھنے والے کے کام آتے تھے یکسر بدل دیا۔ اس کی جگہ کتوں اور بلیوں کی کہانیوں کا ایسا نصاب مقرر کیا جس سے بقول مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی ”طفلا نہ دلچسپیوں کے سوا کوئی اخلاقی تعمیر سیرت کا فائدہ اور زندگی کا قاعدہ معلوم نہ ہوا۔“

کوش لکھ کر اس کی جگہ ہندی کے ایسے بنیادی نصاب مقرر کیے گئے جن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلمان خود بخود ہندو ہو جائیں اور بمصدق نہ پیگ گئے نہ پستکری اور رنگ چوکھا آئے یعنی ایک تیرے دو شکار ہونے لگے۔

ابتدائی تعلیم

ہندوستان میں جس قسم کی ابتدائی تعلیم مسلمان بچوں کو دی گئی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر ماہنامہ ”معارف“ اعظم گڑھ نے شخصی کانفرنس کے خطبہ صدارت میں فرمایا: ”ابتدائی تعلیم تمام ہندو مذہب اور تہذیب کی ترجمان اور اس کی مبلغ ہے۔ اس میں اسلامی تہذیب اور روایات کا کوئی شائبہ نہیں۔ نصابی کتب میں موجود دھرم کی خرافات اور علم الامناسم کے مشرکانہ لوہام اسلامی تعلیم کے سراسر منافی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب کا سوال الگ رہا ان کی جانت تہذیب تک کا اس میں کوئی نشان نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جنگ آزادی کے ان مسلمان مجاہدین اور راہنماؤں تک کے ذکر سے یہ کتابیں خالی ہیں جنہوں نے ہندوستان کو آزادی کا سبق پڑھایا۔ ایسی حالت میں جو مسلمان بچے پڑھیں گے ان کا انجام اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ اپنے مذہب تہذیب اور روایات سے بالکل بیگانہ ہوں۔ وہ ہندو تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں اور آئندہ سلیس محض نام کی مسلمان رہ جائیں۔“

(صدقہ جدید ۱۰/ جون ۱۹۵۵ء)
اس کی مزید تائید و تصدیق مدراس کے ”دکن ہیرالڈ“ میں شائع ہونے والے ایک مراسلے سے ہوتی ہے۔ اس میں درج ہے: ”یو پی کے محکمہ تعلیمات نے اردو کی جو بیسک

بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری محکمے میں بطور زبان تسلیم نہیں کی جاتی۔ کچھریوں کا یہ حال ہے کہ وہاں اردو کو داخلہ کی اجازت نہیں۔ دستاویزات کی نقل اردو رسم الخط میں نہیں ملتی۔ جو کاغذات اردو میں ہوں ان کا ہندی ترجمہ عدالتوں میں داخل کرنا پڑتا ہے۔“

”حتیٰ کہ نشانات ریلوے سڑک پر میلوں کے پتھروں پر بھی اردو کو جگہ نہیں دی گئی۔ لکھنؤ جیسے شہر میں اسٹیشنوں پر ”آئندہ آنے کا راستہ“ اور ”باہر جانے کا راستہ“ اردو میں تحریر نہیں۔ وہ ایسی کتب بھاشا میں درج ہے کہ ان کا سمجھنا ان لوگوں کے لیے بھی مشکل ہے جو اسے پڑھ لیتے ہیں۔ کٹ خریدنے کی جگہ پر بھی اردو زبان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ بچوں کو اردو پڑھنے کی اجازت نہیں۔“

(صدقہ جدید ۱۵/ اپریل ۱۹۵۵ء)
”سیاست جدید“ کانپور میں جون ۱۹۵۴ء کے شمارے میں اطلاع دی گئی:

”سارے ہندوستان میں کسی ایک ریلوے اسٹیشن پر بھی ٹکٹوں پر اردو کے الفاظ باقی نہیں۔“
غرض بھارت میں ہر دفتر محکمہ اردو اور ہر معاملے میں ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ مسلمانوں کے لیے ہندی سیکھنے کے سوا روزمرہ کی گاڑی چلانا ناممکن ہو گیا۔

بنیادی نصاب

ہندی پڑھنے پڑھانے کا معاملہ صرف نئی زبان کی حد تک محدود رہتا تو اسے طوعاً و کرہاً برداشت کیا جاسکتا تھا۔ مگر مشکل یہ پیدا کر دی گئی کہ نہایت خاموشی کے ساتھ تدریس مسلمانوں کو ”شدھ“ کرنے کا کام بھی لیا جانے لگا۔ یعنی اسکولوں کا لچوں یونیورسٹیوں سے اردو کو بیک بینی دو

کا فرض بھی ادا کرتا رہا۔ اس نے ایسے طور طریقے اور نصاب و اسباق مقرر کیے کہ سب بھارتی ہندو مذہب کے پیرو ہو جائیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک بڑے اسلامی ادارے کے ایک ڈے وائرکن نے ذکر کیا:

”جب لڑکے اسکول سے آئیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی انعام علیکم کہنے کے بجائے مستکار کرتے ہیں۔ جب کوئی چیز گرم ہو جائے تو اناللہ پڑھنے کے بجائے سات مرتبہ رام رام پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہر معاملے میں ہندو تہذیب کی مطابقت کرتے ہیں۔ جب انھیں نوکا جاتا ہے کہ تم مسلمان ہو کر ایسا کیوں کرتے ہو تو جواب ملتا ہے کہ ہمیں اسکولوں میں بھی سکھایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ڈرایا جاتا ہے کہ اگر تم بے خلوت یا جلوت میں اس کے مطابق عمل نہ کیا اور اس کی ہم تک خبر پہنچ گئی تو تمہیں سزا دی جائے گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں؟“

غرض اس طرح بھارتی مسلمانوں کو شدھ کرنے کی کوشش ہوئیں جن کا بظاہر ہر کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔

جبری ہندی تعلیم

اس سے بچنے کی ایک صورت یہ تھی کہ بھارتی مسلمان اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا خود کوئی مناسب انتظام کرتے مگر وہاں ایسا کرنا قانوناً جرم ہے۔ رائج الوقت قانون کے مطابق ہر چھ سالہ بچے کے لیے سرکاری مدارس میں داخل ہونا لازمی ہے۔ اگر والدین غفلت یا کوتاہی کریں تو ان کے لیے دوسرا سال تک کے لیے قید با مشقت موجود ہے۔ اس لیے ہر مسلم بچے کو قانوناً ایسی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے جو اسے شدھ بنادے۔ چونکہ شدھی کا کام محکمہ تعلیم کے سپرد کر دیا گیا تھا اس لیے کارکن مسلمان بچوں کی خاص طور پر تلاش میں رہتے تاکہ کوئی شدھ ہونے سے نہ بچ سکے۔

ریڈریں تیار کرائی ہیں، وہ صاف شدھی کا پروپیگنڈا اور ہندو دھرم کے پرچار کا آلہ ہیں۔ بارہ اسباق کو چھوڑ کر جو قواعد زبان سے متعلق ہیں باقی آٹھ میں سے بڑی کثرت سے سبق بندوانہ ہی ہیں۔ جہاں تک ہندو بزرگوں، رسوں اور تیرتھوں کا تعلق ہے سبق شری رام چندر جی بھرت ملاب شری کرشن جی دھنش یگ گیش جی دہروا پرہلاڈ رامائن سگریو گرگا اجودھیا متھرا کاشی پریاگ سوراس تلسی داس میرا بائی وغیرہ سب پر ملتے ہیں۔ کوئی ایک سبق بھی حضرت محمد ﷺ حضرت مسیحؑ خوبہ حسین الدین چشتیؒ اور گورو نانک وغیرہ پر موجود نہیں۔

اسی طرح ہندو لیڈروں میں مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو ایٹور چندر دیا ساگر مدن موہن مالویا تلک لالہ لالچت رائے سردار پٹیل راجندر پرشاد سروجنی ٹائیڈ پنڈت پنت ٹنڈن جی وغیرہ سب کا ذکر موجود ہے۔ لیکن نہیں ذکر کیا تو حکیم اجمل خاں سرسید علامہ اقبال آصف علی محمد علی گوہر شوکت علی گوہر ڈاکٹر انصاری مولانا حسین احمد رفیع احمد قندلانی اور ڈاکٹر سید محمود کا۔ اس طرح جنگ آزادی کے سلسلے میں کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ صرف سنگا پانڈے ناہاتیا ٹوٹی اور بھگت سنگھ وغیرہ کے اور نام بھی نہیں آنے پایا ہے تو نچو سلطان سید احمد شہید بہادر شاہ ظفر وغیرہ کا۔ (صدق جدید ۳ مارچ ۱۹۵۵ء)

ہندی تعلیم کا اثر

ایسی کتابوں کو پڑھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نئی پود خود بخود شدھ ہو گئی اور ”ہندی ہندو ہندوستان“ کا نعرہ پراسن طریق سے کامیاب ہوا۔ گویا ہندوستان کا محکمہ تعلیم زبان کے ساتھ ساتھ شدھی کی تبلیغ

عبرت نامہ

از جان بر خوردار کا مران بعد دعا واضح

عزیز

ہو کہ یہ زمانہ تمہاری خیریت نے معلوم
ہونے کی وجہ سے بے چینی میں گزرا۔

جی نہیں کہ چٹھی بھیجی یا نہیں۔ شیخ صدیق حسن خاں کا جینا
لندن جا رہا تھا تو اسے بھی خط لکھ کر دیا کہ کراچی بھجوا دینا۔
اس حرام خورد نے بھی کچھ پکانے دیا کہ خط بھجایا نہ بھیجا۔

سب سے زیادہ تشویش عمران میاں کی طرف سے
رہی کہ وہ وہاں پہنچے یا نہیں۔ پہنچے تو کسی طور تو انھیں اپنی
خیریت کا خط بھجوانا تھا۔ احوال یہ ہے کہ عمران
میاں لاہور سے گزر رہے تھے۔ یہ وہ سوادہ ماد پہلے کی بات

میں نے مختلف ذرائع سے خیریت بھیجی اور منگائے کی
کوشش کی مگر بے سود۔ ایک چٹھی لکھ کر ایذا ہم کے بیٹے
یوسف کو بھیجی اور تاکید کی کہ اسے فوراً کراچی کے پتے پر
بھجوا دے۔ لاہور سے جو چٹھی آئے مجھے ہوائی ڈاک روانہ
کرو۔ تمہیں پتا ہوگا کہ وہ کویت میں ہے اور ابھی کلائی کر
رہا ہے۔ بس اسی میں اپنی اوقات بھول گیا اور پلٹ کر لکھا

نئی نسل کے نام

ہندوستان سے آخری خط

ہندوستان تہذیب میں تیزی سے جذب ہوتے مسلم طبقہ اشرافیہ کے ایک بزرگ کا الم ناک نامہ

انتظار نہیں



اپریل 2014

نہیں۔ تم اسی مٹی میں پیدا ہوئے ہو پچھانے جاؤ گے۔
اس پر وہ عزیز زہر خند ہوا اور بولا کہ چچا جان! گھر
آلے سے پہلے میں بستی میں گھوم پھر چکا۔ اس مٹی نے
مجھے نہیں پہچانا۔

میں نے کہا 'بیٹے اب اسی میں عافیت ہے کہ یہ مٹی
تمہیں نہ پہچانے۔ خیر تو میں شام پڑے عمران میاں کو
قبرستان لے گیا۔ نئی قبروں سے متعارف کرایا۔ پرانی کو
انھوں نے خود پہچان لیا۔ اندھیرا تھا اس لیے بعض
قبروں کی شناخت میں قدرے دقت پیش آئی۔ میاں
جانی کی قبر پر پہنچ کر عمران میاں کا دل بھر آیا۔ میری بھی
آنکھ بھگی گئی۔ وہ قبر بہت کہن ہو گئی ہے۔ سرہانے کھڑا
ہوا بار سنگھار کا پیر کر چکا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میاں جانی کو
بار سنگھار کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے باغ میں بہت
شوق سے کئی چیز لگائے تھے۔ ان سے اتنے پھول
اترتے کہ سال بھر تک گھر کی بچیوں کے دوپٹے ان میں
دھنکے جاتے۔ ہر دعوت پر بریانی میں ڈالے جاتے پھر
بھی بچے رتے۔ مگر بار سنگھار توجہ چاہتا ہے میں اکیلا کس
کس چیز پر توجہ دوں؟

بار سنگھار کا یہ آخری بیڑ تھا جو میاں جانی کے
سرہانے کھڑا رہ گیا۔ جنگ سے پہلے والی برسات میں
وہ بھی گر گیا۔ اب ہمارا باغ اور ہمارا قبرستان دونوں بار
سنگھار سے خالی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ البتہ باغ بچ
گیا تو یہی بہت ہے۔ مصلح ہونے کی بنا پر قبرستان
میں شمار ہوا اور ہاتھ سے جاتے جاتے بچ گیا۔ مگر ان
ساتھ برسوں میں اتنے بیڑ گرے اور فن کے ساتھ
اتنی یادیں دفن ہو گئی ہیں کہ اب اس باغ کو بھی قبرستان
سمجھنا چاہیے۔ جو بیڑ باقی رہ گئے وہ گزرے دنوں کے
کتبے نظر آتے ہیں۔

ہے۔ سمجھ لو کہ گلابی جازا تھا۔ میں اپنا پلنگ کمرے سے
والان میں لے آیا تھا۔ رات گئے دستک ہوئی۔
پریشان ہوا کہ الٹی خیر اس غیر وقت میں کون آیا اور
کیوں آیا؟ جا کر دروازہ کھولا دستک دینے والے کو سر
سے پیر تک دیکھا۔ حیران و پریشان کہ یہ کون آ گیا
ہے؟ خون نے خون کو پہچانا اور نہ وہاں اب پہچاننے کے
لیے کچھ نہیں رہ گیا۔

تب میں نے اسے گلے لگایا اور کہا کہ بیٹے ہم نے
تمہیں ان حالوں تو پاکستان نہیں بھیجا تھا تم کیا حال بنا
کر آئے ہو۔ مگر پھر میں اپنے کہے پر آپ نادم ہوا۔ یہ
کیا کم تھا کہ ہماری امانت ہمیں واپس مل گئی۔ بندے کو
چاہیے کہ ہر حال میں خدا کا شکر کرے۔ حرف شکایت
زبان پر نہ لائے کہ مبادا کلمہ کفر بن جائے اور کہنے والا
مستحق عذاب ٹھہرے۔ انسان ضعیف الہیان نے دنیا
میں آنے کے بعد وہ کچھ کیا ہے کہ اس کے ساتھ جو بھی
ہو، شکایت کی گنجائش نہیں۔ آدمی بس چپ رہے اور
"جہاد و قہار" کے قہر سے ڈرتا رہے۔

تمہاری چچی نے عمران میاں کو دیکھا تو حق دق
رہ گئیں۔ گلے لگایا اور بہت روتیں۔ میں تو چپ رہا تھا
مگر وہ پوچھ بیٹھیں کہ بہو کہاں ہے؟ بچوں کو کہاں
پھوڑا؟ اس پر عزیز کی حالت غیر ہو گئی۔ میں اور تمہاری
چچی دونوں گھبرا گئے۔ پھر احتیاط برتی کہ ایسا کوئی حوالہ
درمیان میں نہ آئے۔

عمران میاں یہاں تین دن رہے مگر کیا رہے بولنا
نہ ہنسنا بس گم سم۔ تیسرے دن عمران میاں کو خیال آیا
کہ میاں جانی کی قبر پر چلا جائے۔ میں نے سر پر ہاتھ
پھیرا اور کہا کہ بیٹے تم ہمیں برس بعد دادا کی قبر پر فاتحہ
پڑھو گے۔ مگر دن میں اس طرح جانا قریب مصلحت

بیان پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔

ہاں شیخ صدیق حسن تنہا کے متعلق بھی ایک مرتبہ خبر لائے۔ خبر سنائی کہ تم نے کوٹھی بنوائی ہے۔ بیشک میں صوفے بچے ہیں۔ ٹیلی ویژن رکھا ہے۔ یہ خبر سن کر خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ یہاں کی تلافی وہاں ہو گئی۔ یہاں حویلی کا حال اچھا نہیں۔ پچھلی برسات میں بھگی ہوئی کڑیاں اور جھک گئیں۔ دیوان خانے کا حال تو یہ ہے کہ چھت کی طرف دیکھو تو آسمان نظر آتا ہے۔ ہماری بیکاری اور زیر کاری کا حال تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔

تم کچھ رقم بھیج سکو تو میاں جانی کی قبر کی مرمت کرا دی جائے۔ اس سے زیادہ فی الحال کرنا بھی نہیں چاہیے۔ حویلی کے مقدمے کے کاغذات میرے پردر گئے تھے۔ الحمد للہ کہ میں نے سب پیشیاں کامیابی سے بھگائی ہیں اور ہمیشہ لائق وکیلوں سے رجوع کیا۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ مقدمے کا فیصلہ جلد ہمارے حق میں ہوگا۔ مگر پیک اہل کا پتا نہیں کہ کس روز سر پہ آکھڑا ہو۔ کبھی کبھی بہت فکر مند ہوتا ہوں کہ میرے بعد یہ مقدمہ کون لڑے گا۔

جس طرف نظر ڈالوں تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ ہمارے صاحبزادے، اختر کے لکھن یہ ہیں کہ اپنا نام پریمی رکھ لیا۔ ریڈیو پہ جا کر ڈراموں میں ہندو کردار ادا کرتا ہے۔ چھوٹے بھیا مرحوم کی صاحبزادی خالدہ نے ایک ہندو اکیل سے شادی کر لی۔ اب وہ بے حجابی سے ساڑھی باندھتی اور ملتے پہ بندی لگاتی ہے۔ پاکستان میں جو خاندان کا نقشہ ہے وہ تم پر مجھ سے زیادہ روشن ہونا چاہیے۔ سنا تھا کہ آپا جانی کی لڑکی نرمس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔ خود آپا جانی کا احوال میں

بہر حال جو باغ کا حال ہے وہ عمران میاں دیکھ گئے ہیں۔ اگر پہنچ گئے ہوں گے تو بتایا ہوگا۔ یہاں سے تو وہ اسی صبح کو چلے گئے تھے۔ رات میاں جانی کی قبر کے سر ہانے بیٹھ کر گزار دی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ جب جھپٹا ہوا اور چڑیاں بولیں تو عزیز جہر جھری لے کر اٹھا اور مجھ سے رخصت چاہی۔

میں نے خیریت سے پوچھا کہ کیوں جا رہے ہو؟ آگئے ہو تو رہو۔ پھیکے پن سے بولا کہ یہاں تو مجھے کوئی پہچانتا ہی نہیں۔

میں نے کہا کہ عزیز اب نہ پہچانے جانے ہی میں عافیت ہے مگر وہ میری بات سے قائل نہیں ہوا۔ سفر اس پر سوار تھا۔ میں نے پوچھا ”مگر بیٹے جاؤ گے کہاں؟“ بولا کہ جہاں قدم لے جائیں گے۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ کھنڈ جا کر وہاں سے کراچی جانے کی نیت ہے۔ دل تو بہت دکھا مگر کچھ اس کا اصرار اور کچھ میرا یہ ڈر کہ کہیں یہ خبر نہ لگ جائے۔ سو صبر کیا۔ اپنے بازو سے دعائے نور کھول کر اس کے بازو پر باندھی اور اللہ کی حفظ و امان میں رخصت کیا۔ چلتے چلتے تاکید کی تھی کہ سرحد سے نکلتے ہی جس طرح بھی ہو خیریت کی اطلاع دینا۔ مگر وہ دن ہے اور آج کا دن خیریت کی خبر نہیں ملی۔

پاکستان کی خبر ابھر کم کم پہنچتی ہے۔ پہنچتی بھی ہے تو ایسی کہ اس پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک روز شیخ صدیق حسن نے آ کر خبر سنائی کہ پاکستان میں سب سوشلسٹ ہو گئے ہیں اور پیاز پانچ روپے سیر تک رہی ہے۔ یہ خبر سن کر دل بیٹھ گیا۔ مگر پھر سوچا کہ شیخ صاحب پرانے کا ٹگریسی ہیں۔ پاکستان کے بارے میں جو خبر سنائیں گے بری ہوگی۔ ان کے

ہاتھ آئے تھے۔ سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ ہمارا شجرہ نسب گم ہو گیا۔ ہمارے اجداد نے کہ مادات عظام میں سے تھے تاریخ میں بہت مصائب و آلام دیکھے ہیں۔ مگر شجرے کے گم ہونے کا الم ہمیں سہنا تھا۔

اب ہم ایک آفت زدہ خاندان ہیں جو اپنا ٹھکانا اور شجرہ گم کر چکا اور انتشار کا شکار ہے۔ کوئی ہندوستان میں کھیت ہوا کوئی بنگلہ دیش میں گم ہوا اور کوئی پاکستان میں در بدر پھرتا ہے۔ عقیدے میں غفل پڑ چکا۔ غیر اسلامی طور اظہار اپنا لیے۔ دوسرے مذہبوں اور فرقوں میں شادیاں کر رہے ہیں۔ یہی حال رہا تو تھوڑے عرصے میں ہمارے خاندان کی اصل نسل ناپود ہو جائے گی اور کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔

پیارے میاں ہماری پھوپھی اماں کے لاڈلے بیٹے تھے۔ لاڈ پیار میں ایسے بگڑے کے ساتوں عیب اپنا لیے۔ ہمارے خاندان میں پہلے فرد تھے جنہوں نے بائیسکوپ دیکھا۔ ایک دفعہ میں بھی ان کے کہے میں آ کر ہبک گیا۔ مادھوری کو دیکھ کر دل بہت بے قابو ہوا مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ پیارے میاں نانک کے متوالے تھے بائیسکوپ شہر میں آیا تو اس کے رسیا بن گئے۔

”بہی کی بیٹی“ دیکھ کر سلو چنا پر مر گئے۔ ایک روز پھوپھی اماں کی طوائی بالیاں چرا گھر سے نکل گئے اور سیدھے بہی پہنچے۔ میاں جانی نے کہلا بھیجا کہ صاحبزادے! اب ادھر کا رخ نہ کرنا۔ بہی میں ایک ٹہنی نے انھیں جھانسہ دیا کہ تمہیں سلو چنا سے ملاؤں گی۔ سلو چنا سے تو نہ ملا یا خود گلے پڑ گئی۔ ساری جوانی بہی میں گزاری۔ پھوپھی اماں کے مرنے کی خبر پہنچی تو

نے یہ سنا کہ وہ کھلے منہ بیٹے کی موٹر میں بیٹھتی اور بڑا زور سے منہ در منہ بات کر کے کپڑا خریدتی ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے ایک میں ہی زندہ رہ گیا! قبلہ بھائی صاحب مرحوم اور چھوٹے بھیا دونوں اچھے دنوں میں سدھار گئے۔ جب قبرستان جاؤں اور ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھوں تو قبلہ بھائی صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ کیا وقت آیا ہے کہ اب ہم میں سے کوئی جا کر ان کی قبر پر فاتحہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ جو خاندان ایک جگہ جیا ایک جگہ مرا اب اس کی قبریں تین قبرستانوں میں بٹی ہوئی ہیں۔

میں نے قبلہ بھائی صاحب سے سو بات عرض کیا تھا کہ اگر آپ ہمیں چھوڑ ہی رہے ہیں تو پھر مناسب یہ ہے کہ کامران میاں کے پاس کراچی جائے۔ مگر چھوٹے بیٹے کی محنت انھیں ڈھاکہ لے گئی۔ ان کی بے وقت موت ہم سب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ ان کے جلد اٹھ جانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ وہ ایک روح تھے قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ عبرت و اذیت کے دن دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ دن تو مجھے گنہگار کو دیکھنے تھے۔

اب جب کہ بڑوں کا سایہ مرے اٹھ چکا ہمارا خاندان ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ کر بکھر گیا ہے۔ میں لب گور بیٹھا سوچتا ہوں کہ میرے پاس جو امانت ہے اسے تم تک منتقل کروں کہ اب تم ہی اس خاندان کے بڑے ہو۔ مگر اب یہ امانت حافظے کے واسطے ہی سے منتقل کی جا سکتی ہے۔ خاندان کی یادگاریں مع شجرہ نسب کے قبلہ بھائی صاحب اپنے ساتھ ڈھاکہ لے گئے تھے۔ جہاں افراد خاندان ضائع ہوئے وہیں وہ یادگاریں بھی ضائع ہو گئیں۔ عمران میاں یہاں خالی

انگنائی میں روڑے کا کرنا اور چھت پر کنکڑے کا خم کھانا کچھ اچھی علامت نہیں۔

ان دنوں چھوٹی پھوپھی کی بڑی لڑکی خدیجہ قد نکال رہی تھی۔ چھوٹی پھوپھی نے اس واقعے کا ذکر میاں جانی سے کیا۔ کنکڑے کے ساتھ جو رتہ چھت پر گرا تھا وہ بھی سانسے رکھ دیا۔ میاں جانی آگ بگولا ہو گئے۔ بہت گرجے برسے کہ رضاعی کے بیٹے کی یہ مجال کہ ہماری چھت پر کنکڑا گراتا ہے۔ مگر جب چھوٹی پھوپھی نے اونچ نیچ سمجھائی تو نیچے پڑے۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ اس اوہاٹ کے ساتھ دو بیل پڑھائے جائیں اور لڑکی کو رخصت کر دیں۔ رضاعی تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس گھر کی بیٹی ان کی بیوی بنے گی۔ ترستے لگا کر یہ رضامند ہو گئے۔

عزیز! اب میں اڑتے پتوں کا ماتم دار ہوں۔ ان دنوں کو جب یہ خاندان برگ و ثمر سے لدا پھندا اور رخت تھا پار کر کے آوارہ پتوں کا شمار کرتا ہوں۔ میں نے مرنے والوں ہی کے اعداد و شمار جمع نہیں کیے جن کا زندگی میں شمار ہے انھیں بھی شمار کیا ہے۔ سب کے نام پتے اور گوانف قلم بند کر چکا۔

ویسے تو مشاہدے میں یہی آیا ہے کہ جیسے بکھر گئے سو بکھر گئے۔ تیز تر خاندان کبھی سنتے نہیں دیکھے گئے۔ مگر کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔ اس درمائدہ خاندان کے سر دہرے بنو۔ آدمیوں کی خیر خبر رکھو۔ اب کہ رستے کھٹنے لگے ہیں ادھر کا بھی ایک پھیرا لگا جاؤ۔ اپنی صورت دکھا جاؤ ہماری صورت دیکھ جاؤ۔ تمہاری چچی کا تقاضا ہے کہ دلہن کو ساتھ لے کر آؤ۔ ہاں میاں اکیلے مت چلے آنا۔ اس بہانے تمہارے بچوں کو بھی دیکھ لیں گے کہ کس کی کیا شکل و صورت

آئے۔ بڑھاپا آچکا تھا۔ لمبی ڈاڑھی ہاتھ میں تسبیح۔ ماں کو یاد کر کے بہت روئے۔ ہم سب نے کہا کہ اب تم یہیں رہو۔ بولے کہ میاں جانی کی اجازت کے بغیر یہاں کیسے ٹک سکتا ہوں؟ میاں جانی دنیا سے پہلے ہی سدھار چکے تھے اجازت کون دیتا؟ پھر بھی چلے گئے۔ ۴۷ سال چکا تھا اور گاڑیوں میں حادثے ہو رہے تھے۔ سب نے بہت سمجھایا نہ مانے گاڑی میں سوار ہو گئے مگر بمبئی تو پہنچے نہیں جانے راستے میں ان پر کیا گزری۔ پیارے میاں ہمارے خاندان کی طرف سے تسادات ۴۷ میں پہلی بھیٹ تھے۔ میں نے اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ تب سے اب تک ہمارے خاندان کے اکتیس افراد اللہ کو پیارے ہو چکے۔ اکیس تسادات میں مقتول ہوئے۔ کچھ پاکستان جا کر برادران اسلام کے ہاتھوں اللہ کو عزیز ہوئے۔ ایک کو کراچی میں ایوب خان کے آدمیوں نے یہ موقع انکسشن محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کرنے کی پاداش میں گولی مار دی۔ کچھ مشرقی پاکستان میں ہلاک ہوئے۔ میں نے ان افراد میں عمران میاں کو شمار نہیں کیا۔ بندے کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے کہ دو ہمارے بھر کا ٹکڑا اگر ابھی تک کراچی نہیں پہنچا تو کھٹکندہ میں ہے۔

ایسے میں نے سنا ہے کہ پاکستان جا کر ہمارے خاندان کی لڑکیاں زیادہ آزاد ہو چکیں۔ میں تو جس لڑکی کا نام لوں یہی سنتا ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ ہمارے خاندان میں تقسیم سے پہلے بس ایک واقعہ ایسا ہوا جو خاندان کو بدنام کر سکتا تھا مگر اسے بھی خوش اسلوبی سے دبا دیا گیا۔ چھوٹی پھوپھی کی چھت پر ایک روز کنکڑا آ کے گرا..... اور تم جانو کہ جس گھر میں کوئی لڑکی جوان ہو رہی ہو اس کی

وہ بھی دیکھا۔ کہیں جلد آنکھ بند نہ ہو جائے کہ وہ دیکھیں جو دیکھنے کی مدت العمر سے آرزو ہے۔

تمہارا دور افتادہ چچا

گمنام قربان علی

مورخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ

برطانیہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء

خودی

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صبر اسرئیل
غلاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل ظلیل
فریب خوردہ منزل ہے کارواں دور
زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رنیل
نظر نہیں تو مرے حلقہ غن میں نہ بیٹھ
کہ تکتہ ہائے خودی ہیں مثال مٹی اصل
مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت، کہاں حجاب و لیل!
اندھیری شب ہے جدا اپنے کالے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا ضلع لڑا قدیل
غریب و سادہ و رقیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسلمیل

(علامہ اقبال)

ہے؟ کون گورا ہے کون کالا؟ ایک بات اور، پاکستان
جا کر اس خاندان میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی تفصیل
میں نے ناموں کی حد تک قلم بند کی ہے۔ شکل و
صورت کے کوائف درج نہیں کیے جاسکتے۔

ہاں میاں! شجرہ تو کھویا گیا اب یہ خاندان جو بھی
کرے 'تھوڑا ہے۔ مگر سننا ہوں کہ دوسرے خاندانوں
والے اس سے بڑھ کر کر رہے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ
ابراہیم نے آنے میں چوری اور چری پیس پیس کر
ایک اور مل بنائی ہے! اور میاں فیض الدین نے کہ
یہاں پھٹے حالوں بھرتے تھے کالے پیسے سے
کوٹھیاں کھڑی کر لیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ
پاکستان میں سب ہی خاندانوں کے شجرے کھو گئے؟
عجب ثم العجب کہ ہم نے دیارِ ہند میں صدیاں
بسر کیں ہمیش کا زمانہ بھی گزرا، ادبار کے دن بھی
دیکھے۔ اس کی شان کے قربان حکومتیں بھی
کیں، محکوم بھی رہے۔ مگر شجرہ ہر حال میں حرا جاں
رہا، پر ادھر لوگوں نے پاؤں صدی میں اپنے شجرے
گم کر دیے۔ خیر خوش رہیں۔

کیا کیا لکھوں لکھنے کو بہت ہے مگر تم اس کم
لکھے کو بہت جانو۔ اپنی خیریت لکھو آنے کی اطلاع
دو۔ رقعہ تمام کرتا ہوں کہ اب نماز کا وقت ہو رہا
ہے۔ اس کے بعد مقدمے کے کاغذات ترتیب
دینے ہیں۔ کل پھر پیشی ہے۔ یہ چار سو سٹائیسویں
پیشی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز یہ بھی خوش اسلوبی
سے بھگائی جائے گی۔ شاید میں انہی پیشیوں کے
لیے زندہ ہوں ورنہ اب تمہارے بوڑھے چچا میں
کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ حتیٰ کہ جینے کی خواہش بھی باقی
نہیں۔ دنیا میں آ کر بہت کچھ دیکھا جو نہ دیکھنا تھا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

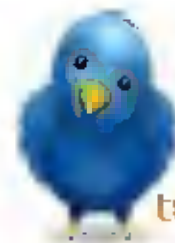
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

عظیم شخصیت

جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔
لیکن سچی بات یہ ہے کہ قائد اعظم کی سب سے بڑی صفت ان کی حقیقت پسندی ہے۔ وہ قوم کی صحیح قوت کو سمجھتے تھے۔ وہ ایسے جرئیں نہیں تھے جو فوج کی صحیح حالت اور قوت سمجھے بغیر اسے لڑوا اور مروا دیں۔ لیڈر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ کم قوت سے بڑا

قائد اعظم کی شخصیت اتنی بلند ہے کہ ہمارے اس کے ایک پہلو پر لکھنا خاصا مشکل ہے۔ ان کی دیانت، امانت، صداقت، غرض ہر بات اپنی جگہ مسلم ہے۔ مثلاً مسلم لیگ کے ریکارڈ میں سے ایسی چٹیں بھی ملی ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے حسابات درج ہیں۔ اگر کسی جلسے میں چائے پلائی گئی تو اس کا حساب بھی لکھا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ قائد اعظم کی راہنمائی میں مسلم لیگ کے کارکنان اور راہنماؤں میں دیانت اور امانت کا کیسا

مشہور ہستیوں سے پوچھا گیا سوال

آپ نے قائد کو کیسا پایا؟

دیانت و دلیری سے مجسم ہستی کے عظیم پہلو عیاں کرتے والے بیش قیمت جواب

منظور حسین عباسی



مقصد حاصل کر لے۔ قائد اعظم کا کمال یہی تھا کہ ہر موقع پر اتنی ہی قوت استعمال کرتے جتنی ضرورت ہوتی۔ انھیں جذبات پر بڑا قابو تھا۔ ان کی بے لاگ منطق ہی سے گاندھی جی کے بھرم میں فرق آیا۔ ذیل میں قائد اعظم کی شخصیت کے مختلف پہلو دکھانے والی تحریریں پیش خدمت ہیں

صحافت کی آزادی

یہ واقعہ یاد کر کے میرا سرا اظہار تشکر میں جھکتا اور احساس فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی میں ایک طویل گفتگو کے موقع پر انھوں نے میرے اخبار کے افتتاحیہ مقالوں میں آزادی رائے کی ضرورت پر زور دیا۔ میں نے ایک مضمون لکھا جسے چھپے لفظوں میں قائد اعظم پر اعتراض سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس کا مطالعہ فرما چکے تھے۔ اسی روز شام کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا: ”میں تمہارا مضمون پڑھ چکا“

کچھ دیر بعد ان کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلے جنہیں میں تمام صحافیوں کے لیے آزادی کا منشور سمجھتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: ”کسی موضوع پر غور کرنے اپنے دل میں فیصلہ کرو۔ اگر تم اس نتیجہ پر پہنچ چکے کہ ایک خاص نظریہ یا اعتراض پیش کرنا ضروری ہے تو بالکل وہی لکھ ڈالو جو حقیقتاً تم نے محسوس کیا۔ کبھی پس و پیش نہ کرو اس خیال سے کہ کوئی ناراض ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اپنے قائد اعظم کی ناراضی کی بھی پروا نہ کرو۔“

اس سے زیادہ قدر و منزلت ہمارے پیشے کی اور کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقتاً ایک عظیم المرتبت ہستی ہی یہ الفاظ ادا کر سکتی ہے۔ (الطاف حسین صدیقی)

پہلے کام پھر طعام
محمد علی جناح دوسروں سے کام لینے میں سخت غیر واقع ہوئے تھے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بھی اتنا ہی رگیدتے جتنا کہ دوسروں کو! اگر کچھ کرنا ہے تو اسے جلد کرنا چاہیے، ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ کھانا آرام اور نیند ان سب کو اپنی ہاری کا انتظار کرنا پڑتا۔ کام کو آگے بڑھانے کا جذبہ اور جوش ہی انھیں ٹھیک وقت پر کھانا کھانے یا آرام کرنے سے روکتا تھا۔ اسی امر نے بعد کے برسوں میں ان کی بدسالی قوت کو اتنی جلد مضحل کر دیا کہ وہ اسے بحال نہ کر سکے۔

اپنے کمزور جسم پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنے سے بالخصوص اپنی زندگی کے چند آخری برسوں میں وہ دق کا شکار ہو گئے جس نے انھیں قبر تک پہنچا دیا۔ مجھے یاد ہے ان کے ملازم آ کر انھیں دوپہر یا رات کے کھانے کا کہتے۔ تب وہ کسی مسئلے پر بحث کر یا کوئی مسودہ یا خط لکھوا رہے ہوتے۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ان کی بہن فاطمہ جناح اپنے بھائی کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتیں اور آ کر کہتیں کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن وہ بہت اخلاق سے جواب دیتے ”بس چند منٹ اور“ یا ”جاؤ شروع کرو میں ذرا دیر میں تمہارے ساتھ شریک ہو جاؤں گا۔“ انھیں پہلے اپنا کام کرنا ہوتا تھا اور بعد میں کھانے یا کسی اور چیز کا خیال کرتے۔ (انجی اے اصفہانی)

بیمنی کلاتھ ہاؤس میں دعوت

قصہ یوں ہے کہ دہلی میں دوران ملاقات سینٹہ حاجی محمد صدیق مالک بمبئی کلاتھ ہاؤس نے قائد اعظم سے عرض کی کہ اب کے آپ لاہور تشریف لائیں تو

کے سیٹ لے آنا۔ فرمائش کے مطابق دوسرے دن صبح دس بجے ہم ممدوٹ والا پہنچے۔ بنوں کے سیٹ جو ہم ساتھ لائے تھے ان کو ایک نظر دیکھا اور چار سیٹ پسند کر کے الگ رکھ لیے۔ باقی واپس کر دیے۔ کہنے لگے، بل لاؤ۔ بل کے لیے وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اصرار کر چکے تھے۔

چونکہ ہم بل نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے بل منول سے کام لیتے رہے مگر شاید وہ ہمارا ارادہ سمجھ گئے۔ آج بل کے لیے قدرے سخت اور درشت لہجے میں مطالبہ کیا، کہنے لگے ”میں ادھار لینے کا عادی نہیں۔ بل لاؤ۔ ورنہ کپڑے واپس کر دیے جائیں گے۔“

میں نے ٹیجر سے کہا کہ یہاں نال منول سے کام نہیں چلے گا۔ بل دینا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ سارے کپڑے لوٹا دیں گے۔ ٹیجر نے خاصا رعایتی بل بنا کر دیا جو آدھے سے بھی کم قیمت پر مشتمل تھا۔ میں نے جا کر خدمت میں پیش کر دیا جسے دیکھ کر مسکرائے کہنے لگے: ”یہ بل مناسب نہیں، تم نے قیمتیں جہاں بوجھ کر کم لگائی ہیں۔“ میں نے کہا ٹیجر نے آپ کو خاص رعایت دی ہوگی۔ کہنے لگے: ”رعایت کی اور بات ہے۔ یہ رعایت سے مختلف صورت ہے۔ تم بل درست کر کے لاؤ۔“ یہ کہہ کر بل واپس کر دیا۔ اس کے بعد میں نے جنن والے کا بل پیش کیا جو دس روپے کی مالیت پر مشتمل تھا۔

بل دیکھ کر فرمایا: ”بھئی ولو۔ ایک سیٹ میں تو تین تین جنن کم ہیں لیکن بل تم نے پورے کا بنا دیا۔“ یہ کہنا درست تھا۔ ایک سیٹ میں جنن کم تھے۔ لیکن بل میں نے اس خیال سے دیکھا تھا۔ دکاندار نے بھی اس کی پروا نہ کی تھی۔ بہر حال بل کو درست کی لیے واپس لانا پڑا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں کئی دنوں

ہماری دکان کو بھی اپنے قدم مہنت لزوم سے زینت بخشیں۔ قائد اعظم جو مسلمانوں کی بہتری و بہبودی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ لاہور میں مسلمانوں اور وہ بھی مسکن برادری کی ایک شایان شان دکان ہے۔ فرمانے لگے، اب کے لاہور آیا تو تمھاری دکان بھی ضرور دیکھوں گا۔

چنانچہ اپریل ۱۹۴۳ء میں جب وہ لاہور تشریف لائے تو ایک دن بارہ بج کر دس منٹ پر آنے کا وعدہ کیا۔ دکان کے نیچر مسٹر محمد عمر نے دس کروڑ مسلمانوں کے اس عظیم الشان قائد کے استقبال کے لیے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا، کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دکان زینت کپڑوں سے لہجہ کی طرح سجائی گئی۔ شاندار چائے پارٹی کا انتظام کر کے دیگر مسلمان تاجروں کو بھی بلا لیا گیا۔ معائنے کے دوران انھوں نے چائے کا ڈر اور پیو ریٹشم کے کپڑے بھی پسند فرمائے جو ہم نے انھیں تحفہ پیش کیے۔

لیکن انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر ان کپڑوں کا بل پیش کر دیا جائے تو وہ لے لیں گے کیونکہ کپڑے انھیں پسند ہیں۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ انھیں بطور تحفہ قبول کر لیں مگر وہ کسی طرح نہ مانے۔ آخر بل پیش کر دینے کے پختہ وعدے پر انھوں نے کپڑے رکھ لیے۔ ہم نے خواہش ظاہر کی کہ ایک اچکن ہم سے سلوائی جائے۔ وہ اس شرط پر رضامند ہوئے کہ درزی اچھا ہو اور تاپ ڈیوس روڈ پر ممدوٹ والا میں لیا جائے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ دکان پر تاپ نہیں دینا چاہتے تھے۔

دوسرے دن ماسٹر فیروز کوٹے کر میں قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تاپ سے فارغ ہو کر ہم واپس آنے لگے تو فرمایا کہ اچکن کے لیے حیدر آبادی بنوں

دو کہ تمہاری پیش کش مسترد کر دی گئی ہے۔ حسن تمہارا مقابلہ کرے گا۔“

عبدالرحمن صدیقی کو بھر کے لیے بھونچکا رہ گئے۔ پھر سننے اور عرض کیا: ”میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔“ اور چلے گئے۔ ہم عقبی برآمدے میں چلے آئے اور آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

قائد اعظم مجھ سے مخاطب ہوئے: ”میرے بچے! اُسے یہی جواب ملنا چاہیے تھا۔ سیاست میں اخلاق کی پابندی نئی زندگی میں اخلاقی اصولوں پر کاربند رہنے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اگر تم نے عوامی زندگی میں کسی غلط کام کا ارتکاب کیا تو ان لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے جو تم پر اعتماد کرتے ہیں۔“ (انج اے اصلہانی)

سفارشی رقعہ

قائد اعظم سے ملنے کے لیے رائے پور کا ایک انٹیشن ماسٹر دہلی آیا۔ وہ ان کے سیکرٹری سے ملا اور بتایا ”میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

سیکرٹری نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا: ”قائد اعظم ان دنوں بہت مصروف ہیں۔ اگر وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے وقت دیتے رہے تو پھر تحریک پاکستان جیسا عظیم کام کس طرح انجام دے سکیں گے۔“

سیکرٹری نے اُسے واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا، لیکن انٹیشن ماسٹر مجھ سے ملا اور بتایا ”میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ قائد اعظم تک پہنچنے کے سلسلے میں تم ہی کچھ میری مدد کرو۔“

میں نے اسی دن قائد اعظم سے تذکرہ کیا اور انھیں بتایا ”انٹیشن ماسٹر کو محض اس لیے ترقی نہیں دی جا

تک سوچنا رہا کہ آخر کیا بات ہے کہ ایک طرف تو سیکرٹریں روپے کی رعایت کو بھی یہ شخص قبول نہیں کرتا۔ دوسری جانب تین بنوں کے آٹھ آنے بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں؟ (دلی بھائی)

سیاست میں اخلاق

۱۹۴۶ء کا اوائل تھا۔ بنگال قانون ساز اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ میں مسلم جمہور آف کامرس کلکتہ کی طرف سے امیدوار تھا۔ نامزدگی کی تاریخ سے صرف دو روز پہلے جمہور کے ایک رکن نے اپنی نامزدگی کے کاغذات داخل کرادیے۔ جمہور کے پرانے ارکان اور راجنما سب شہتا گئے۔ انھوں نے اُسے سمجھایا بھایا اور دباؤ بھی ڈالا۔ مگر اُس نے کاغذات واپس لینے سے انکار کر دیا۔

ان دنوں قائد اعظم کلکتہ میں میرے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم گاڑی میں میرے کمرے واپس آئے تو عبدالرحمن صدیقی جو ایک آزمودہ سیاست دان اور میرے دیرینہ دوست تھے دوڑے دوڑے آئے اور بتایا کہ وہ مخالف سے ملے تھے۔ بس چوڑی گفتگو کے بعد وہ شخص کاغذات نامزدگی واپس لینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ شرط یہ رکھی کہ جو وہ صد بچاس روپے نہیں کے جمع کرائے ہیں اُسے دے دیے جائیں۔

قائد اعظم اپنے کسی خیال میں مستغرق تھے۔ انھوں نے بات نہ سنی۔ صدیقی سے فرمایا کہ وہ اپنے الفاظ دہرائیں۔ صدیقی صاحب نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح قائد اعظم کے ملامت بھرے الفاظ ہمارے دل و دماغ میں پیوست ہو گئے:

”روپیہ ادا کر دو گے؟ ایک امیدوار کو بٹھانے کے لیے بالواسطہ رشوت؟ نہیں، کبھی نہیں۔ اُسے جا کر یہ کہہ

رہی کہ وہ مسلمان ہے۔ حالانکہ وہ امتحان بھی پاس کر چکا اور اصولی طور پر اسے بی گریڈ ملنا چاہیے۔“

قائد اعظم اسی وقت اس شخص سے ملے۔ ریلوے کے ایک اعلیٰ انگریزی عہدیدار کو رقعہ لکھ کر اس دھاندلی کی طرف توجہ دلائی۔ فوری کارروائی ہوئی اور پندرہ منٹ کے اندر اندر اسے بی گریڈ دیے جانے کے احکامات جاری ہو گئے۔

انٹیشن ماسٹر خوشی خوشی کاغذ پر پھلوں کا ٹوکرا لادے قائد اعظم کا شکریہ ادا کرنے واپس آیا۔ میں نے جب قائد اعظم کو اطلاع دی تو انھوں نے محض اس لیے غصے سے انکار کر دیا ”میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی شخص مجھ سے کہے میں آپ کا ممنون ہوں یا آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“ البتہ قائد اعظم نے اسے یہ پیغام ضرور بھجوایا: ”خوب محنت سے کام کرو۔“

(محمد حنیف آزاد)

گورنر جنرل کے منصب کا خیال

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب قائد اعظم علیل تھے اور کوسٹ میں زیر علاج۔ جب ہم نے محسوس کیا کہ کوسٹ میں ان کا قیام خطرے سے خالی نہیں تو میں نے اصرار کیا کہ وہ کراچی تشریف لے چلیں۔ لیکن ہر بار انھوں نے تجویز رد کر دی۔ رات کو میں نے محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی۔ میرے اصرار پر انھوں نے بتایا کہ قائد اعظم بیماری کی حالت میں گورنر جنرل ہاؤس واپس نہیں جانا چاہتے۔ پھر انھوں نے لمبر کے بارے میں میری رائے پوچھی۔ میں نے عرض کیا ”وہ بھی اچھی جگہ ہے۔ لیکن وہاں قیام کا مسئلہ ہوگا۔“

لمبر میں نواب بہادرپور کی کوٹھی تھی جس میں

قائد اعظم کے قیام کا اہتمام ہو سکتا تھا۔ وہاں ان دنوں دلی عہد صاحب فروکش تھے۔ تاہم ان سے کوٹھی خالی کرانا چنداں مشکل نہ تھا۔ طے یہ پایا کہ پہلے قائد اعظم کو رضامند کر لیا جائے۔ کیونکہ وہ ۳۰ ستمبر کو لندن سے کراچی آرہے ہیں۔

۱۲/۲۸ اگست کی صبح میں نے قائد اعظم کی خدمت

میں تمام صورت حال رکھی اور امیر بہادرپور کو ہمارا رسالہ کرنے کی اجازت چاہی۔ میری بات سن کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور قدرے توقف کے بعد فرمایا:

”آپ نے سنا ہوگا پہلے زمانے میں جب کوئی

دکیل ہائی کورٹ کا جج بن جاتا تو کلبوں اور نجی محفلوں میں جانا ترک کر دیتا تھا مبادا اس کی غیر جانب داری پر اثر پڑے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے گورنر جنرل

کے اعلیٰ منصب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ

ہم ضرورت مند ہیں لیکن میں اپنی ذات کی خاطر اس

عظیم منصب کی عظمت خاک میں نہیں ملا سکتا۔ اس

لیے تار دینے کی اجازت دینے سے معذور ہوں۔“

(کنٹرول ایلیمنٹیشن)

پاکستان میں کوئی بادشاہ نہیں

دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔

ایک خوشامدی نے نعرہ لگایا: ”شاہ پاکستان زندہ باد!“

قائد اعظم بجائے خوش ہونے کے غورابوئے:

”دیکھیں! آپ لوگوں کو اس قسم کی باتیں نہیں کرنی

چاہئیں۔ پاکستان میں کوئی بادشاہ نہیں ہو گا، وہ

مسلمانوں کی جمہوریہ ہوگی جہاں سب مسلمان برابر

ہوں گے۔ کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہوگی۔“

(نواب محمد یامین خان)

اعتماد کا ووٹ

مجھے دو وقت اچھی طرح یاد ہے جب مسلمانوں نے چاہا کہ مسلم لیگ کے صدر کا سالانہ انتخاب ختم کر کے قائد اعظم ہی کو مستقل صدر بنانے کی قرارداد منظور کرائی جائے۔ مگر انھوں نے جواب دیا:

”نہیں۔ سالانہ انتخابات نہایت ضروری ہیں۔ مجھے ہر سال آپ کے سامنے آ کر آپ کے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا چاہیے۔“ (یگم لیاقت علی خان) میں نے بہت کچھ سیکھا

قائد اعظم کے ساتھ بارہ برس کی رفاقت میں میں نے چند نہایت اہم باتیں سیکھی ہیں۔ اول یہ کہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہو جس پر پوری طرح عمل کرنے سے قاصر رہوں۔ دوسرے اپنے ذہنی تعلقات و رجحانات کو قومی مفاد میں خلل انداز نہ ہونے دو۔ اور اس معاملے میں دوسروں کے کہنے کی قطعاً پروا نہ کرو۔ تیسرے اگر تم سمجھتے ہو کہ کسی بات میں تم رات ہی پر ہو تو دشمن کے آگے خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو ہرگز نہ جھکو۔ (لیاقت علی خان)

جنگ

ہم طلبہ سے دوران گفتگو انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ قوم کی زندگی اور ترقی کے لیے ضروری ہے ہم میں سے ہر ایک بلا لحاظ مرتبہ و حیثیت خود کو قوم کے مفاد کا نگہبان و محافظ سمجھے۔ اگر کسی کو ایسی حرکت کا مرتکب پائے جس سے قوم یا ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اپنا آرام و سہولت نظر انداز کر کے مرتکب کی گردن پکڑ لے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنا ایک واقعہ بھی بیان کیا۔

فرمایا: ”بدلتوں پہلے کی بات ہے میں ایک دفعہ سفر کر رہا تھا۔ اُن دنوں بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے۔

میں نے درجہ اول کا ٹکٹ خریدا۔ مگر وہ سہواً ملازم کے پاس رہ گیا۔ جب میں منزلی مقصود پر گاڑی سے اترنا تو مجھے ٹکٹ نوکر کے پاس چھوڑ آنے کا احساس ہوا۔ میں ٹکٹ کلکٹر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں ٹکٹ بھول آیا ہوں۔ تم مجھ سے کرایہ وصول کر لو۔ میں خریدے ہوئے ٹکٹ کے داسوں کی واپسی کا مطالبہ کر لوں گا۔“

ٹکٹ کلکٹر نے کہا: ”تم مجھے دو روپے دو اور چلے جاؤ۔“

اُس کا یہ کہنا تھا کہ میں وہیں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور کہا: ”تم نے میری جنگ کی ہے۔ اپنا نام اور پتا بتلاؤ۔“ لوگ جمع ہو گئے اُن میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کئی ایک نے مجھ پر فخر سے بھی چست کیے مگر میں وہاں سے نہ ہٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسافروں کو لوٹنے والا بابو برخاست ہو گیا۔“ (عزیز احمد)

کم کھاؤ آرام پاؤ

مسٹر محمود حسن ایک دن محمد علی جناح کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ جناح نے حسب معمول بہت تھوڑا سا کھانا کھایا۔ اُس کے بعد چھڑی اٹھا کر اسے اپنے ہاتھوں سے پہانے لگے۔ (اس عادت سے اُن کے اکثر دوست واقف ہوں گے۔) مسٹر محمود جواب تک کھانے میں مصروف تھے کچھ گفت سی محسوس کرنے لگے اور بولے: ”آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔“

جناح نے جواب دیا: ”دنیا والے اسی لیے تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ کھاتے بہت ہیں۔“ (مطلوب الحسن سید)





انکشافات

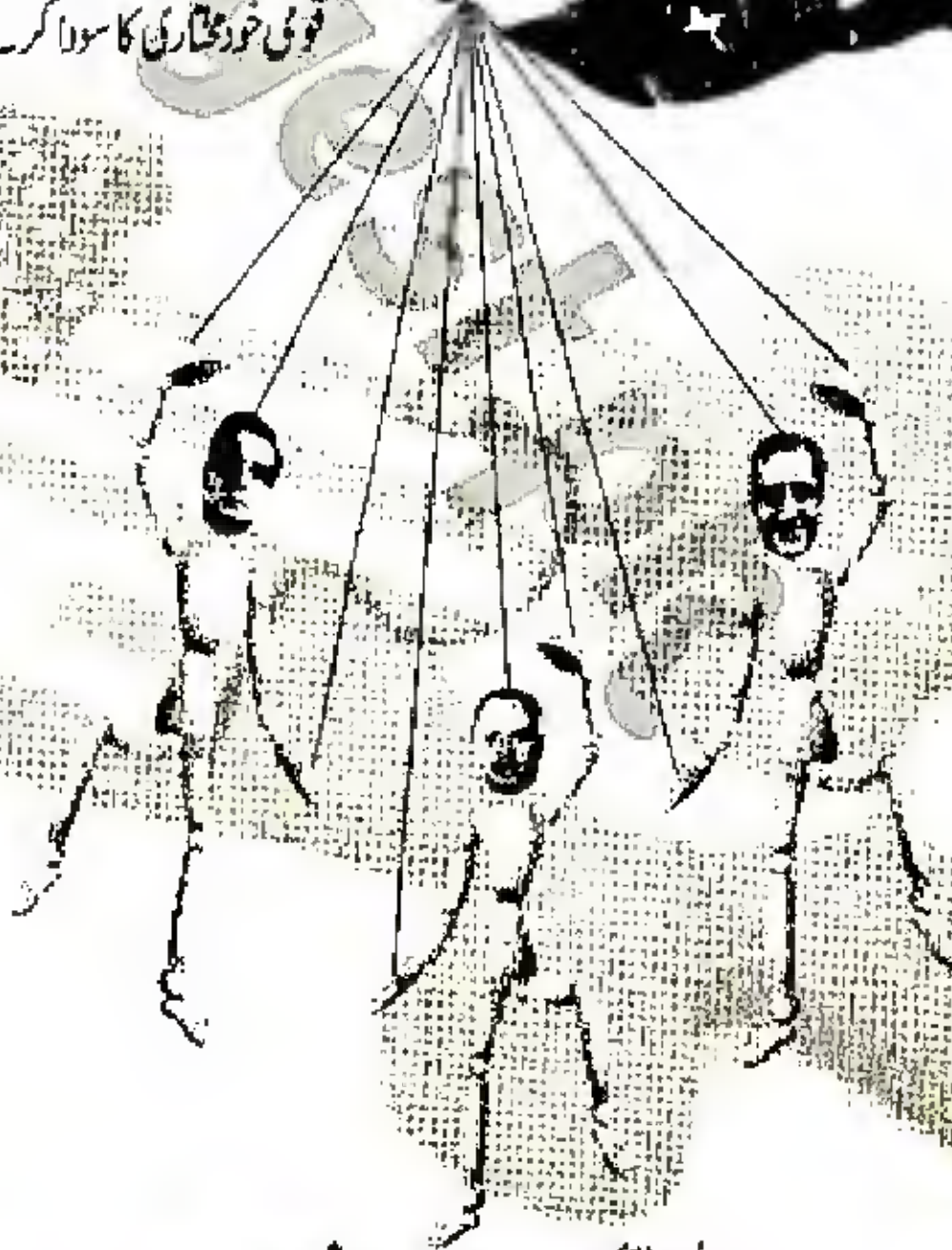
آزاد سے غلام مملکت بننے تک کی ہوشربا داستان

پاکستانی حکمران

امریکا کی کٹہ پتلی کیسے بنے؟

قیوم نظامی

عمیاری و چالاک کی سے متصف ان حربوں اور
ہتھکنڈوں کی حیرت ناک کتھا جنہیں اپنا کر
امریکیوں نے ارض پاک کے نااہل سول و عسکری
حکمرانوں کو اپنے دام فریب میں پھانسا اور انہیں
قومی خود مختاری کا سودا کرنے پر مجبور کر دیا



اگست 2014ء

97

اردو ڈائجسٹ

۳ مئی ۱۹۵۰ء کی بات ہے جب پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان امریکا پہنچے۔ تب ہوائی اڈے پر امریکی صدر ہیری ٹرومین نے بنفس نفیس وزیراعظم پاکستان کا شاندار استقبال کیا۔ بعد ازاں نیویارک کی گلیوں میں لیاقت علی خان کو کھلی گاڑی میں گھمایا پھر لایا گیا۔ تب ہزار ہا امریکی شہریوں نے ان کا زبردست خیر مقدم کیا اور بڑے اشتیاق سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے سربراہ کو دیکھا۔

لیکن صرف ۶۴ برس میں کایا پلٹ چکی۔ آج پاکستانی حکمران امریکی صدر سے ملنے کے لیے خٹیں ترے کرتے ہیں، تب بمشکل انھیں ملاقات کا وقت ملتا ہے۔ اس وقت بھی پاکستانی حکمران امریکی صدر کے سامنے بھیگی بلی نظر آتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ انقلاب کیونکر آیا کہ جس پاکستان کو امریکی قندور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آج اسی کو ”کرائے کا گھر“ اور ”ریٹریور کتا“ (Retriever dog) کے القاب دیتے ہیں۔ (یہ کتا شکار اپنے مالک کے پاس لاتا ہے۔) ذیل میں اسی کایا پلٹ کی چشم کشا حیرت انگیز اور دلچسپ داستان پیش ہے۔

☆ ☆

۱۹۴۰ء تک امریکا کے قونصل خانے کلکتہ، ممبئی، مدراس اور کراچی تک محدود تھے۔ دارالحکومت دہلی میں امریکا کا کوئی سفارت خانہ نہیں تھا۔ البتہ پرل ہاربر پر حملے کے بعد امریکا نے ہندوستان کی جانب توجہ مرکوز کر دی۔ نومبر ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے ساتھ براہ راست سفارتی تعلقات قائم کر کے دہلی میں اپنا سفارت خانہ قائم کر لیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد لاہور منظور ہوئی،

تو امریکی قونصل خانہ کلکتہ نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۰ء کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نام ایک رپورٹ ارسال کی جس میں قرارداد لاہور کا ذکر یوں کیا:

”پاکستان کا مطالبہ ملٹوی یا اسے ایک طرف رکھ دیا جائے مگر قرارداد پاکستان کو نظر انداز کرنا بڑی غلطی ہو گی۔ یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس قرارداد کی اہمیت کم ہو سکتی ہے۔“

نیویارک ٹائمز کے نمائندے ہربرٹ میتھیوز (Herbert Mathews) نے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں بھارت کا تفصیلی دورہ کیا۔ پھر مسلم لیگ کی مقبولیت اور قائداعظم کے مستقبل پر سلسلہ وار مضامین تحریر کیے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے مضمون کا عنوان تھا:

”Jinnah holds the key to peace“

(ہندوستان میں امن کی کنجی جناح کے پاس ہے۔)

قائداعظم محمد علی جناح اور امریکا

قائداعظم آئین اور جمہوریت پر پختہ یقین رکھنے والے مسلم مکر لبرل سیاسی راہنما تھے۔ وہ کافی عرصہ برطانیہ میں مقیم رہے۔ ان کی نجی زندگی پر مشرقیت کے بجائے مغربیت کا رنگ غالب تھا۔ شاید اسی بنا پر امریکا اور برطانیہ ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

۱۳/ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم دہلی سے کراچی روانہ ہوئے تو بھارت میں امریکی سفیر نے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ قائداعظم نے امید ظاہر کی کہ امریکا پاکستان کے مختلف نوعیت کے مسائل حل کرنے میں مدد کرے گا۔ اسی لیے ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کابینہ اجلاس میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

بھیجا۔ کچھ عرصے بعد امریکا میں پاکستان کے پہلے سفیر، ایم اے ایچ اصفہانی نے پاکستان کی پانچ سالہ معاشی اور دفاعی ضروریات کے لیے ۲ ارب ڈالر امریکی امداد کی درخواست کر دی جسے امریکا نے مسترد کر دیا۔ بعد ازاں صرف ایک کروڑ ڈالر کی امداد دی گئی۔

ابتدائی دنوں میں پاکستان سنگین مالی مشکلات کا شکار تھا۔ حکومت پاکستان کے پاس فوج اور سرکاری ملازمین کو تنخواہیں دینے کے لیے بھی سرمایہ نہیں تھا۔ نومولود پاکستان کو روس اور بھارت کی جانب سے بھی خطرات لاحق تھے۔ لہذا مسلم لیگ کے مرکزی رہنما امریکی سفارت کاروں پر مالی امداد کے لیے زور ڈالتے رہے۔

قائد اعظم کو پاکستان کی مالی مشکلات کا شدید احساس تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ ”فلک اسٹاف ہاؤس“ امریکی سفارت خانے کو فروخت کرنے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے کراچی میں امریکی سفیر، ایلنگ (Alling) اور اس کی اہلیہ کو ساحل سمندر پر اپنی کانچ میں چائے کی خصوصی دعوت دی۔ فاطمہ جناح بھی ان کے ساتھ تھیں۔ قائد اعظم نے امریکی سفیر کو ترغیب دی کہ امریکا سفارت خانے کے لیے فلک اسٹاف ہاؤس خرید لے، مگر وہ تیار نہ ہوا۔

امریکا کسی کا دوست نہیں

ان ٹھوس واقعات سے ظاہر ہے کہ امریکی انتہائی مشکل حالات میں بھی پاکستان سے تعاون پر آمادہ نہیں

”پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اور کیونزم اسلام کی سرزمین پر نہیں چپ سکتا۔ لہذا ظاہر ہے کہ ہمارے مفادات روس کے بجائے دو عظیم جمہوری ملکوں، برطانیہ اور امریکا سے وابستہ ہیں۔“ (Minutes of Cabinet discussion Sep 9, 1947 (67/CF/47, NDC)

قائد اعظم کے اس پالیسی بیان پر خارجہ پالیسی پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ گویا مذہب ہماری خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ ٹھہرا جس پر آج تک پاکستان کا مزین نظر آتا ہے۔ پاکستان کو اپنے استحکام کے لیے مالی تعاون کی ضرورت تھی جو امریکا پوری کر سکتا تھا۔ اسی لیے پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد (بعد میں گورنر جنرل) نے آزادی کے



دو ہفتے بعد امریکا کے سفارت کار، چارلس لیویس (Charles Lewis) سے امریکی امداد کے لیے براہ راست درخواست کر دی۔ امریکی ریکارڈز کے مطابق امریکا نے پاکستان کی بروقت امداد سے گریز کیا۔ قائد اعظم کا تاثر یہ تھا کہ افغانستان کے مطالبہ ”پنجتوںستان“ کو روس کی سرپرستی حاصل ہے۔ انھوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کابینہ کے پہلی اجلاس میں کہا کہ صوبہ سرحد کا تحفظ صرف پاکستان کا اندرونی مسئلہ نہیں بلکہ یہ دنیا کے لیے بھی تشویش کا معاملہ ہے۔ قائد اعظم نے اسی اجلاس میں فرمایا کہ روس دنیا کا واحد بڑا ملک ہے جس نے پاکستان کی آزادی کے موقع پر پیغام نہیں



جناب قیوم نظامی ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور سیاسیات کر چکے۔ ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء میں پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ مارشل لا کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۹۳ء میں وزیر مملکت بنائے گئے۔ آپ کا شمار سینئر کالم نویسوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔

زیر مطالعہ مضمون آپ کی کتاب ”آزادی سے غلامی تک“ سے اخذ شدہ ہے۔ اس قیمتی کتاب میں پاکستان امریکا تعلقات کی خفیہ کہانی مستند حوالوں کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ یہ روداد عیاں کرتی ہے کہ امریکی حکومت نے بڑی چالاکی سے پاکستانی حکمرانوں کو مادی ترغیبات دے کر پھانسا اور انھیں قومی آزادی گروہی رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس دور کتاب میں وہ حربے اور ہتھکنڈے تفصیل سے بیان ہوئے ہیں جن کے ذریعے امریکی سامراج نے ہماری آزادی کو غلامی میں بدل ڈالا۔ پاکستانیوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ کتاب جوائنٹنگٹن ۲۵ ریواڈ کارڈز والا ہور فون نمبر: ۶۶۰-۷۷۷-۳۷۳۰ نے خوبصورت انداز میں شائع کی ہے۔ اقتباسات کتاب، مصنف اور ناشر کے شکریے کے ساتھ پیش خدمت ہیں۔

مارچ ۱۹۶۸ء تک جاری رہا۔ اس دوران بھارت کو کشمیر میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا موقع مل گیا۔ کاش ہمارے بانی راہنما امریکا کی جانب دیکھنے کے بجائے اپنے مسائل پر بھروسہ کرنا سیکھتے!

بعض مورخین کے مطابق قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے قومی خود مختاری اس وقت متاثر ہوئی جب امریکا سے ۲ ارب ڈالر کی معاشی امداد کے لیے درخواست کی گئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ امریکا واحد ملک تھا جس نے پاکستان کی تقریب آزادی میں شرکت کے لیے سرکاری وفد بھیجا۔ بھارت نے پاکستان کے مالی اثاثے روک رکھے تھے۔ مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کے بعد صرف ۷۷ فیصد حصہ ادا کیا گیا جو پاکستان کی بنیادی ضروریات کے لیے ناکافی تھا۔ قائد اعظم مسلمانوں کو ہندوؤں کی بلا دستی سے آزاد کرانا چاہتے تھے جب کہ امریکا کو جنوبی ایشیا میں اسکی فوج کی ضرورت تھی جو کیونزیم کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ قائد اعظم اور امریکا کی سوچ حسن اتفاق سے ایک ہو

ہوا۔ اسے شاید یقین نہ تھا کہ پاکستان اپنی آزادی برقرار رکھ سکے گا۔ امریکا نے پاکستان کو صرف اس وقت امداد دی جب اپنے قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھا۔ دوست وہ ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے مگر امریکا اس اصول کا قائل نہیں۔ وہ صرف اپنی ضرورت کے لیے دوسرے کے کام آتا ہے۔

بہر حال پاکستان کے مرکزی راہنما امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مختلف جتن کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان امریکی سفارت خانہ کے محلے کو اپنے گھر دعوتوں پر بلاتے۔ رات گئے تک ان کی تواضع کرتے اور ان کا موسیقی سے دل بہلانے کے لیے خود ڈرم بجاتے۔ (حوالہ: The U.S

and Pakistan: Dennis Kux صفحہ 26)

جب بھارت نے کشمیر میں اپنی افواج داخل کیں اور پاک بھارت جنگ چھڑی تو امریکا نے پاکستان سے تعاون کرنے کے بجائے ۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو دونوں ممالک کی فوجی امداد روک دی۔ اس پابندی کا نفاذ ۲۹

گئی۔
لیکن تب تک عالمی معیشت پر بالادستی اور دنیا کے
ذخائر پر کنٹرول پانا امریکا کا بڑا مقصد بن چکا تھا۔

امریکا نواز پاکستانی راہنما

۱۹۴۸ء میں امریکا دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ مسلم
ایک کے اکثر مرکزی راہنما برطانوی یونیورسٹیوں کے
تعلیم یافتہ اور امریکا نواز تھے۔ امریکا روس کے ساتھ
سرد جنگ کی بنا پر جنوبی ایشیا کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔
پاکستان جنوبی ایشیا کا اہم ملک ہے جو روس اور چین
سے جغرافیائی طور پر قریب ہونے کے علاوہ مشرق وسطیٰ
پر بھی اثر انداز ہونے کی
صلاحیت رکھتا ہے۔ لہذا
امریکا اپنے مخصوص
مذاہبات کے تحت
پاکستان میں گہری دلچسپی
لینے لگا۔

پاکستانی لیڈروں کو بھی
یقین تھا کہ امریکا ہی
لو مولود پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں معاون
ہو سکتا ہے۔ امریکا نے مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی
اسٹریٹجک اہمیت کا اندازہ لگایا۔ جب امریکی افواج کے
سربراہ جوائنٹ چیفس آف اسٹاف نے لاہور اور کراچی
کے بارے میں تحریر کیا:

”کراچی اور لاہور کی اسٹریٹجک اہمیت یہ ہے کہ
یہ علاقے روس کے خلاف فضائی حملوں کے لیے اڈے
اور فوجی مرکز بن سکتے ہیں۔ یہاں سے مشرق وسطیٰ کے
تیل والے علاقے بھی قریب ہیں۔“

امریکی صدر ٹرومین نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں بھارت
کے وزیر اعظم نہرو کو امریکا کے دورے کی دعوت دی۔

امریکا نے عالمی سیاست میں برطانیہ کو جو نیئر
ساتھی تسلیم کر لیا۔ چنانچہ دنیا پر بالادستی قائم رکھنے کے
لیے امریکا اور برطانیہ
مفاہمت کے ساتھ
پالیسیاں بنانے لگے۔
سامراجی مذاہبات کو تحفظ
دینے کے لیے ضروری
ہے کہ ”عالمی خطرے“ کا
پروپیگنڈا کیا جائے تاکہ
دوسرے ملکوں میں فوجی
مداخلت کا جواز پیدا ہو سکے۔



چنانچہ اسی ”خطرے“ کو ہوتا ہوا امریکا ۱۹۴۵ء
سے دنیا کے مختلف ممالک میں فوجی مداخلت کرنے لگا
جس کا مقصد دنیا کو امریکی کمپنیوں کے لیے محفوظ بنانا،
سیاسی اور معاشی بالادستی میں اضافہ کرنا اور ایسی طاقتوں
کو روکنا تھا جو مستقبل میں دنیا کی سہرا پاور کے لیے
خطرے کا باعث بن سکیں۔

”عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ“ بھی اسی
حکمت عملی کا حصہ ہے جو نائن ایون سے پہلے امریکی
بالادستی کو مستحکم بنانے کے لیے تشکیل دی گئی۔ اسکاٹ
لینڈ کا اخبار سنڈے میرلڈ اس خفیہ بلیو پرنٹ کا انکشاف

موقع مل گیا۔

حالات کا جبر

۳ مئی ۱۹۵۰ء کو امریکی صدر ٹرومین اور اس کی کابینہ کے ارکان نے لیاقت علی خان اور ان کی بیگم کو ہوائی اڈے پر خوش آمدید کہا۔ امریکی صدر نے اسی شام بلیمئر ہاؤس میں وزیراعظم پاکستان کو سرکاری ڈنر دیا۔ وہیں ایک رپورٹر نے سوال کیا کہ پاکستانی وزیراعظم کتنے سائبر کی فوج رکھنا چاہتے ہیں؟ لیاقت علی نے جواب دیا:

”اگر آپ کا ملک ہماری سرحدوں کی سلامتی کی ضمانت دے ڈالے تو میں فوج ہی نہیں رکھوں گا۔“

(نیویارک ٹائمز ۵ مئی ۱۹۵۰ء: Kux، صفحہ: 35)

یہ حالات کا جبر تھا یا مسلم لیگی راہنماؤں کی بے وقوفی کہ وہ قومی سلامتی کی ضمانت امریکا سے مانگتے رہے۔ بہر حال لیاقت علی خان نے اپنی تقریروں اور پریس کانفرنسوں میں پاکستان کا مقدمہ بڑی مہارت سے پیش کیا اور امریکی رائے عامہ کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔

کوریا کی جنگ کے دوران پاکستان نے امریکا کو مشروط فوجی تعاون کی پیش کش کی۔ لیاقت علی خان نے پاک فوج کا ایک ڈویژن کوریا بھیجنے پر رضامندی ظاہر کی بشرطیکہ امریکا مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت اور کشمیر میں شیخ عبداللہ کے دھاندلی پر مبنی انتخابات کو تسلیم نہ کرے۔ مگر امریکا، بھارت اور افغانستان کو ناراض کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پاکستان کوریا میں جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے غیر مشروط تعاون کرے۔ لیکن لیاقت علی خان تنازع کشمیر کی موجودگی میں پاک فوج کوریا بھیجنے کا نازک فیصلہ

پاکستانی لیڈر قدرتی طور پر اس امریکی فیصلے سے بڑے پریشان ہوئے۔ لیاقت علی خان تہران کے دورے پر تھے۔ پاکستان کے سفیر، غضنفر علی خان نے روسی سفارت کار کو مطلع کیا کہ لیاقت علی خان روس کا دورہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ماسکو نے پانچ دن کے اندر اسائن کی جانب سے لیاقت علی خان کے نام روس کا دورہ کرنے کا دعوت نامہ بھجوا دیا۔ لیاقت علی خان نے فوری طور پر دعوت نامہ قبول کر لیا تاہم دورے کی تاریخ پر اتفاق نہ ہو سکا۔ پاکستان نے روس کے لیے اپنا سفیر بھی نامزد کر دیا مگر روسی حکومت نے نامزدگی کی منظوری میں تاخیر کی۔

باخبر ذرائع کے مطابق پاکستان اور روس دونوں نے باہمی تعلقات کے ضمن میں بروقت اور اک کا مظاہرہ نہ کیا۔ بعض مورخین کے مطابق روس کا دعوت نامہ دراصل امریکا پر دباؤ ڈالنے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ امریکا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ امریکی سفارت کاروں نے پاکستان کی وزارت خارجہ کو اشارے دیے کہ لیاقت علی خان کے روسی دورے سے برطانوی و امریکی عوام میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔

آخر امریکی صدر ٹرومین نے ۷ نومبر ۱۹۴۹ء کو وزیراعظم پاکستان کے نام امریکی دورے کا دعوت نامہ جاری کر دیا۔ روسی لیڈروں کا خیال تھا کہ وزیراعظم پاکستان نے اپنے امریکا نواز وزیروں کے دباؤ پر روس کا دورہ ترک کیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اگر لیاقت علی خان روس کا دورہ کر لیتے تو امریکا کا پاکستان کے متعلق رویہ متوازن ہوتا۔ امریکا پر غیر معمولی انحصار کی بنا پر ہی امریکا کو پاکستان کے اندر امریکی اثر و رسوخ بڑھانے کا

کرنے سے قاصر تھے۔ لہذا فوجی تعاون ممکن نہ ہو سکا۔ امریکا کشمیر اور پنجتوستان کے مسئلے پر واضح موقف اختیار نہ کر سکا۔ اس کا رویہ شاطرانہ رہا۔ وہ پاکستان کے تعاون کی پوری قیمت ادا کرنے سے گریز کرتا تھا۔ فروری ۱۹۵۱ء میں جنوبی ایشیا کے امریکی سفیروں کا ایک اجلاس کولمبو میں ہوا۔ اسی میں طے پایا کہ پاکستان، ایران اور ترکی خطے میں امریکی اسٹریٹجک مفادات کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ لہذا امریکا کو اولین فرصت میں پاکستان کے ساتھ "مفاہمت" کرنی

امریکی اہلکار وارن (Warren) سے ملاقات کی جو ناخوشگوار رہی۔ وارن نے مشرق وسطیٰ کے دفاع پر زور دیا جب کہ لیاقت علی خان کشمیر پر زور دیتے رہے۔ مزید برآں وزیراعظم مغربی بلاک کے خلاف پاکستان، ایران اور مصر کا مشترکہ دفاعی بلاک بنانا چاہتے تھے۔

امریکیوں کے چہیتے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین پاکستان کے نئے وزیراعظم اور غلام محمد گورنر جنرل نامزد ہوئے۔ غلام محمد کو امریکا کی آشریاد حاصل تھی۔ وہ مغرب پسند یوراکریٹ تھے۔



قائداعظم، لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین کا جھکاؤ بھی مغرب کی جانب رہا مگر انھوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو مکمل طور پر مغرب نواز بنانے سے گریز کیا۔

امریکا کے صدر ٹرومین بھی جنوبی ایشیا کے بارے میں متوازن اور محتاط پالیسی پر گامزن رہے۔ انھوں نے بھارت کو پاکستان پر فوقیت دی۔ امریکی سفارت کار ڈین ایچی سن (Dean Acheson) لکھتا ہے: "پاکستانی ہمیشہ امریکا سے اسلحہ مانگتے رہے مگر انھیں ٹال دیا گیا۔"

۱۹۵۲ء میں غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور امریکا میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ وزیراعظم بنائے گئے۔ ان کے دور میں گندم کی قلت پیدا ہوئی تو امریکا نے اپنے چہیتے وزیراعظم کو مشکل صورت حال سے نکالنے کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر پاکستان کو ایک لاکھ ٹن گندم فراہم کر دی۔ جب گندم کراچی پہنچی تو

چاہیے۔ وہ پاکستانی افواج کو مسلح اور ساتھ ہی پاکستان میں ضرورت کے مطابق "فوجی سہولتیں" حاصل کرے۔ پاکستان سے یقین دہانی حاصل کی جائے کہ جنگ کی صورت میں اس کی افواج دستیاب ہوں گی۔

پاکستان کے پاس نسلی افروادی قوت موجود تھی مگر اسلحہ نہیں تھا۔ فوج کو مسلح کرنے کے لیے اسلحہ ساز فیکٹریوں کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے لیڈر ابتدا ہی سے قومی ضرورت پورا کرنے کی خاطر جتن کرتے رہے مگر ان کی ساری توجہ امریکا پر مرکوز رہی۔

لیاقت علی خان کی شہادت سے پاکستان ایک محبت وطن اور مقبول لیڈر سے محروم ہو گیا۔ مصدقہ رپورٹوں کے مطابق امریکا نے ان کے قتل میں حصہ لیا۔ وہ دیانت دار لیڈر تھے اور امریکا انھیں آسانی سے خرید نہیں سکتا تھا۔ انھوں نے شہادت سے چار روز قبل

ٹرانسپورٹ کے لیے استعمال ہونے والے ادتوں کی گردنوں میں "Thank you America" (امریکا تیرا شکریہ) کے کتبے لٹکائے گئے۔

مئی ۱۹۵۲ء میں امریکا کے سیکرٹری آف اسٹیٹ ڈلس (Dulles) نے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کا دورہ کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد، وزیراعظم محمد علی بوگرہ اور وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے ڈلس کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ پاک فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے ڈلس کو باہر کرایا کہ پاکستان کی سلامتی کا تحفظ طاقتور امریکا کے تعاون سے ممکن ہے۔ برطانیہ کے اخراج سے پیدا ہونے والا خلا امریکا ہی پر کر سکتا ہے۔ امریکا نے کیونز م کے خطرے کے پیش نظر پاکستان کے ممکنہ کردار کا جائزہ لیا۔

امریکی حکومت کو خصوصی طور پر مغربی پاکستان میں ایسے اہم جنگی ہوائی اڈے نظر آئے جہاں سے روس اور کیونسٹ چین کے اندرونی علاقوں کو بمبار طیاروں سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ پاکستان میں ایسی بندرگاہیں بھی موجود تھیں جو مغربی یورپ سے مشرق بعید تک مواصلات کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ امریکی دستاویز کے مطابق جنرل ایوب خان نے امریکی سفارت کاروں اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے عہدیداروں سے ذاتی مراسم قائم کر رکھے تھے۔

ڈلس پاکستان کے کامیاب دورے سے بڑا متاثر تھا۔ اس نے امریکی انتظامیہ کو یقین دلایا کہ پاکستان ایک قابل اعتماد اتحادی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے امور خارجہ کی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا: "مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ (پاکستانی) کیونسٹ جارحیت کے خلاف لڑیں گے۔ ہرچند کہ انھیں محض

نکوں کے ساتھ ہی کیوں نہ لڑنا پڑے۔" جنرل ایوب نے امریکا کے سیکرٹری آف اسٹیٹ ڈلس کو خطے کے بارے میں ایک تجزیاتی رپورٹ پیش کی جس کا مرکزی نقطہ روس کی بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک پہنچنے کی خواہش تھی۔ رپورٹ کے مطابق روس کے توسیع پسندانہ عزائم کا مقابلہ پاکستانی فوج ہی کر سکتی تھی بشرطیکہ اسے جدید اسلحہ سے لیس کر دیا جائے۔

ستمبر ۱۹۵۳ء میں جنرل ایوب خان نے خارجہ امور اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ انھوں نے سب سے پہلے امریکا کا دورہ کر کے امریکی عسکری صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا۔ وہ سخت پریشان تھے کہ امریکا پاکستان کو فوجی امداد دینے کے لیے رخصا معذ نہیں ہو رہا۔ وہ امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں امور جنوبی ایشیا کے انچارج آفیسر کے دفتر میں بغیر اطلاع چلے گئے اور کہا:

"حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے! میں یہاں آپ کی ہیرکیں دیکھنے نہیں آیا۔ اگر آپ چاہیں تو ہماری فوج آپ کی ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہم کوئی فیصلہ کر لیں۔"

امریکی امداد کی خاطر بے چینی یہ حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سولیلین اور فوجی لیڈر امریکی امداد پانے کی خاطر بے چین رہے اور انھوں نے قتبادل ذرائع کے بارے میں تنجیدگی کے ساتھ غور نہ کیا۔ اسکندر مرزا ۱۹۵۳ء میں وزیر دفاع نامزد ہوئے۔ پاکستان میں امریکی سفیر ہو رہیں ہلڈریتھ (Horace Hildruth) نے اسکندر مرزا سے قریبی تعلقات قائم کر لیے۔ ہلڈریتھ کی جٹی نے ۱۹۵۳ء میں اسکندر مرزا کے بیٹے سے شادی کر لی۔ ہلڈریتھ ۱۹۵۷ء تک پاکستان میں امریکا کے سفیر کے

فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران اسکندر مرزا پاکستان کے طاقتور اور بال اختیار صدر تھے۔ چنانچہ امریکا کو پاکستان کے قومی نوعیت کے حساس فیصلوں سے متعلق اطلاعات ملتی رہیں۔

آخر جنوری ۱۹۵۴ء میں کہیں جا کر امریکا کے صدر آئزن ہاور نے امداد جاری کرنے پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ امریکا کو مکمل اور اک تھا کہ پاکستان اسٹریٹجک لحاظ سے ایسی مرکزی جگہ واقع ہے جہاں سے چین اور روس کے خلاف ممکنہ فوجی آپریشن کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پاکستان کی بد قسمتی کہ

اسے ابتدا سے ایسے لیڈر ملے جن کی ہمدردیاں اپنے ملک کے بجائے امریکا کے ساتھ تھیں۔ حکومت پاکستان کے سیکرٹری، دفاع اسکندر مرزا امریکا کو ایسے

مشورے دیتے بلکہ خبری کرتے رہے جس سے پاکستان کی سلامتی اور قومی مفاد پر زبرد پڑتی تھی۔ امریکا کی حقیقہ دستاویز کے مطابق اسکندر مرزا نے امریکی سفیر سے کہا: "امریکا کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ وزیراعظم محمد علی کو معاشی اور فوجی امداد آسانی سے نہ دے۔ یہ امداد اسی یقین دہانی پر دی جائے کہ پاکستانی حکومت وائس مندانہ رویہ اپنائے گی۔ مرزا نے ایسی کارروائی کے لیے پر زور سفارش کی اور یقین ظاہر کیا کہ اس طرح محمد علی امریکا کے لیے اچھے رد عمل کا اظہار کرے گا۔"

پاکستان امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا اور ۱۹۵۴ء میں وہ سیٹو (SEATO)

معاہدے کا رکن بن گیا۔ امریکا کو ایشیا میں ایک ایسے ملک کی ضرورت تھی جو کمیونزم کا بڑھتا خطرہ روکنے کے لیے اتحادی بن سکے۔ مگر پاکستان کو روس سے زیادہ بھارت سے خطرہ تھا۔ لہذا فطری طور پر پاکستانی لیڈروں کی خواہش تھی کہ امریکا کے ساتھ جو دفاعی معاہدہ ہو اس میں بھارت کی جانب سے جارحیت کی صورت میں امریکی تعاون کی شرط شامل ہو۔

لیکن امریکا بھارت کو ناراض کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں کی کوششوں کے باوجود امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ ڈلس بھارتی جارحیت کو معاہدے میں شامل کرنے کے لیے رضا مند نہ ہوئے اور واضح کیا کہ معاہدہ سیٹو صرف کیونٹ جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہو



گا۔ ظفر اللہ خاں نے حکومت پاکستان کی منظوری کے بغیر ہی سیٹو کے ڈرافٹ سے اتفاق کر لیا۔

ظفر اللہ خاں کے ڈپٹی آغا ہلالی نے اختلاف کیا تو انھوں نے حکومت پاکستان کو چار بھیجا کہ اگر اس اقدام کی منظوری نہ دی گئی تب وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ پاکستان کی وفاقی کابینہ امریکا کو ناراض کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لہذا اس نے ایک طرفہ معاہدے کی منظوری دے دی۔ بہر حال ڈلس نے زبانی یقین دہانی کرائی کہ امریکا پاکستان کے خلاف غیر کیونٹ جارحیت کی صورت میں بھی تعاون کرے گا۔ پاکستانی دانشوروں نے سیٹو کے معاہدے پر تنقید کی۔ ڈلس کو بھی

امریکا میں تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈلس نے ایک ممتاز امریکی صحافی 'والٹر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: "دیکھو! مجھے جنوبی ایشیا میں حقیقی طور پر لڑاکا آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ایشیا میں صرف پاکستانی ہی حقیقی طور پر لڑ سکتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں ان سے اتحاد کی ضرورت ہے۔"

روس ناراض ہو گیا

پاکستان نے امریکا سے تو معاہدہ کر لیا مگر روس ناراض ہو گیا۔ روس نے انتہاء کیا کہ سیٹو کا معاہدہ ایشیا کی سلامتی کے خلاف ہے۔ جن ملکوں نے اس معاہدے پر دستخط کیے ہیں انھوں نے ایشیا کا امن خطرے میں ڈال دیا۔ وہ اپنے اقدامات کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

اس دوران بھارت غیر جانبدار رہا۔ اس نے کیونسٹ ملکوں کے علاوہ مغربی ممالک سے بھی مالی امداد حاصل کر لی۔ ۱۹۶۵ء تک امریکا اور مغربی ممالک نے غیر جانبدار بھارت کو چھ بلین ڈالر کی امداد دی۔ جبکہ اتحادی پاکستان صرف تین ارب ڈالر کی امداد حاصل کر سکا۔

پاکستان فروری ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ کا رکن بھی بن گیا جو بعد میں سینو معاہدہ کہلا یا۔ ایران، عراق، ترکی اور برطانیہ سینو کے رکن تھے اور امریکا سرپرست تھا۔ جنرل ایوب خاں نے سینو اور سینو معاہدوں کے متعلق اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" (Friends Not Masters) میں تحریر کیا:

"ان کے ذریعے پاکستان ایشیا میں امریکا کا سب سے بڑا اتحادی بن گیا۔"

اکتوبر ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے دستور

ساز اسمبلی کو معطل کیا اور بوگرہ کی وزارت تبدیل کر کے چودھری محمد علی کو وزیر خزانہ، آر می چیف جنرل ایوب کو وزیر دفاع اور اسکندر مرزا کو وزیر داخلہ نامزد کر دیا۔ "ٹائم میگزین" نے ان تبدیلیوں کے بارے میں لکھا: "اس طرح پاکستان کسی خون خرابے کے بغیر غیر مستحکم مغرب، نواز جمہوریت سے مستحکم مغرب نواز فوجی ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہو گیا۔"

یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے کچھ عرصے بعد ہی امریکا پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے لگا۔ وہ سرکاری طور پر تاثر نہ دیتا البتہ غیر سرکاری طور پر امریکا کی مداخلت غیر معمولی تھی۔ جنوبی ایشیائی امور کے ماہر امریکی سفارت کار ڈینس ککس (Dennis Kux) اپنی کتاب The U.S. and Pakistan میں حیران کن انکشاف کرتے ہیں:

"امریکی سی آئی اے نے معروف ماہر سیاسیات ڈاکٹر چارلس برن مارشل کو بطور آئینی مشیر دو سال کے لیے پاکستان بھجوایا تاکہ وہ آئین کی تیاری کے لیے پاکستانیوں کی معاونت کر سکے۔ مارشل کا مشن یہ تھا کہ وہ دعوے، نفیحت اور مثالوں کے ساتھ پاکستانی لیڈروں کی مدد کرے تاکہ وہ ایک ہموار حکومت قائم کر سکیں۔ مارشل کو بڑی آسانی سے مرکزی قیادت تک رسائی حاصل تھی۔ پاکستانی قیادت کو بھی علم تھا کہ مارشل ظاہری طور پر ایک سماجی تنظیم ڈیر بارن فاؤنڈیشن کے لیے کام کرتا ہے مگر دراصل وہ سی آئی اے کا ملازم تھا۔"

سی آئی اے پاکستان میں

۱۹۵۶ء تک پاکستان۔ امریکا کے تعلقات اس سطح پر پہنچ گئے کہ ایک پاکستانی گوریل فورس تیار کی گئی تاکہ وہ وہی جارحیت کا مقابلہ کر سکے۔ اس آئیڈیا کے پیچھے

کہا کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو عہدہ سفارت کاری کے ذریعے یہ کام انجام دینا چاہیے۔

امریکا کو ابتدا ہی میں اندازہ ہو گیا کہ وہ پاکستان کی فوج پر زیادہ اخراجات کر رہا ہے جبکہ عوام نظر انداز ہوتے رہے۔ مگر امریکا پاکستان کے ساتھ معاہدے کر کے پھنس چکا تھا لہذا وہ اس ادراک کے باوجود فوجی امداد محدود نہ کر سکا۔ پاک فوج بھی بوقت ضرورت امریکی مفادات کا تحفظ کرتی رہی۔ جرمنیوں نے ادراک نہ کیا کہ پاکستان محض فوجی طاقت سے متحد نہیں رہ سکتا۔

آئرن ہاور کے دور صدارت تک امریکا اور پاکستان متضاد مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہے۔ امریکا بھارت کو ناراض کیے بغیر روس کے گرد گھیرا

تنگ رکھنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کی خاطر امریکا نے پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدے کیے۔ لیکن پاکستان کو بھارت سے خطرہ لاحق تھا۔ اپنی آزادی اور سلامتی کے لیے اسے مضبوط فوج کی ضرورت تھی۔ لہذا یہ مقصد پانے کے لیے پاکستانی لیڈروں نے روسی خطرے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور امریکا سے دفاعی امداد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ پاکستانی لیڈروں نے تمام تر توجہ قومی سلامتی پر مرکوز کر دی۔ وہ یہ بھول گئے کہ مضبوط فوج مضبوط معاشرے کے بغیر قومی مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔



عہدہ ایچ ایچ ایچ کے قیام پر

اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور سی آئی اے دونوں کی سوچ کارفرما تھی۔ امریکا نے اپنے جن افسروں کو بطور تربیت کار پاکستان میں تعینات کیا ان کا تعلق خفیہ ایجنسیوں سے تھا۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں مملاتی سازشوں کی بنا پر وزیراعظم چودھری محمد علی نے استعفیٰ دے دیا۔ صدر اسکندر مرزا نے بادل خواست حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم نامزد کیا۔ اسکندر مرزا نے امریکی سفیر ہلڈرٹھ (Hildreth) اور برطانوی ہائی کمشنر مورس

(Morice) کو بتایا کہ وہ نئے وزیراعظم کا اس وقت تک ساتھ دے گا جب تک وہ خارجہ اور فوجی امور میں دخل اندازی نہیں کرے۔

جنوری ۱۹۵۷ء میں امریکا کی سلامتی کے ادارے نیشنل سکیورٹی کونسل (NSC) نے پاکستان کے بارے میں ایک تجویزی رپورٹ تیار کی جس میں درج تھا:

”ہمیں پاکستان کی بطور فوجی اتحادی ضرورت تھی۔ مگر ہمارے لیے یہ سودا بڑا مہنگا ثابت ہوا۔ ہم درحقیقت فوجی امداد کے علاوہ پاکستان کے لیے کچھ نہیں کرتے رہے۔ یہ ایک بڑی خوفناک غلطی تھی مگر اب ہم اس میں بُری طرح پھنس چکے۔“

امریکی صدر آئرن ہاور نے رپورٹ سے اتفاق کرتے ہوئے سوال کیا کہ امریکا اس صورت حال سے کیسے باہر نکال سکتا ہے؟ انڈر سیکرٹری رابرٹ رضی نے

دیا۔ جنرل محمد ایوب خان چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نامزد ہوئے۔ چند ہفتوں بعد جنرل ایوب خان نے صدر اسکندر مرزا سے گن پوائنٹ پر استعفیٰ لے لیا۔ امریکا اور برطانیہ کے سفیر اس صورت حال کے بارے میں اپنی حکومتوں کو خفیہ رپورٹیں روانہ کرتے رہے۔

امریکا خفیہ طور پر پاکستان کے عسکری لیڈروں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا تاکہ وہ جمہوری نظام ختم کر کے اقتدار سنبھال لیں۔ امریکی انتظامیہ کا خیال تھا کہ پاکستان میں انتخابات کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے والی جمہوری حکومت نچلے میں امریکا کے مفادات آگے بڑھانے میں مکمل تعاون سے گریز کرے گی۔ لہذا سرد جنگ کے اہم موڑ پر اسے ایسی فوجی حکومت کی ضرورت تھی جو امریکا کے ساتھ باہمی سانی معاملات طے کر سکے۔ البتہ خلائیہ طور پر امریکا جمہوریت کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کرتا رہا۔

اسکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خان دونوں امریکا نواز تھے۔ مارشل لا نافذ کر کے اسکندر مرزا نے عطا المل بننے کی کوشش کی۔ جنرل ایوب طاقتور جرنیل تھے۔ ان کے اپنے سیاسی عزائم تھے۔ انھیں یہ خفیہ اطلاعات ملیں کہ اسکندر مرزا فوج کے جرنیلوں سے ساز باز کر کے ان کو فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حکم پر ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی رات تین جرنیلوں نے اسکندر مرزا کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

جنرل ایوب خان پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ جنرل ایوب نے امریکی سفارت کاروں کو یقین دلایا ”حالیہ تبدیلیوں کے بعد پاکستان زیادہ وفاداری کے ساتھ دفاعی معاہدوں پر کاربند رہے گا۔“ امریکی امداد کا تسلسل پاکستان کے

پاک امریکی دوستی کے معاہدے بہر حال ۱۹۵۷ء تک افواج پاکستان بھارتی خطرے کی صورت میں مضبوط دفاع کے قابل ہو گئیں۔ وزیر اعظم سید وردی نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے زور دیا کہ سیٹو اور بغداد پیکٹ پاکستان کے مفاد میں ہیں لہذا اسمبلی ان دونوں معاہدوں کی توثیق کر دے۔ ۲۵ فروری ۱۹۵۷ء کو اسمبلی کے چالیس ارکان نے معاہدوں کی منظوری دے دی۔ یونائیٹڈ فرنٹ اور مسلم لیگ کے ارکان غیر حاضر رہے۔ میاں افتخار الدین اور مشرقی پاکستان کے ایک رکن نے مخالفت میں ووٹ دیا۔

سید وردی نے جولائی ۱۹۵۷ء میں امریکا کا دورہ کیا۔ انھوں نے امریکی لیڈروں پر کشمیر کا مسئلہ حل کرانے کے لیے زور دیا۔ امریکا نے ہمارے ۵۷ بی طیاروں کے حصول کی خاطر پاکستان کی درخواست پر توجہ نہ دی۔ سید وردی نے امریکی صدر آبرن ہار کو بتایا کہ پاکستان امریکا کو یو۔ ٹو طیارے کو اڑا دیتے۔ اسے لیے تیار ہے۔ اس پیش کش پر ۱۹۵۹ء میں غل جوا جب امریکا نے پشاور سے دس کلومیٹر دور بڈیہ کے مقام پر خفیہ اڈا قائم کر لیا۔ وہاں سے امریکا ردی تصویبات کے سنگل ریکارڈنگ کرتا تھا۔ پاکستان کے اس اہم تعاون سے امریکا کو روس کی عسکری صلاحیت اور ٹیکنالوجی کے متعلق ایسی حساس معلومات ملیں جو اس کی قومی سلامتی کے لیے بے حد ضروری تھیں۔

۱۹۵۸ء تک امریکا پاکستان کی اسٹیمپلشٹ اور ایلین کلاس میں گہرا اثر و رسوخ قائم کر چکا تھا۔ اسکندر مرزا مکمل طور پر امریکا اور برطانیہ کی گرفت میں آ چکے تھے۔ انہی دونوں ممالک کی شہ پر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اسکندر مرزا نے اسمبلیاں ختم کر کے مارشل لا نافذ کر

لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

امریکا کی الٹی قلابازی

جنرل ایوب خان نے پاک فوج کی تربیت اور تشکیل امریکن ڈیفنس ڈاکٹرائٹس کے مطابق کی۔ انھوں نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۳ء تک مسلسل فوجی افسروں کو امریکا میں عسکری تربیت کے لیے بھیجا۔ پاک فوج کے جوان اور افسر سینٹو اور سینٹو کمانڈ کے تحت فرائض انجام دیتے رہے۔ پاک فوج کو امریکی اسلحہ سے مسلح کیا گیا۔ امریکی فوج کے تربیت کار پاک فوج کے جوانوں کی تربیت کرتے رہے۔ اس طرح پاک فوج ذہنی طور پر امریکا نواز بن گئی اور امریکی اسلحے پر انحصار کرنے لگی۔

لیکن ۱۹۶۰ء تک امریکا اور روس کے درمیان سرد جنگ میں شدت باقی نہ رہی۔ دونوں عالمی طاقتوں نے چین کا راستہ روکنے کے لیے آپس میں مفاہمت کر لی۔ امریکا کے صدر کینیڈی

بھارت نواز تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر بھارت معاشی طور پر ترقی کر کے چین کے برابر نہ آیا تو آزاد دنیا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کینیڈی نے اپنے دورِ حکومت میں بھارت کی امداد میں اضافہ کیا۔ اسٹیمٹ ڈیپارٹمنٹ کے مشیر ہنری کسنجر نے ۱۹۶۱ء میں بھارت کا دورہ کیا اور بھارت کے ایشیائی کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ گزشتہ امریکی حکومت ”پاک“ مرض میں مبتلا تھی۔ ”پاک“ کا لفظ پاکستان کے لیے نفرت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ حتیٰ کہ پاکستان میں امریکی سفیر لانگلے (Langlay) نے امریکی حکومت کے نام خط میں پاک فوج کی تعداد کم کرنے کی سفارش کر دی۔

روس نے ۷ مئی ۱۹۶۰ء کو پاکستانی اڈے (بڈیر) سے پرواز کرنے والا امریکی جاسوس طیارہ یو۔ ٹو مار گرایا۔ روس کے صدر خروشیف نے پاکستان کو کھلی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان آگ سے نہ کھیلے۔ اٹلی روسی افسر نے کہا:

”پشاور کہاں پر ہے؟ ہم نے اپنے نقشوں میں اس کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا ہے۔“

اس وقت جنرل ایوب خان لندن میں تھے۔ سی آئی اے کے اسٹیشن چیف نے اس واقعے کے بارے میں جنرل ایوب کو مطلع کیا۔ انھوں نے اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا کہ انھیں توقع تھی کہ کسی غلطی پر یہ واقعہ رونما ہوگا۔



جنرل ایوب اگر قومی مفادات کو ترجیح دینے کی پالیسی اپناتے تو وہ کبھی امریکا کو اپنی سر زمین پر امریکی فوجی اڈوں کے قیام کی اجازت نہ دیتے۔ غیر سیاسی اور غیر جمہوری حکمران بڑی آسانی سے عالمی طاقتوں کے دباؤ میں آ کر ایسے فیصلے کر بیٹھتے ہیں جن کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔

یو۔ ٹو واقعے کے بعد جنرل ایوب خان نے روس کا غصہ کم کرنے کے لیے خارجہ پالیسی متوازن بنانے کی کوششیں کیں۔ امریکی لابی کے وزیر خزانہ شعیب کی مخالفت کے باوجود وزیر تجارت بھٹو کو اجازت دی کہ وہ پاکستان میں تیل اور گیس کی تلاش کے لیے روسی کمپنیوں سے معاہدہ کرے۔ جنرل ایوب نے بھٹو کی سفارش پر اقوام متحدہ میں چین کی رکنیت کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے نے امریکی صدر کینیڈی کو پریشان کر دیا۔

لیکن جنرل ایوب خان نے جولائی ۱۹۶۱ء میں امریکا کا دورہ کیا تو امریکی کانگریس کے ارکان کو یقین دلایا کہ پاکستان امریکا کا اتحادی رہے گا۔ جنرل ایوب نے کہا:

”ایشیا میں اور کوئی ملک نہیں جہاں امریکا قدم بھی رکھ سکے۔ صرف پاکستان کے عوام ہی امریکا کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔“

جنرل ایوب خان نے صدر کینیڈی پر مسئلہ کشمیر حل کرانے کے لیے زور دیا اور اصرار کیا کہ اگر امریکا نے بھارت چین جنگ کی صورت میں بھارت کو اسلحہ دیا تو

پاکستان دفاعی معاہدوں سے باہر نکل

آئے گا۔ صدر کینیڈی نے جنرل ایوب کو

یقین دلایا کہ امریکی پالیسی کے مطابق

بھارت کو اسلحہ سپلائی کرنے کی گنجائش

نہیں ہے۔ اگر امریکی پالیسی تبدیل ہوئی

تو صدر کینیڈی صدر ایوب سے مشورہ

کریں گے۔ لیکن نومبر ۱۹۶۲ء میں جب

چین اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازع شروع ہوا

تو امریکا نے صدر ایوب کو بتائے بغیر بھارت کو اسلحہ بھجوا

دیا۔

جرنیل حکمران نے موقع گنوا دیا

بھارت چین کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔

تب پاکستان کے لیے کشمیر لینے کا سنہرا اور تاریخی موقع

تھا۔ مگر امریکا اور برطانیہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ

غیر جانب دار رہے اور یقین دلایا کہ اس مرحلے پر

تعاون کا مظاہرہ تنازع کشمیر حل کرنے میں انتہائی سود

مند ثابت ہوگا۔

یوں اس جرنیل حکمران نے یہ سنہرا موقع گنوا دیا۔

امریکا اور برطانیہ ایک بار پھر پاکستان کو بیوقوف بنانے میں کامیاب رہے۔ امریکا نے پاکستانیوں کی ناراضی کم کرنے کے لیے بذریعہ تاریخی دہائی کراچی کہ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو امریکا ان کی مدد کرے گا۔ امریکا قبیح مصلحتوں کے تحت زبانی اور تحریری طور پر اس نوعیت کی یقین دہانیاں کراتا رہا مگر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران امریکا نے تمام معاہدے اور وعدے نظر انداز کر دیے۔

امریکی صدر جاکسن جنرل ایوب کو اپنی دوستی اور

اعتماد کا یقین دلاتے رہے مگر پاکستان امریکا کے شکنجے

میں پھنس چکا تھا۔ جنرل ایوب ۱۹۶۵ء

کی پاک بھارت جنگ اور معاہدہ

تاشقند کے بعد عوام میں مقبولیت کھو

بیٹھے۔ انھوں نے عوامی دباؤ کے تحت

۱۹۶۷ء میں روس کا دورہ کیا اور امریکی

فوجی اڈے ہڈیر کی لیز ختم کر دی۔

جنرل ایوب نے فروری ۱۹۶۷ء کو اپنی

ڈائری میں لکھا:

”ترقی پذیر ممالک میں امریکا اور برطانیہ نے

جمہوریت کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ انھوں نے ہمیں

اپنے حالات کے مطابق جمہوری نظام تشکیل نہیں کرنے

دیا۔ وہ ہمیں کمزور اور عدم استحکام کا شکار رکھنا چاہتے ہیں

تاکہ ہم ان کے رحم و کرم پر رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان

کی سوچ سیاسی اور مکمل طور پر بددیانتی پر مبنی ہے۔“

کاش ہمارے موجودہ حکمران جنرل ایوب کے

خیالات پر غور کرنے کے قابل ہوں اور اپنے پاؤں پر

کھڑے ہونا سیکھ سکیں۔

جنرل ایوب خان امریکا کی غیر متوقع بے وفائی سے



دل گرفتہ ہوئے اور انھوں نے "فرینڈز ٹاٹ ماسٹرز" کتاب تحریر کی جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ پاکستان کو آقا نہیں بلکہ دوستوں کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنرل ایوب سمیت پاکستان کے تمام حکمرانوں نے امریکا کو آقا کے طور پر تسلیم کر کے اس کی بالادستی کو قبول کر لیا۔ وہ پاکستان کی خود مختاری کو نظر انداز کرتے رہے۔

پاک امریکا تعلقات کی سترھ سالہ تاریخ کو نشیب و فراز کی تاریخ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ آج بھی امریکا ہمارا قابل اعتماد دوست نہیں کہلاتا۔ دونوں ممالک کے تعلقات کبھی اس قدر خوشگوار ہو گئے کہ اسے بنی مومن جریڈ کا نام دیا گیا اور کبھی اس قدر کشیدہ کہ پاکستان پر خصوصی آئینی ترامیم کر کے پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

سچ یہ ہے کہ امریکا ایک ایسا ناقابل اعتبار دوست ثابت ہوا جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ غلامی سے نجات کا راستہ

پاکستان میں انگریزی بولنے والے طبقے امریکا نواز ہیں۔ پاکستان میں قومی زبان اردو کے مقابلے میں انگریزی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ چنانچہ انگریزی بولنے والے پاکستان کا ایلٹ طبقہ بن گئے جو ریاست اور اس کے مسائل پر توجہ دیتے اور امریکا کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ان میں سینئر عسکری اور سول بیوروکریٹس جاگیردار تاجران اور فیبرز شامل ہیں۔ ان کے امریکا سے گہرے رابطے ہیں جو انھوں نے تعلیمی سرکاری اور تجارتی ذرائع سے استوار کیے۔ پاکستان کے بااثر خاندانوں کی اولاد امریکا میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

امریکا نے عالمی تنظیموں مثلاً اقوام متحدہ آئی ایم ایف

عالمی بینک ایشیا ڈیولپمنٹ بینک اور این جی اوز کے ذریعے بھی پاکستان میں اثر و رسوخ بڑھایا۔ پاک فوج کے پاس اسلحہ بھی امریکی سہاقت کا ہے۔ سینئر فوجی افسروں کی تربیت بھی امریکی عسکری اداروں میں ہوتی رہی ہے۔

پاکستان کے دانشور، لیکچر کرٹس اور سیاست دان امریکا کی یونیورسٹیوں اور پیشہ ورانہ اداروں میں لیکچر دے کر ہزاروں ڈالر وصول کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا امریکا سے مادی رشتہ استوار ہے۔ پاک فوج کے سینئر افسروں کی اکثریت امریکا نواز ہے۔ امریکی سی آئی اے براہ راست انھیں لابی مفاد پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ جنرل حیدر گل کے مطابق پاکستان میں سی آئی اے کے ایشن چیف نے ان کے بیٹے کو امریکی یونیورسٹی میں تعلیم دلانے کی پیش کش کی جسے انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایشن چیف کا کہنا تھا کہ یہ معمولی خدمت امریکا بآسانی انجام دے سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہم ہی نے جنرل اختر عبدالرحمن کے سب بیٹوں کو امریکا میں تعلیم دلوائی ہے۔

بعض ماہرین کا دعویٰ ہے کہ امریکہ کا پاکستان میں اثر و رسوخ اس حد تک بڑھ چکا کہ تمام اہم نوعیت کے پالیسی فیصلے امریکی حکومت کی منظوری سے ہوتے ہیں۔ پاکستان کا سالانہ قومی بجٹ امریکا کی خفیہ تائید سے بنتا ہے۔ ہمارا تعلیمی نصاب واشنگٹن میں تیار ہوتا ہے۔ صدر و ذریعہ اعظم آرمی چیف اور دیگر کلیدی منصبوں پر نامزدگیاں امریکا کی آشیر باد سے کی جاتی ہیں۔

امریکا نے انتخابات ۲۰۰۸ء میں پس پردہ حکمت عملی تیار کی تھی تاکہ روشن خیال لیبرل سیاسی جماعتیں کامیابی حاصل کر سکیں۔ امریکی الیکٹران پاکستان آ کر



چیف الیکشن کمنشنر سے ملاقات کرتے ہیں۔ پاکستان میں جب بھی کوئی کلیدی فیصلہ ہو امریکی یہاں ہوتے ہیں۔ پاکستان میں امریکی مداخلت اس حد تک بڑھ چکی کہ پاکستان کے عوام آزادی اور خود مختاری کے حوالے سے گہری تشویش میں مبتلا ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان کو امریکی غلامی سے نجات کیسے دلائی جائے؟ اس مسئلے کا کوئی آسان اور مختصر حل موجود نہیں۔ پاکستان کے عوام کی واضح اکثریت امریکا مخالف ہے۔ عوام نے کبھی امریکی بالادستی اور مداخلت کو پسند نہیں کیا۔ یہی امریکا مخالف جذبات امریکی بالادستی کے لیے چیلنج بن سکتے ہیں۔ القاعدہ و ہشت گردی اور خود کش حملوں کا حربہ استعمال کر کے امریکا کو عالم اسلام سے باہر نکلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن یہ ایک خطرناک اور طویل راستہ ہے جس کے خود عالم اسلام پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔

پاکستان میں اگر ایک ایجنڈے کے تحت انقلابی تحریک شروع کی جائے تو انقلاب ایران کی طرح یہاں بھی عوامی قوت سے انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر امریکی سامراج استحصال، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نیز امریکا نواز جرنیلوں کی بالادستی کے خلاف انقلاب ہو گا۔ نتیجے میں پاکستان اپنی آزادی اور خود مختاری باز یاب کر سکے گا۔ ریاستی اقتدار امریکا نواز طبقات کی گرفت سے آزاد ہو جائے گا۔ عوام کا معاشی استحصال کرنے والے طبقات کمزور پڑیں گے اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک آزاد اور غلامی ریاست بن جائے گا۔ اس طرح عوام مقتدر ہو کر اپنے مقتدر کے فیصلے خود کر سکیں گے اور امریکا کی غلامی سے بھی نجات مل جائے گی۔ ایران نے بھی انقلاب کے بعد ہی

امریکی غلامی سے نجات حاصل کی تھی۔ پاکستان کے نوجوان بھی متحد اور منظم ہو کر انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پاکستان کو آزاد اور خود مختار ریاست بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری نظام مستحکم بنایا جائے۔ جمہوریت تسلسل کے ساتھ چلتی رہے۔ پاکستان کے تمام پالیسی فیصلے پارلیمان میں کیے جائیں تاکہ بیرونی عالمی ادارے غزوہ و احد کو حکم دینے کی حیثیت میں نہ رہیں۔ جن ملکوں میں جمہوری نظام پایدار ہے اور آئین و قانون کی حکمرانی موجود ہے وہاں بیرونی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پاکستانی عوام کو مقتدر منظم اور فعال بنایا اور ان سے ووٹ کی اہمیت تسلیم کی جائے۔ عوامی طاقت کے سامنے کوئی اندرونی اور بیرونی قوت نہیں ٹھہر سکتی۔ کیوبا، شیلی، کوریا اور ایران میں عوام منظم متحد اور مقتدر ہیں جبکہ امریکا کوشش کے باوجود ان ملکوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم نہیں کر سکا۔ پاکستان کے عوام محبت الوطن ہیں مگر معاشی طور پر کمزور اور نسلی، لسانی و مذہبی بنیادوں پر منقسم ہیں۔ امریکا اور اس کے ایجنٹ عوام کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عوام اگر متحد اور منظم ہو کر ایک قوم کے قالب میں ڈھل جائیں تو امریکا کی بالادستی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں انگریزی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے جبکہ قومی زبان اردو کو نظر انداز کیا گیا۔ جو قوم میں اپنی زبان نظر انداز کر کے بدیسی زبان کو ترجیح دیں وہ بڑی آسانی سے بیرونی بالادستی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ دے کر قوم میں خود اعتمادی اور خودداری کا جذبہ پیدا کیا جائے۔



قومی شاعر

تحریک پاکستان سے وابستہ ہر مسلمان رہنما کی خواہش تھی۔
چناں چہ تحریک پاکستان سے وابستہ اسلامی فکر
رکھنے والے جن شاعروں اور ادیبوں نے پاکستان کے
خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اپنی اپنی سطح پر
جو بساط بھر کوشش کی، ان میں حضرت صبا اکبر آبادی کو
یہ اولیت اور خصوصیت حاصل ہے کہ پاکستان بننے سے
پہلے، تحریک آزادی کے سلسلے میں ان کی منظومات کتابی
صورت میں شائع ہوئیں۔ انہی تخلیقات میں سے جذبہ
حب الوطنی کی خوشبو میں مہکتا انتخاب نذر قارئین ہے۔
قائد اعظم محمد علی جناح



اورچ فلک پہ مہر درخشاں جناح تھے
انسانیت کے غیر تاباں جناح تھے
ارض وطن پہ ماہ فروزاں جناح تھے
حق کی سدا بہار گلستاں جناح تھے
اپنا بتا کے حکم خدا اور رسول کو
دامن بچا کے جن لیا کائناتوں سے پھول کو
دست فرنگ و مکر برہمن کو توڑ کے
بچھڑے ہوؤں کو ایک بنایا تھا جوڑ کے



صبح کی روشنی ہے پاکستان

تحریک پاکستان سے وابستہ ممتاز شاعر،
صبا اکبر آبادی کی قوم میں
نئی انگلیں ابھارتی شاعری کا انتخاب

صبا اکبر آبادی تحریک پاکستان کے ایک ایسے سپاہی
تھے جنہوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔
جنہیں ٹوک کلم کاٹنے اقلیم سخن
مل گئی خوب یہ چلتی ہوئی تلوار مجھے
انہوں نے اسی تلوار سے آگرہ اور گردونواح میں
مخالفین تحریک پاکستان کے حوصلوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔
وہ اپنی شاعرانہ فکر سے قومی یکجہتی کے لیے بھرپور کام
کرتے رہے۔ تحریک پاکستان کی انقلابی قوت میں کسی
جگہ کسی طرح کوئی کمی نہ آنے پائے، یہ قائد اعظم اور

قش لکھ ایک ہی مضمون چاہیے
قرآن اور حدیث کا قانون چاہیے
(۱۹۹۰ء)

تعمیر پاکستان

مباح صاحبِ تعمیر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آئے۔ بقول
ان کے "پاکستان کا قیام ہمارے لیے ایسا ہی تھا جیسے گھٹا
ٹوپ اندھیرے کے بعد دھنک کے بھرپور رنگوں کی
روشنی میں داخل ہو جائیں۔ درج ذیل نظم تب کی
کیفیات بخوبی عیاں کرتی ہے۔
آرزو

دامن کی آرزو نہ گریباں کی آرزو
ہم کو ہے بس بہار گھستاں کی آرزو
کرتا ہے ان کو جشن بہاراں کا اہتمام
اب تک تھی جن کو جشن بہاراں کی آرزو
آنکھوں کو ہے تجلی افلاص سے فرض
دل میں ہے صرف رعبت انساں کی آرزو
جس سے چھپا رہے نہ کوئی رنگ کائنات
رکتا ہوں ایسے دیدہ حیراں کی آرزو
تاریکیوں کے دور گزرنے کے بعد ہم
رکھتے ہیں ہر گلی میں چراغاں کی آرزو
ایک اک شجر میں چاہیے فردب رنگ و بو
ہے شاخ شاخ ہر گلی خنداں کی آرزو
ہم اپنے جھونپڑوں میں ہیں سرور و مطمئن
ہے قصر کی تلاش نہ ایواں کی آرزو
اللہ ان گھروں کو اجالا کرے نصیب
تھی جن کو اک چراغ شبستاں کی آرزو

حق اپنا جینا ظلم کا بیجہ مراد کے
خواہیدہ قوتوں کو جگایا جھنڈوں کے
قلب حد کے واسطے غجر بنے رہے
عزم و عمل کا اپنی پیکر بنے رہے
سوئی ہوئی تھی قوم جھنڈوں جناح نے
باطل کے ہر طلسم کو توڑا جناح نے
منہ حق کے راستے سے نہ سوزا جناح نے
آزاد کر کے قوم کو چھوڑا جناح نے
دستِ خزاں سے حسنِ جان لے کے دے دیا
اظہار سے ہمارا وطن لے کے دے دیا
اے اہل باغ اب کوئی کانٹا ابھر نہ آئے
اے اہل ہزم پر کوئی فتنہ نہ سراغ لگائے
غنیے کو حق ہے باغ میں وہ کھل کے مسکرائے
مانگو دعا بہار کی یہ رت بدل نہ جائے
تعمیر نو کے جذبہ محکم سے کام لو
مشکل جو ہو تو قائدِ اعظم کا نام لو
اے قوم اس امامتِ عظمیٰ سے باخیز
اس پہ نہ اٹھنے پائے سمجھی کوئی مد نظر
مہرِ ثبات ثبت ہے ایک ایک ذرے پر
ثمت جو مل گئی ہے تجھے اس کی قدرا کر
لے کر یقین و عزم کا پرچم نہ آئے گا
اب اور کوئی کانٹا عظم نہ آئے گا
دنیا کی سمت دیکھ کے ہوگا نہ کچھ حصول
عرضِ مدد بھی نہ کرے گا کوئی قبول
ان مادی ذریعوں سے ہے آرزو و فضل
کافی ہے مومنوں کو بس اللہ اور رسول

بت جن میں تھے ہوں کے وہ بت خانے رہ گئے
پوری ہوئی ہے گلاب مسلمان کی آرزو
پچھلے پہر کے دوست تاروں کا ذکر کیا
ہے صبح نو کے سور درخشاں کی آرزو
عیشی نفس بنو کہ نہ دم توڑ دے کہیں
دل میں کسی مریض کے درماں کی آرزو
اٹھو کہ جنگلوں میں نئی بستیاں بسائیں
پوری ہو اب تو دشت و بیاباں کی آرزو
پوش نظر صحیفہ دل چاہے صبا
ہر وقت ہے تلاوت قرآن کی آرزو
(۱۹۳۸ء)

سر سید احمد خاں کے لیے



تہذیب اور اخلاق سکھانے والا
سورج کی طرح سے چمکانے والا
غیرہ ہوئیں ارباب وطن کی آنکھیں
اس طرح سے آیا تھا وہ آنے والا
شرق و غرب کو ایک کرنے والا
اخلاص کا رنگ سب میں بھرنے والا
سید کی زبان کا اثر تھا اتنا
ہر لفظ دلوں میں تھا اترنے والا

اسلام کی دیکھی تھی زبانیں عالی بھی
مستقبل قوم پر نظر ڈالی بھی
تغیر میں قوم کی وہ رہا مصروف
طعنے بھی سنے اور سنی گالی بھی
مرحد میں بھی چمکے ہیں ستارے اس کے
وہابی میں بھی بنے ہیں دھارے اس کے
سندھی ہوں بلوچی ہوں، کہ بنگالی ہوں
یونانی کی طرح سب ہی تھے پیارے اس کے
اک صاحب ہوش، راہبر تھے سید
اسلام کی چشم معتبر تھے سید
صرف خطاب ہی نہیں ہے واقعہ ہے
تھی قوم اگر جسم تو مرتے سید
گرداب سے کشتی کو نکالا اس نے
مرتی ہوئی قوم کو سنبھالا اس نے
وہ خطہ گمنام کبھی تھا جو کول
اک مرکبِ علم و لہن میں ڈھالا اس نے
تھیں خوابیں بے شمار سرسید کی
ہو گی نہ کبھی خزاں بہار سرسید کی
لگا ہے علیگزادہ سے جو پڑھ کے وہ شخص
دراصل ہے بادگار سرسید کی
تاریک جو ہو گی رات، ڈھل جائے گی
آئے گی کوئی بلا تو ٹل جائے گی
سید کی طرح کوئی سنبھالے گا اگر
گہڑی ہوئی یہ قوم سنبھل جائے گی

صبح کی روشنی ہے پاکستان

چاند کی چاندنی ہے پاکستان
اک نئی زندگی ہے پاکستان
خواب کی دکھی ہے پاکستان
زندگی، جان بھی ہے پاکستان
ہم کہیں ہوں، یہ آشیانہ ہے
خوشبوؤں کا یہی خزانہ ہے
تابد جس کو جگرگنا ہے
امی اک روشنی ہے پاکستان
دل کی تابندگی ہے پاکستان
خون کی زد ہے دل کی دھڑکن ہے
سب کی منزل ہے سب کا گلشن ہے
اس سے شمع حیات روشن ہے
جویر لازمی ہے پاکستان
صبح کی روشنی ہے پاکستان
آسمان کا ہلال اس میں ہے
عظمتوں کا کمال اس میں ہے
عشق کا اک جلال اس میں ہے
شوق کی رہبری ہے پاکستان
جذبہ دوستی ہے پاکستان
اس کی عظمت پہ جان دیں گے ہم
دھوپ میں سائبان دیں گے ہم
خاموشی کو زبان دیں گے ہم
منزل آخری ہے پاکستان
لہجہ سردی ہے پاکستان
ہر گئے ایک سب غریب و امیر

اس نے سب کی بڑھائی ہے توقیر
بول اٹھے ہیں خود لب تصویر
زندگی، جان بھی ہے پاکستان
زندگی کی خوشی ہے پاکستان
(۱۹۷۳ء)

اے عظمتِ خاکِ وطن

تو گل زمین گل ہرین
ہر دورہ تیرا اک چمن
تو سرفروشوں کا وطن
قربان تجھ پر جان و تن
اے عظمتِ خاکِ وطن
پاکیزہ ہے تو پاک ہے
ہر جلوہ حیرت ناک ہے
تو روکش افلاک ہے
تو صیقل ادراک ہے
اے عظمتِ خاکِ وطن
تو باصفا صد ناز ہے
تو زندگی کا ساز ہے
تجھ سے ہمیں اعزاز ہے
ہر شے سے تو ممتاز ہے
اے عظمتِ خاکِ وطن
دل کے لیے اکیر ہے
تجھ میں غیب تاثیر ہے
روحِ جوان و قد ہے
پُر نور پُر تنور ہے
اے عظمتِ خاکِ وطن
قربان تجھ پر جان و تن



یاد اقبال

شاعر ملت، حکیم قوم، ماضی حیات
نکتہ سنج و نکتہ دان، عالی خیال اعلیٰ صفات
ایشیا کا شاعر عظیم وطن کی آبرو
ملک کا سرمایہ تازش ہوئی تھی اس کی ذات
مگر گمیا پیدا سخن کے ساز میں اک سوز تو
شاعری کو دے گیا رنگ بتا وہ خوش صفات
کھینچا تھا گردش ایام سے اس کا خیال
اس کے بازی گاہ تھے شام اور سحر، دن اور رات؟
وہ حقیقت ڈھونڈ لیتا تھا دل پر ذرہ کی
خاک پر جب ڈال دیتا تھا نگاہ التفات
تھا رموز بے خودی سے باخبر اس کا جنوں
اور اسرار خودی کا آئینہ تھی اس کی ذات
شکوہ سنج بے نیازی تھا کبھی اللہ سے
اور کبھی اس کی دعاؤں میں تھا پیغام نجات
گوشہ گیر وقت تھا لیکن بزور فکر خویش
فتح کر کے اس نے چھوڑی ہے بساط کائنات
جم نہیں سکتا ہے کوئی سند اقبال پر
کردشیں بدلا کرے تا حشر بزم ممکنات
اتفاق وقت سے ہوتے ہیں پیدا اہل دل
صرف ہو کر سیکڑوں جوہر بنا کرتی ہے ذات
اب کہیں صدیوں میں پیدا ہوگا ایسا پاکمال

یہ ملک ہمارا

اک مہکا ہوا خواب ہے یہ ملک ہمارا
طوفان کی لہروں میں بنا اپنا کنارہ
ہر بزم میں دنیا کی رہے روشنی یہ ستارا
یہ پرچم سرسبز خوشی کا ہے اشارہ
یہ ملک، جو ہے ملت مسلم کی جوانی
تاریخ میں اس کا نہیں ملتا کوئی ثانی
اس باغ میں ہر پھول ہے قدرت کی نشانی
ہر راہ میں سورج ہے ہر اک راہ میں تارا
ہر راہ کو اس کی نئے پھولوں سے بھریں گے
آنکھوں میں بھرے نئے خوابوں کے رکھیں گے
جینا ہے تو ہم اس کی حفاظت کو جسیں گے
مرنا ہے تو ہم اس کی حفاظت کو جسیں گے
جس وقت نظر آتا نہ تھا درد کا چارہ
اک شاعر خوش فکر نے ملت کو پکارا
جو سوئے ہوئے تھے، ہوئے بیدار دوبارہ
بہہ نکلا مئے شور سے ایمان کا دھارا
علمت کا پڑے گا کبھی رستے میں نہ ڈیرا
ہونے نہیں دیں گے تری محفل میں اندھیرا
ہم رات کو چھو لیں گے تو جاگے گا سورہا
اللہ چمکتا رکھے یہ چاند یہ تارا
یہ پرچم سرسبز خوشی کا ہے اشارہ
اک مہکا ہوا خواب ہے یہ ملک ہمارا
اس خواب کی تعبیر ہے جینے کا سہارا
(۱۹۷۳ء)



محمد علی جوہر

نبوں پر پھر آئی ہے اک داستان
نگاہوں میں پھرتا ہے دور جہاں
غلامی میں جکڑا تھا ہندوستان
اتھا دفعتاً ایک شیرِ زمان
وہ خادمِ خرم کا، مجسمِ ازاں
محمد علی جوہر خوش بیاں
مجاہد، مقرر، نگہدادِ قوم
وہ چارہ گر درد و آزادِ قوم
زبان و قلم سے شرر بارِ قوم
مے حریت سے وہ سرشارِ قوم
عزیمت کا وہ کوہِ انشِ نشان
محمد علی جوہر خوش بیاں
وطن اس کا حالانکہ تھا رام پور
مگر اس کے دل میں تھا وحدت کا نور
وہ عشق کا رہرو ہاشعور
رہا حرمِ دنیا سے دنیا میں دور
مزاجِ مسلاں کا وہ رازداں
محمد علی جوہر خوش بیاں
خلافت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے
ہلال اور تارا سجائے ہوئے

اب کہاں وہ ولولہ سامانِ دور کائنات
پھٹنے والا موت پر اس وقت ہوتا ہے عیاں
”عمر با در کعب و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دامنے راز آید بروں“
(۱۹۳۹ء)



اے جاں نثارانِ وطن

مرحبا صد مرحبا اے جاں نثارانِ وطن
رات دن تم کو دعا دیں گے مہمانِ وطن
تم زمین پر شیرِ نر ہو تم ہواؤں پر عقاب
کیا عدو لائے تمہاری ضربتِ کاری کی تاب
مرحبا صد مرحبا اے جانثارانِ وطن
تم میں خالد کی قیادت تم میں حیدر کا جلال
تم میں فاروقی جلالت تم میں عثمانی جمال
مرحبا صد مرحبا اے جانثارانِ وطن
تم حسینا شیرِ دل کے چرو کردار ہو
تم علی کا ہاتھ ہو اللہ کی تلواریں ہو
مرحبا صد مرحبا اے جانثارانِ وطن
تم وطن کی آبرو ہو تم وطن کی شان ہو
فخر ہے تم پر ہمیں تم فخرِ پاکستان ہو
مرحبا صد مرحبا اے جانثارانِ وطن
(۱۹۶۵ء)

قدم راہ حق میں جمائے ہوئے
خدا سے فقط لو لگائے ہوئے
بنا ملک میں رہبر کارواں
محمد علی جوہر خوش بیاں
فرنگی کے حملوں میں سینہ سپر
وہ آزادی ملک کا راہبر
جوانی کی زنداں میں اس نے بسر
جو پھوٹا تو پھر تھا وہی شیر فر
فرنگی کو دیتا نہیں تھا اماں
محمد علی جوہر خوش بیاں
وہ گاندھی کی عیاریوں کا جواب
وہ نہرو سیاست کا تھا سدا بہ
اتارے ریاکاریوں کے نقاب
اٹھائے نگاہوں سے سارے حجاب
کیے اس نے اسراء باطل عیاں
محمد علی جوہر خوش بیاں
رہا عمر بھر زو کشیا صدہم
نہ عہدے کی پروا نہ منصب کا غم
چلا جیغ کی طرح اس کا قلم
ہوا ”کامریہ“ اس کا جنگی علم
تھا ”ہمدرد“ بھی اس کا فوجی نشان
محمد علی جوہر خوش بیاں
ہوا جا کے لندن میں عجب کلام
لرنے لگا اس سے دارالعوام
کہا یوں وطن کیوں ہے میرا نکلام
مجھے قبر کا چاہیے وہ مقام

نکلامی کا سایہ نہ پہنچے جہاں
محمد علی جوہر خوش بیاں
جو دیکھا کہ اب جاں نہیں جان میں
تو قائد کو لایا وہ میدان میں
اضافہ کیا عشق کی شان میں
ہوا دُفن خود دارالایمان میں
اسے کیسے بھولیں گے اہل جہاں
محمد علی جوہر خوش بیاں
سبا فخر ہے مجھ کو اس بات پر
کہ جوہر کے رخ پر پڑی تھی نظر
نقاد یہ اس کی سنیں بیشتر
ابھی دل پہ باقی ہے ان کا اثر
کھینچ حقیقت تھی اس کی زباں
محمد علی جوہر خوش بیاں
(جنوری ۱۹۵۵ء)



میری سنیو میں تم سے مخاطب ہوں

میں پاکستان ہوں تمہاری ماں مٹی
میں نے ان لوگوں کی امیدوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا
جو اب ہم تم میں نہیں
وہ بچے لوگ
جنہوں نے ایک علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا تھا

جہاں وہ اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں
فخر سے خود کو مسلمان کہہ سکیں
وہ بچے لوگ

جنہوں نے اس خواب کی تعبیر کے لیے
اپنی زندگیوں کا سودا کیا تھا
میں انہی خوابوں کی تعبیر ہوں

چوبیس سال کی ہوئی تو پہانج میں گئی
عمر کے بچا سوئی جیسے میں
خوفزدہ اور غیر محفوظ

میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے
یہ کیسا دھواں ہے
جو میری آزادی کی آنکھوں کو

دھندلائے چلا جا رہا ہے
یہ کون سے شعلے ہیں
جو میرے اسلاف کے دکتے چہروں کو

جھلسائے دے رہے ہیں
یہ کیسا خون ہے
جو میرے شہیدوں کے خون کو

جھٹلاتا ہے
یہ کیسی زہرناک سرگوشیاں ہیں
جن کے آگے لے کر ہیں گے پاکستان کی گونج

اردو ناچسٹ 120 اگست 2014ء

بے خوف

شہر کراچی میں اندھی گولیوں کے عجیب و غریب
غلاب سے جنم لینے والی دردناک کہانی

اسم ایمان

”کرارے سمو سے..... مزیدار سمو سے!“

چٹ پٹے سمو سے..... مزیدار سمو سے!“

جو ایک بار کھائے گا..... بار بار آئے گا“

کئی دن بعد سمو سے والے کی آواز آئی تھی۔ شاید
مہینا ڈیڑھ مہینا بعد..... میں چونک گئی۔ پہلے تو بڑی
باتا بندی کے ساتھ سچ گیارہ بارہ کے درمیان اس کی
آواز آتی تھی، اس کے کرارے سموں کی طرح
کراری.....

چٹوری کا خطاب بچپن سے ملا ہوا ہے لہذا چٹ
پٹے اور کرارے سموں کی آواز پر لپک کر میں کھڑکی
سے جھانکتی۔ لیکن نہ مہری آواز اس تک پہنچ سکتی تھی اور
نہ ہی میں کوئی اشارہ کر پاتی۔ جو سموں والے کی چٹ
پٹی اور کراری آواز سنتی رہتی۔ ہاں گھر میں کوئی بچہ ہوتا،
تو اس سے سمو سے منگوا لیتی۔ وہ بڑا سا تھاال سر پر رکھے
ہوتا جس میں ترتیب کے ساتھ جالی سے ڈھکے سمو سے
اوپر تلے جے ہوتے۔ ایک طرف کچھ اور بھی رکھا ہوتا
لیکن صاف نظر نہیں آتا۔ یقیناً ٹیلی فون ڈائریکٹری کے
صفحات سے بے کاغذی لفافوں کا بندل ہوگا اور شاید
توازن کے لیے دو چار پکٹے پتھر.....

بازو پر تین ٹانگوں والے اسلینڈ کو دکائے اور اسی

اردو ڈائجسٹ 121

تازہ افسانہ

ہاتھ سے ایک تھیلہ تھا، تھیلے میں تھیلے تھیلے تھیلے تھیلے
چلتا ہوا زمین بازار کے درمیان کھڑا ہو جاتا۔ پھر دو چار
قدم چل کر آواز ضرور لگاتا

کرارے سمو سے..... مزیدار سمو سے

جو ایک بار کھائے گا بار بار آئے گا!

دکان دار اور گاہک، دونوں ہی اس کی طرف متوجہ
ہوتے۔ لیکن کبھی کبھی وہ یوں ہی کھڑا آواز لگاتا رہتا اور
کوئی اس کے کرارے سموں کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔
کافی انتظار کے بعد آخر تھاال اٹھا سر پر رکھتا اور اسلینڈ
بازو میں لٹکا کر آواز لگاتا آگے نکل جاتا۔



طرف جا رہا تھا۔ اس کی آواز کا کرار اپنی قریبا ختم تھا یا شاید دور ہونے کے سبب مجھے ایسا لگا۔

محلے کے ایک لڑکے کو اشارہ کیا، سمو سے والے کو تو بلاؤ..... وہ دوڑ کر بلا لایا۔ دھیرے دھیرے تھکے تھکے قدموں سے وہ چلتا ہوا آگیا۔ اسٹینڈ بازو میں لٹکائے اسی ہاتھ سے سر پر تھال سنبھال رکھا تھا۔ دوسرا ہاتھ جس میں تھیلا ہوتا، اس سے ایک بچی کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ چھوٹی سی بچی شاید پانچ چھ سال کی ہوگی۔ سمو سے تو میں شاید لڑکے سے بھی مٹا لیتی، لیکن بچی کے بارے میں جو تجسس پیدا ہو گیا تھا، اس نے مجھے نیچے جانے پر مجبور کر دیا۔

”کیوں بھی بچی کو گیوں ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”بس ہانی جی کیا بتاؤں؟ بیٹی کو ساتھ نہ لیے پھروں تو کیسے دھندا کروں..... تنہا گھر پر کیسے چھوڑوں؟“

”تنہا کیوں اس کی ماں کہاں ہے؟“

”وہ جی شہر پر قاتل عنقریب کا سایہ ہے۔ اسی نے میری بیوی کی بھیٹ لے لی۔“ اچھا خاصا مرد درد دل سے بلک بلک کر رونے لگا۔

”اف! کس قدر مشکل ہے کسی مرد کو روتے دیکھنا..... میں کچھ سہم سی گئی۔ بچی کی طرف مڑ کر دیکھا، وہ چہترے پر بیٹھ گئی تھی۔ باپ کے رونے کا اس پر خاص اثر نہ ہوا۔ شاید اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

”اچھا تو نہیں..... کیا ہوا تھا بتاؤ تو سہی.....“

بچی کے اثر نہ لینے پر مجھے ذرا تسکین ہوئی۔

”بس جی میری بیوی گئی میں جھانک کر دیکھ رہی

ایک دن دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل والے نے جاتے جاتے آواز دے کر اسے رکوا لیا۔ موٹر سائیکل پر اس کی بیوی کے ساتھ تین بچے تھے، دو آگے اور ایک گود میں..... شاید ان ہی کی فرمائش پر رکوا لیا گیا۔ پھیری والے نے بڑے اہتمام سے لفافوں میں سمو سے اور ان پر چائے مسالا چھڑک کر دیا۔ بچوں کو بغیر مسالا یوں ہی ہاتھوں میں تھما دیے۔ اس طرح خاندان بھر بے وقت کی بھوک سموں سے مٹا کر آگے روانہ ہو گیا۔

لیکن پھر اس نے آنا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں تک تو گیارہ بجتے ہی اس کی آواز کا انتظار کرتی، کراری اور چٹ پٹی آواز کا..... لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بھول گئی۔ کسی چیز کو بھولنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ شاید اتنی ہی جتنی کسی نئی چیز کا عادی بننے میں..... سائنس دانوں کی تحقیق بتاتی ہے کہ عادت ڈالنے میں تین دن اہم ہوتے ہیں۔ تین دن کی مشکل کے بعد وہ چیز رہنمائی میں شامل ہو جاتی ہے۔

کرارے سمو سے..... مزید ار سمو سے کی آواز آنا بند ہوئی تو وہ بھول کی دلدل میں اتر گیا۔ یوں بھی میں نے تو اس کے چٹ پٹے سمو سے بہت بار چٹکے تھے، البتہ اس کی آواز کا کرار اپنی روٹ سنتی اور مزہ لیا کرتی۔ کئی دن اس کا انتظار کیا۔ ”شاید وہ یہاں کے لوگوں سے مایوس ہو چکا، اسی لیے کسی دوسری آبادی کی طرف چلا گیا۔“ میں یہی سوچتی۔

کراچی کے حالات میں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس دن بچوں کی دین نے ذرا دیر کی اور میں بالکونی میں کھڑی ہو گئی، دعاؤں اور وظیفوں کا سہارا لیے..... نظریں ان کی منتظر تھیں۔ بچوں سے پہلے غیر متوقع طور پر سمو سے والا نظر آ گیا۔ دور دوسری کھلی کی

تھی۔ نہ معلوم کہاں سے اندھی کوئی آئی۔ سیدھا سر کو نشانہ بنایا جی..... میری بیوی دوسرا سانس نہ لے سکی۔ ساتھ میرے ہونے والے بچے کو بھی لے گئی۔ آخری مہینہ تھا۔ پھر وہ ہلکتے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے دلاسا دوں۔ زخموں کو کریدنا تجسس آمیز مزہ دیتا ہے، لیکن مرہم رکھنا بہت مشکل.....

"میں کیا کر سکتی ہوں اس کے لیے؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اچھا مشورہ..... دل نے کہا۔

"بچی کی کوئی خالہ، پھوپھی یا چچی نہیں ہے؟"

"نہ جی میں گاؤں سے اکیلا ہی روزی کمانے آیا تھا۔"

"اچھا یوں کرو، گاؤں جا کر دوسری شادی کر لو..... بچی کو یوں بچی لے کر پھرنا ٹھیک نہیں۔"

"نہ جی گاؤں میں میرا کون ہے؟ وہاں تو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ ماں باپ تو پہلے ہی رب کے پاس جا چکے۔"

وہ میرے مفت کے مشوروں سے اکتا گیا تھا۔ اس کی اکتاہٹ دیکھتے ہوئے میں نے ایک درجن سمو سے لے لیے۔

"دیکھو ہوں کرو، یہیں کوئی لڑکی دیکھ کر دوسری شادی کر لو..... میں نے آخری مشورہ بھی دے ہی دیا۔ اس نے کچھ جواب دیے بغیر قہال سر پر رکھ کر بچی کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گیا۔

سموسوں میں مریج مسالا زیادہ تھا اور وہ تھے بھی تیل سے لتھڑے ہوئے مجھے پسند نہیں آئے۔ اس کی آواز کا مزہ زیادہ تھا، لیکن اب وہ بھی کراہی نہ رہی۔ کتنے ہی دن گزر گئے۔ اس دن گلی محلے میں سنا سنا

طاری تھا۔ رات ہی ہڑتال کی کال دی گئی تھی۔ آدھ درجن آدمی جان سے جا چکے تھے۔ چار بیس اور ایک درجن گاڑیاں جلا دی گئیں۔ یہ تعداد رات کی تھی، دن میں کیا فساد ہو، کسی کو علم نہ تھا۔ ایسے میں سنا سنا طاری ہوتا تو کیا ہوتا؟ بڑی چھوٹی سب سڑکیں ٹریک سے خالی تھیں۔ گلیوں میں موقوف کا عالم تھا۔ آسیب کے سائے کی طرح..... نہ پھیری والوں کی صدا نہ بچوں کی چپک بپک.....

ایسے میں ایک آواز دور سے آئی جیسے گلی کے کنارے سے آرہی ہو۔ میں نے ہانکونی سے جھانکا وہیل چیئر پر سوار ایک فقیر ہاتھوں سے خود ہی پیسے دھکیلتا چلا جا رہا تھا۔ ساتھ میں ایک بچی تھی یا بچہ، دور سے پتا نہیں چل سکا۔ میں اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی اور سوچا بڑا بہادر فقیر ہے، ایسے تسخیر حالات میں بھی بھیک مانگتا پھرتا ہے جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے، کیا اسے نہیں؟ میں نے سوچا۔

فقیر اپنے آپ کو دھکیلتا قریب آ رہا تھا۔ اب نظر آیا کہ وہیل چیئر پر بیٹھنے کا سبب اس کی ٹانگیں تھیں، وہ گھٹنوں سے نیچے غائب تھیں۔ وہ اور قریب آیا اور قریب..... میں پہچان گئی..... یہ تو وہی سمو سے دلا تھا..... اور اس کے ساتھ چلنے والی بیٹی تھی۔ آدھا پا جاما اور بغیر بازو والی قمیص پہنے جس سے اس کے جھلے پاؤں اور بازو صاف نظر آرہے تھے۔

میں کا لہجہ بجاتی وہ مجلسی ہوئی بچی بے خوف تھی۔ سنسان اور آسیب زدہ سڑکوں اور گلیوں میں اب اسے کوئی خوف نہ تھا..... ہاں بھلا اب اسے کس بات کا خوف؟ اس نے موت کا اتنی بار سامنا کیا تھا کہ اب وہ بے خوف ہو چکی تھی۔

تعمیر شخصیت

پہنچ جاؤں گا۔ بس ڈرائیور ایف اسے پاس ایک خوش شکل اور خاصا اسمارٹ نوجوان تھا۔ میزبان بھی بیس اکیس سال میٹرک پاس نوجوان لڑکی تھی۔ پہلے کپہنی سے تربیت پائی اب بسوں میں خوبی و رضا مندی سے اپنا فرض نبھا رہی تھی۔ بس میں سوار ہوتے ہوئے کچھ دیر ان دونوں سے تعارف حاصل کیا۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔

لاہور سے بس مقررہ وقت چھروانہ ہوئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ بس اور اس میں سوار عملے کی کپہنی نے انشورنس کرائی ہوئی ہے۔ دونوں کپہنی کی فراہم کردہ سہولتوں سے خوش تھے۔ بس میں ایک ایل سی ڈی سکرین لگی تھی۔ میزبان نے مائیک پر اعلان کیا۔ آغاز سفر کی مسنون دعا پڑھی۔ سفر سے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ بس جب لاہور سے باہر نکل آئی تو میزبان نے ہیڈ فون اور آج کا اخبار مسافروں میں تقسیم کیا۔ میرے پہلو میں بیٹھا نوجوان اپنا ہیڈ فون نشست کے ساتھ لگے کنکشن میں جوڑا ڈیو سسٹم سے گالے سننے میں محو ہو گیا۔

چند لمحوں بعد مستند و متحرک میزبان سب کو پانی پیش کرنے لگی۔ ایل سی ڈی پر

ہزاروں خوابیں ایسی

ایک عام مسافر انجان مسافروں کو زندگی ڈھنگ سے گزارنے کا انمول سبق دے گیا

خواب مظہر صدیقی

نچی کپہنی کا بس ڈرائیور تھا۔ کہنے لگا ”لوگ خدا وہ سے خوش نہیں ہوتے، ایک بس ڈرائیور انہیں کیسے خوش رکھ سکتا ہے؟“

بس لاہور سے ملتان جانے والی بس میں سوار اپنی سوچ میں غمگن تھا۔ نشست پر بیٹھتے ہی گھرم الوہن کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ٹھیک ساڑھے پانچ گھنٹے بعد ان شاء اللہ ملتان



حالات و واقعات سے باخبر ہوتے اور ایک سیل فون کے ذریعے پوری دنیا سے رابطے میں رہتے ہیں۔

عام آدمی سے لے کر خاص تک جو بھی سفر پر روانہ ہو، آخر تک اپنے پیاروں سے رابطے میں رہتا ہے۔ آج کے جدید دور میں سفر اتنا شاندار، آرام دہ اور خوشگوار ہو چکا کہ مسافر نشست کے اوپر لگی کال بیل بجا میزبان سے پسند کی چیز حاصل کر سکتا ہے۔ بس میں میرے بائیں جانب بیٹھے ایک ڈاکٹر صاحب سیل فون پر بے حد مصروف اور اپنے مریضوں اور عملہ اسپتال سے مسلسل رابطے میں رہے۔ مشورے ہو رہے تھے۔

انگلی نشست پر بیٹھے ایک اسٹیٹ ایجنٹ سیل فون پر اپنا کاروبار بھرپور طریقے سے چلا رہے تھے۔ مال مویشی کی تجارت سے منسلک ایک صاحب بھی مسافروں میں شامل تھے۔ وہ سیل فون پر اتنا اونچا بول رہے تھے کہ تمام مسافران کی بلند و بلند گو ٹیٹنگ سن کر محسوس ہوتے رہے۔

اب وہ واقعہ پیش ہے جو اس مضمون لکھنے کا سبب بنا۔ لاہور سے روانگی کے وقت بس میں موسم کی مناسبت سے ہیٹر چل رہا تھا۔ اوکاڑہ کے قریب کچھ خواتین نے مطالبہ کیا کہ ہیٹر بند کر دیا جائے۔ ڈرائیور نے بند کر دیا۔ اسی اثنا میں کچھل نشست پر بیٹھے ایک بزرگ نے تھکمانہ انداز میں ہیٹر چلانے کو کہا۔ ڈرائیور نے چلا دیا۔ بس کی آخری نشستوں پر ایک ”ماڈرن“ نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ ڈرائیور تک پہنچا اور پنجابی زبان میں کہا ”اساں گرمی تاں مر جاواں گے پاجی! اسے سی چلاؤ۔“ (بھائی جی! ہم تو گرمی سے مر جائیں گے! ایئر کنڈیشنر چلاؤ۔)

ڈرائیور نے ہیٹر بند کیا اور کچھ دیر کے لیے اسے

تقریباً 15 منٹ تلاوت، حمد اور نعت نشر ہوئی اور پھر ایک آرٹ فلم کا آغاز ہو گیا۔ اب سے کچھ زیادہ نہیں تو دس بارہ سال قبل جب کبھی کسی بس پر کوئی آڈیو کیسٹ چلتی تو شور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ اب یہ چلن اور احتجاج ختم ہو چکا۔ نئی کمپنیاں اپنی بسوں میں تلاوت، حمد اور نعت نشر کر کے پہلے طبقے اور پھر فلم، ڈرامے اور گانے دکھانے سے دوسرے طبقے کو خوشی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔

اتنے میں میزبان لبوں پر مسکراہٹ سجائے کھانے کے ڈبے تقسیم کرنے لگی۔ آخری مرحلے میں اس نے تمام مسافروں کو مشروب بھی پیش کیا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار بس میں سفر کیا تھا مگر آج ایک سوچ نے مجھے یہ کارروائی بغور دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

سوچ یہ تھی کہ ہم کتنے خوش بخت و خوش نصیب ہیں..... آج اکیسویں صدی میں ہمیں جو شاندار سفری سہولتیں اور آسائیاں میسر آچکیں، وہ ماضی میں کسی کے تصور میں بھی نہ ہوں گی۔ اب ہم عمدہ سہولتوں کے سنگ آراستہ ہو کر سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے بزرگ، نانا، دادا، ان آسانوں سے محروم رہے۔ آج سے پچاس برس پہلے ایسی پریشانی سفری سہولیات کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ نامور مورخ، محقق، دانشور، بڑی بڑی سلطنتوں کے سلاطین اور شہزادے آج کے دور کی آسانیوں سے محروم رہے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

افلاطون، ارسطو، سعدی، رومی، آکن سٹائن، نیوٹن اور نچانے کیسی کیسی قابلِ قدر ہستیاں آج کی آسائشوں سے مستفید ہوئے بغیر نہ فون ہو گئیں۔ اب تو اکثر گدھا گاڑی والا ریزمی بان، مزدور اور خاکروب بھی دنیا کے

شب گزیدہ قوم

ہم ڈر رہے تھے جس سے وہی بات ہوگئی
سورج ابھی نہ لگا کہ پھر رات ہو گئی
سامان اپنا ہاندھ کر سارے تھے منتظر
پہلی کرن کے ساتھ شروع ہو گا اک سفر
امید پر ہی صبح کی گزری تھی زندگی
اس صبح تک نہ پہنچے کہ پھر رات ہو گئی
تنہائوں کا بوجھ تھا اور دھوپ کا سفر
دھندلے سے راستوں میں بکھر جانے کا بھی ڈر
اس دھوپ میں تھی ہم کو کسی شام کی تلاش
اس شام تک نہ پہنچے کہ پھر رات ہو گئی
گمنا میوں میں ہم نے گزاری طویل رات
ناکامیوں میں ہم نے گزاری طویل رات
چہروں پہ ایک آس تھی آنکھوں میں انتظار
وہ رات دھل نہ پائی کہ پھر رات ہو گئی
شاید ہمارے اپنے گمناہوں کی بات ہے
شاید ہمارے من کی سیاہی، یہ رات ہے
(عمر سلمان)

دل کی بات کہہ رہا تھا۔ اس کی بات کھل ہو چکی تھی۔
میں نے کہا "میاں! ایک حل ہے، ایک آسان حل جو
سب کو خوش کر سکتا ہے۔"
وہ بولا "کیسے سرا"

میں نے کہا "اپنی خواہشوں کو کام دے کر....."

چلا دیا۔ یہ دیکھ کر پیچھے بیٹھے بزرگ شور کرنے لگے کہ
ہیٹر چلایا جائے۔ اس شور و ٹکڑ میں کئی مسافر شریک ہو
گئے۔ کچھ کو گرمی تنگ کر رہی تھی اور کچھ سردی سے کپکپا
رہے تھے۔ مادہ دہبر کے آخری ایام تھے۔ اسی ٹکڑ و شور
میں آدھا سفر طے ہوا اور بس ساہیوال پہنچ گئی۔

میزبان نے ساہیوال پہنچنے کا اعلان کیا، تو شور ختم
گیا۔ وہاں بس نے دس منٹ رکتا تھا۔ مسافروں نے
بس ٹرمینل کا رخ کیا۔ چند مسافر غسل خانے گئے، کچھ
نے سگریٹ سلگائے، دیگر چائے کا شوق پورا کرنے
لگے۔ دو چار نے نماز ادا کی۔ میں خوبصورت انتظار گاہ
میں بیٹھا لوگوں کی نقل و حرکت بغور دیکھتا رہا۔

سوچوں کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ کیسے کیسے لوگ ان
انتظار گاہوں کے بغیر سفر کی مشکلات کا سامنا کرتے
تھے اور آج کتنی آسانیاں مسافروں کو میسر ہیں؟ میں
سوچنے میں مصروف تھا کہ ڈرائیور میرے قریب آیا اور
مجھے انتظار گاہ میں الگ بیٹھا دیکھ کر بولا "نہرا! بڑا مشکل
ہوتا ہے سب کو خوش رکھنا..... سب کی پسند اور ناپسند کا
خیال رکھنا۔ اب یہی دیکھیے کہ کوئی کہتا ہے ہیٹر چلاؤ اور
کوئی اسے ہی چلانے پر اصرار کرتا ہے۔ کتنی سخت سردی
ہے۔ باہر اور مسافر عجیب و غریب فرمائشیں کر کے مجھے
استحسان میں ڈال دیتے ہیں۔ کن طرح سب کو خوش
رکھیں.....؟"

وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولا "لوگ تو خدا سے
خوش نہیں ہوتے..... ایک بس ڈرائیور انھیں کیسے خوش
رکھ سکتا ہے.....؟"

وہ مجھ پہ نظریں گاڑے جواب کا منتظر تھا۔ چونکہ
بس میں سوار ہوتے ہی میں نے اس سے تعارف
حاصل کیا تھا، شاید اسی اہمیت کے خیال سے وہ اپنے

تاریخی داستان

رشتہ دیکھ کر میری شادی کرا دیں تاکہ مشکلات زندگی کا کوئی حل نکلیں سکے۔

”مگر قاضی صاحب نے میری شادی کرائے سے انکار کر دیا۔ ایسی صورت حال میں میں کیا کروں؟ اب ایک ایسے آدمی کی تلاش میں ہوں جو قاضی کے پاس چل کر خود شہادت دے اور اپنے ساتھیوں سے بھی شہادت دلوائے کہ میرا شوہر انتقال کر گیا ہے پانچھے طلاق دے چکا تاکہ میں کسی طرح شادی کر سکوں۔ یا کم از کم دو قاضی کے پاس چل کر یہ کہہ دے کہ یہ میری بیوی ہے اور میں اسے طلاق دیتا ہوں تاکہ عدت گزرنے کے بعد میں دوسری شادی کر لوں۔“

یہ سن کر تاجر نے عورت سے کہا ”اگر تم مجھے چند دینار دو تو اس کے عوض میں قاضی کے سامنے اقرار کر لوں گا کہ تم

جعلی بیوی

ایک تیز و طرار تاجر کا قصہ عجب، اسے ڈرامائی انداز میں منہ کی کھالی پڑی

امیر مزہ بن مشاق احمد

اس زمانے کی بات ہے جب ہم قاہرہ میں مختلف ممالک کے تاجر حضرات کے ساتھ تجارت کی غرض سے جمع تھے۔ سارا دن بازاروں میں کاروبار کرتے شام ہوتی تو عمرو بن عاصؓ سے منسوب مسجد میں جمع ہو جاتے۔ تب آپس میں تبادلہ خیال کرتے اور ایک دوسرے کو کاروباری حالات سے آگاہ فرماتے۔

ایک دن ہم حسب معمول مسجد میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ ملحق ستون کے قریب ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ بغداد کا تاجر ذرا تیز طرار تھا۔ وہ اس عورت کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اللہ کی ہمدی! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ۔ شاید ہم لوگ تمہاری مدد کر سکیں۔

وہ کہنے لگی ”بات یہ ہے کہ پچھلے دن برس سے میرا شوہر غائب ہے۔ اسے بہت تلاش کیا مگر اس کا کچھ اتنا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ اب میری زندگی تنہا گزر رہی ہے۔ میرے پاس مال و افتخار بھی نہیں۔ اس لیے قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی کہ وہ کوئی مناسب



میری بیوی ہو۔ پھر قاضی ہی کے سامنے تمہیں طلاق بھی دے دوں گا۔“

عورت نے روتے روتے چند سکے نکالے جو ایک دینار سے بھی کم تھے اور کہنے لگی: ”اللہ کی قسم! میرے پاس ان سکوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

تاجر نے عورت سے وہ سکے لے لیے۔ اگلے دن وہ عورت کے ساتھ قاضی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ہم دیگر تہار دن بھر اپنے اس بغدادی ساتھی کا انتظار کرتے رہے مگر وہ نہیں آیا۔ اگلے دن جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو ہم نے اس سے دریافت کیا ”کل تم کہاں تھے؟ ہم تمہارا انتظار کرتے رہے۔ ہمیں بتاؤ کیا واقعہ پیش آیا۔“

وہ کہنے لگا: چھوڑو جی! آپ کو میری کل کی غیر حاضری سے کیا لینا دینا۔ میرے ساتھ جو بچی وہ میں بتانا پسند نہیں کروں گا کیونکہ اس میں پیزی سکی ہے۔ ہم لوگوں نے اسے مجبور کیا اور کہا: ”نہیں نہیں! ہمیں حقیقت حال سے آگاہ کرو! شاید اس میں ہمارے لیے کوئی سبق پوشیدہ ہو۔“

پہلے تو اس نے انکار کیا۔ پھر ہمیں بھند دیکھ کر آخر وہ راضی ہو گیا۔ بولا: میں اس عورت کے ساتھ قاضی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عورت نے قاضی کے سامنے بیان دیا کہ یہ اس کے شوہر ہیں جو دس سال سے غائب تھے۔ اب وہ شوہر سے طلاق چاہتی ہے۔ اس لیے قاضی صاحب ان کے درمیان جدائی کرا دیں۔ قاضی صاحب کے دریافت کرنے پر میں نے ان باتوں کی تصدیق کر دی۔ چونکہ اب گواہوں کی بھی ضرورت نہ تھی لہذا قاضی عورت سے مخاطب ہوا: ”کیا تم اپنے شوہر کو اپنے تمام

حقوق سے بری کرتی ہو؟“ وہ کہنے لگی: نہیں نہیں! اللہ کی قسم! میرا اس پر حق مہر ہے۔ نیز دس سالوں کے نان نفقہ کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے۔ میں دس سال سے اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی! اس لیے اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہو سکتی!!“

”عورت کا بیان سن کر قاضی میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: ”دیکھو میاں! اپنی بیوی کا حق دے دلا کر اسے قاری کر دیا جاہلو اپنے ہی نکاح میں رکھو۔“

”میں قاضی کا فیصلہ اور اس مکار عورت کا فریب دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اب صورت یہ بن گئی کہ میں اپنے بیان سے مکر بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی حقیقت بتانے میں میری خلاصی نظر آ رہی تھی۔“

”گواہ لانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ میں قاضی کے سامنے اقرار کر چکا تھا کہ وہ میری بیوی ہے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں کہ اچانک قاضی نے پولیس بلا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا۔“

پولیس افسر نے مجھے حکم دیا کہ اس عورت کو سو دینار دے دو تو تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے۔ میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں نے خاموشی سے سو دینار نکالے اور عورت کے حوالے کر دیے۔ یوں مجھے چند گھنٹوں کے عوض سو دینار کا نقصان بھگتنا پڑا۔ نیز بھری عدالت میں میری جو ذلت و رسوائی اور سبکی ہوئی وہ اس کے علاوہ ہے۔“

یہ کہانی سن کر ہنستے ہنستے ہمارا برا حال ہو گیا۔ بھارا بغداد والا ساتھی مارے شرم و ندامت کے جلد ہی گھر لوٹ گیا۔

۱ استان ہجرت

ایک معصوم بچے کا سفر خود آگہی

ضلع انبالہ کے گاؤں کمال پور میں پیدا ہوا۔
میں میرے گاؤں سے کچھ ہی دور "نہر سرہند"
ہوتی ہے۔ یہ نہر جس مقام سے نکلتی ہے اس
کے قریب میں عظیم صوفی بزرگ حضرت شیخ احمد سرہندی
اور معروف مجدد الف ثانی کا حزار ہے۔ اسی درگاہ کے
قریب کی وجہ سے نہر کا نام "نہر سرہند" معروف ہوا۔ شہر
سرہند شریف بھی اسی مناسبت سے مشہور ہے۔

ہمارے گاؤں کے قریب جانب مغرب راجپوت
مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں "چوٹا" واقع تھا۔ چوٹا
اور کمال پور کے رہائشی مسلمانوں کا ہندوؤں اور سکھوں
پر بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ راجپوت
لڑاکا اور عرسے مارنے والی قوم ہے۔ ان کے پاس
اسلحہ اور سامان حرب و ضرب بھی ہمہ وقت موجود ہوتا

کمال پور سے لاہور تک

پاک وطن کی خاطر بھرا پڑا گھر اور زمین
جائداد چھوڑ کے مہاجر بننے والے گھرانے
کا چشم کشا قصہ الم

چوہدری فرزند علی



درد انگشت

ہے۔ اسی لیے گرد و نواح کے غیر مسلم ان دونوں گاؤں کے راجپوت مسلمانوں سے پر خاش رکھتے اور ان سے مرعوب بھی رہتے۔

سرہند نہر پر ایک پل بنا ہوا تھا۔ یہ پل انگریزوں نے تعمیر کروایا۔ انگریز نے بلاشبہ تاجروں کے بھیس میں برصغیر پر ناجائز قبضہ کیا۔ صدیوں پرانی حکومت چھین کر مسلمانوں کو غلام بنا ڈالا۔ ان پر ظلم و فتن کے دروازے بند کر دیے۔ اس خطہ سرزمین کو جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، لوٹ لوٹ کر یورپ کے عشرت کدے آباد کیے۔ مسلمانوں سے ہتھیائی دولت اور انکی کے چرائے ہوئے علم پڑھ کر یورپ کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریز نہ آتا تو شاید ہم آج بھی بہ لحاظ ترقی صدیوں پیچھے اور ماضی کے اندھیروں میں گم ہوتے۔ انگریزوں کے تعمیراتی اور ترقیاتی کاموں کی طویل فہرست ہے جنہوں نے اس ملک کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

گو یہ کام استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے انجام پائے مگر ان کاموں کا حقیقی فائدہ برصغیر کے عوام ہی کو ملا۔ جہاں تک ہمارے گاؤں یا آس پاس کے ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے، یہ سبھی لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہ رہے تھے۔ بظاہر ان میں کوئی دشمنی نہ تھی۔ ہندو مسلم اور سکھ ایک دوسرے کی خوش غمی اور دیگر تقریبات میں شریک ہوتے۔ لیکن ہندوؤں کے حوالے سے مسلمانوں کے دلوں میں انہماک سا خوف اور ڈر پوشیدہ تھا۔ مسلمان یہ جانتے تھے کہ ہندو دھوکے باز اور مکار قوم ہے اور ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کا یہی خدشہ آخر حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔

زندگی اپنی تمام تر خوبصورتی لیے دھیرے دھیرے رواں دواں تھی۔ اس دوران میں نے بڑوں سے سنا کہ مسلمانوں کا ایک الگ ملک ”پاکستان“ بن رہا ہے۔ وہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت ہوگی۔ دن تو مجھے یاد نہیں البتہ مبینا یقیناً اگست کا ہو گا کہ گاؤں کے قریبی علاقوں میں حالات خراب ہونے لگے۔ ہندو اور سکھ مسلمان آبادیوں پر حملے کر رہے تھے۔ مختلف علاقوں سے خبریں آنے لگیں کہ آج ہندوؤں نے فلاں گاؤں پر حملہ کر دیا۔ فلاں دیہہ کو آگ لگا دی۔ حالات دن بہ دن خراب ہوتے گئے۔ مسلمانوں کو یوں لگ رہا تھا جیسے اب ہندوستان سے جانا ان کا مقدر ٹھہر گیا۔

لیکن بعض مسلمان اپنے گھر بار زمین جائداد اور اپنے آباء اجداد کی قبریں چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہ تھے۔ کئی جذباتی نوجوان اس حد تک تیار تھے کہ اگر ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کیا تو ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ شہید ہو جائیں مگر کفار سے شکست نہ کھائیں اور نہ ہی اپنی دھرتی چھوڑ کر جائیں۔

ہندوؤں اور سکھوں کا طریقہ کار یہ تھا کہ جس مسلمان گاؤں پر حملہ کرنا ہوتا اس کے خلاف کوئی الزام لگاتے یا بہانہ گھڑتے۔ پھر آس پاس کے سیکڑوں دیہات سے ہزاروں ہندو اور سکھ اسلحے سے لیس ہو کر حملہ آور ہوتے اور اس گاؤں کو تہس نہس کر ڈالتے۔ کمال پور کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ ان حالات میں ہندوؤں سے مقابلہ کرنا دانشمندی نہیں کیونکہ ہندو اور سکھ جنوبی کیفیت میں مبتلا تھے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں اکٹھے ہو کر مسلمانوں پر بے رحمی سے حملے کر رہے تھے۔

مسلمانوں کے پاس دفاع کے لیے قابل ذکر ہتھیار بھی نہیں تھے۔ وہ چاروں طرف سے ہندوؤں

اور سکھوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ جس دن پختہ یقین ہو گیا کہ اب کمال پور پر حملہ ہو کر رہے گا تو مسلمانوں نے عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں مردانے کے بجائے وہاں سے نکل جانا بہتر سمجھا۔ جب بزرگوں نے یہ ملک چھوڑنے کا اصولی فیصلہ کر لیا تو ہر شخص اپنے اپنے خاندان کو لے کر جان بچا کسی نہ کسی جانب نکل کھڑا ہوا۔

عام حالات ہوتے تو ہندوؤں کو کبھی کمال پور پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ انھیں معلوم تھا کہ کمال پور کے بہادر راجپوت منہ توڑ جواب دیں گے لیکن اب تو جنوں کی سی کیفیت تھی۔ ایک طرف ہتھیے مسلمان جبکہ دوسری طرف تربیت یافتہ اور مسلح دشمن لہذا بھاؤ کی تدبیر کرنا ہی بہتر تھا۔ ان حالات میں میرے والد صاحب نے اہل خانہ کو ساتھ لیا اور چوٹا آگے۔ اگرچہ چوٹا بھی خطرے میں گھر چکا تھا لیکن کمال پور پر حملے کا زیادہ خطرہ تھا کیونکہ وہ بڑا گاؤں تھا جو ہندوؤں کے دل میں ہمیشہ کاٹنا بن کر چھبتا۔

والد صاحب ہمیں چوٹا چھوڑ کر اگلے دن تنہا کمال پور گئے۔ گھر کی ضروری اشیاء ساتھ لیں، بھینسوں کا دودھ نکالا اور انھیں ہاندھنے کی بجائے آزاد کر دیا۔ پھر پھرے گھر کے دروازے کھلے چھوڑ چوٹا آگئے۔ اس پاس کے کئی علاقوں سے بھی مسلمان وہاں جمع ہو گئے تھے۔ یوں مسلمانوں کا کافی بڑا اجتماع بن گیا۔ بعد میں کمال پور پر واقعی حملہ ہوا۔ بچے کچھ لوگوں کو مار ڈالا گیا بے تماشا لوٹ مار کی مٹی اور گاؤں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

انقلابِ ہست زمانہ

پہلے مسلمانوں کو یقین تھا کہ ہمارا علاقہ پاکستان

میں شامل ہو گا لیکن جب لارڈ مائونٹ بیٹن کی تاریخی بددیانتی اور غیور کے ساتھ کی گئی ساز باز سے راتوں رات یہ فیصلہ ہو گیا کہ سارا علاقہ بھارت کو ملے گا تو پہلے سے مصائب میں گھرے مسلمانوں پر غم و اندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

۔ اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا تب مسلمان اپنے ہی وطن میں حقیقی معنوں میں بے یار و مددگار ہو گئے۔ جس دہلیس میں وہ صدیوں سے آباد تھے اچانک ان کے لیے اجنبی اور پردیس بن گیا۔ لوگ گھر بار کے ہوتے ہوئے بھی بے گھر اور دربدر ہو گئے۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ امیر اور رئیس لوگ خالی ماتھ صرف تن کے کپڑے لیے اپنی عزت جان اور ایمان بچا کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ چلے آئے تھے۔

پاکستان کو ہجرت

بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ تمام لوگ نماز مغرب کے بعد ایک قافلے کی صورت پاکستان روانہ ہوں گے۔ چنانچہ ہمارا قافلہ رات کے اندھیرے میں نکل سفر ہوا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھا لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ قریبی علاقوں کے مسلمان بھی قافلے میں شامل ہونے لگے۔ ایک رات کے اندر شامل ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔

۔ میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا پڑھے بھاڑ خواتین اور بچوں کو بیل گاڑیوں پر سوار کرایا گیا۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ جبکہ ہزاروں افراد پاپیادہ دیوانہ وار اپنی منزل کی جانب

یہ کوئی باقاعدہ کیمپ نہ تھا جس میں مہاجرین کے لیے خیمے لگا کر رہائش کا بندوبست ہوتا۔ ہزاروں افراد کھلے آسمان تلے دھوپ، بارش، آندھی، طوفان اور موسم کے رحم و کرم پر پڑے تھے۔

اگر کسی شخص کے پاس کوئی ذاتی کپڑا یا چادر موجود تھی تو اس نے اسے تان کر سایہ کر لیا۔ ہم نے بھی ایک پٹا پرانا کپڑا تان کر سر چھپانے کے لیے جھکی سی بنالی۔ جب کہ اکثر لوگوں کے پاس چادر بھی نہ تھی۔ وہ یونہی سر برہنہ اور بے سایہ موٹی شدائد کا شکار ہوتے تھے۔ بعض لوگ تو اتنی کسپہری کے عالم میں تھے کہ ان کے پاس پورا تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا نہ تھا۔ کیمپ کے یہ ایام نہایت اذیت ناک اور کریناک تھے۔ ہم لوگ بے وطن مسافر اور خانماں براہِ پناہ گزینوں کی حقیقی تصویر بنے بھوکے پیاسے اور بے یار و مددگار پڑے تھے۔

کیمپ کے اندر اشیائے خورد و نوش ناپید تھیں۔ کسی کے پاس آئل تو کچھ تھا ہی نہیں، اگر تھا بھی تو وہ جلد ختم ہو گیا۔ بھوک، افلاس اور بیماری نے ذیرے ڈال دیے تھے۔ حکومت کی طرف سے ملنے والا راشن بمشکل ایک دن چلتا۔ جو بیمار تھے، ان کا یہاں کوئی پرسان حال نہ تھا۔ والد صاحب پینشن کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ دوائی کا کام و نشان نہ تھا اور نہ ہی کوئی خوراک ملتی۔ ان کی حالت انتہائی خراب ہو گئی۔ یوں سمجھئے کہ وہ قریب المرگ حالت میں پہنچ گئے۔

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ موسم نے بھی عجیب پریشان کن صورت حال پیدا کر دی۔ ایک دن اتنے زور شور سے بارش ہوئی کہ ہر طرف پانی ہی پانی

گھرنے لگے۔ راستے میں آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے علاقوں سے گزرتے ہوئے سخت خطرہ تھا۔ وہ لوگ قافلے پر حملے کرتے، لوٹ مار کر کے مسلمانوں کو قتل کر ڈالتے اور نوجوان خواتین کو ہار لینے۔ اس لیے قافلے میں شامل نوجوان اور گھڑسوار قافلے کی چاروں طرف سے حفاظت کر رہے تھے۔ میرے والد بھی جوان، حاتور اور پہلوان قسم کے تھے۔ اس لیے وہ بھی کئی نوجوانوں کو لیے قافلے کی نگرانی کرتے رہے۔ قافلہ بہت بڑا تھا۔ اس کی لمبائی دو رنک پھیلی ہوئی تھی۔ بیل گاڑیوں اور پیدل افراد کی وجہ سے قافلہ انتہائی سست رفتاری سے چل رہا تھا۔

کئی جگہوں پر ہندوؤں اور سکھوں نے رات کی مار کی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قافلے کے آخری حصوں پر حملے کیے۔ لیکن مسلمان نوجوانوں اور گھڑسوار بہادروں نے منہ توڑ جواب دیا۔ حملہ آور بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ دو تین دفعہ دونوں طرف سے جانی نقصان بھی ہوا لیکن مجموعی طور پر ہمارا قافلہ بحفاظت منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

لدھیانہ کا مہاجر کیمپ

دو راتیں اور پورا دن سفر کرنے کے بعد دوسری رات صبح پو پھٹنے سے پہلے ہم لدھیانہ پہنچے۔ یہ ہمارے قافلے کا پہلا پڑاؤ تھا۔ لدھیانہ پہنچ کر قدرے اطمینان کا سانس ملا کیونکہ کم از کم وہاں سکھوں اور ہندوؤں کے حملے کا خطرہ نہ تھا۔ تاہم مہاجر کیمپ میں مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مہاجر کیمپ لدھیانہ شہر میں ریلوے لائن کے ساتھ قائم کیا گیا۔ یہ بہت بڑی جگہ تھی جہاں ہزاروں کی تعداد میں مہاجرین مقیم تھے۔

دھکم پیل کا ماحول تھا۔ ہر شخص پہلے سوار ہونے کی کوشش میں کسی چیز کی پروا کیے بغیر ایک دوسرے کو ٹاڑتے اور پھچاڑتے آگے بڑھ رہا تھا۔ جوان اور زور آور بوزھوں اور ناتوانوں کو پیچھے دھکیلتے ریل پر سوار ہونے لگے۔ یہ بات ختم تھی کہ جو چڑھ گیا سو چڑھ گیا جو رہ گیا سو رہ گیا۔ حتیٰ کہ عورتوں بوزھوں اور بچوں کو بھی کھڑکیوں کے راستے اندر پھینکا جا رہا تھا۔

میرے والد نے ہمیں بھی کھڑکی کے ذریعے ہی اندر بٹھایا۔ جن لوگوں کو اندر جگہ نہیں مل سکی وہ ریل کی چھت پر سوار ہو گئے۔ گاڑی چلنے والی تھی ہم سب تو اندر تھے لیکن والد محترم کو ابھی تک اندر آنے کا موقع نہ مل سکا۔ آخر وہ بڑی مشکل سے ریل کی چھت پر چڑھ گئے۔ ہمارے سامان کی گٹھڑی جس میں ہمارا زندگی کا کل اثاثہ تھا یعنی ضرورت کے بعض کپڑے اور کچھ دیگر اہم چیزیں پلیٹ فارم پر پڑی تھیں۔

گاڑی چلنے والی تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگ موجود تھے۔ والد نے چند لوگوں سے کہا کہ یہ گٹھڑی انھیں گاڑی کی چھت پر پکڑا دیں مگر انھوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے کھولی اچھی طرح دیکھا اور دوبارہ باندھ کر اپنے سر پر رکھ چلتے بنے۔ ادھر گاڑی بھی چل پڑی۔ یوں ہماری آخری ستاع بھی ہماری آنکھوں کے سامنے لٹ گئی۔

اب ہم صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ پاکستان کی جانب محو سفر تھے۔ یقین جابجے اس وقت میرے بدن پر صرف ایک کرتا تھا۔ میری دھوتی اسی گٹھڑی میں تھی۔ سردی لگ رہی تھی اور میں کانپ رہا تھا۔ آخر آہستہ آہستہ گرمی کی وجہ سے میرا جسم نارمل ہونے لگا۔

ہو گیا۔ میری والدہ بڑے بھائی چھوٹی بہن چند ماہ کا پھوٹا بھائی اور میں ریلوے پٹری کے ساتھ ایک اونچی جگہ پر چادر تان کر بارش سے پناہ لیے بیٹھ گئے۔ بارش نے ہمارا سامان اور کپڑے بھگو ڈالے اور تھوڑی بہت خوراک جو موجود تھی، وہ بھی خراب ہو گئی۔ کئی گھنٹوں کی موسلا دھار بارش کے بعد خدا خدا کر کے موسم صاف ہوا تو ہر کوئی جو کونوں کھدروں میں چھپا ہوا تھا باہر نکل آیا۔ ہر کسی نے اپنے کپڑے اور سامان خشک ہونے کے لیے ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ اونچی جگہ پر رکھ دیا۔

ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ کھیتوں میں فصلیں تباہ ہو چکی تھیں۔ اس سے قبل لوگ آس پاس کے کھیتوں سے کچا اناج اور غلہ توڑ لاتے تھے لیکن بارش نے سب کچھ ختم کر دیا۔ میرے بڑے بھائی اناج اور غلے کی تلاش میں نکلے۔ پانی اتنا زیادہ تھا کہ ان کے پیٹ اور سینے تک آ پہنچا۔ مگر انھوں نے صبر نہیں ہاری۔ وہ بہت دور تک جا نکلے۔ انھیں اور تو کچھ نہ ملا البتہ کھاد کا ایک کھیت نظر آ گیا۔ وہاں سے وہ گئے توڑ لائے۔ ہم سب نے گئے چوسٹے تو کچھ پیٹ کی آگ بجھی۔ اسی طرح دو تین دن ہم نے گئے چوٹیں چوس کر گزار دیا۔ پھر جا کر کہیں راشن ملا۔

مہاجرین کے لیے بننے والے بعد یڈ زلیعہ ریل خوراک آتی۔ اس میں آٹا، چینی، چاول، خشک دودھ اور بھنے ہوئے پنے شامل ہوتے۔ لیکن عموماً ہمیں ایک آدھ چیز ہی ملتی اور وہ بھی آدھی۔ بہر حال ہم نے وہاں طویل اذیت ٹاک اور کرناک وقت گزارا۔ تقریباً دو ماہ بعد بالآخر مہاجر کیمپ سے روانگی کا وقت آن پہنچا۔

ہمیں ریل میں سوار ہونے کا حکم ملا تو زبردست

کی آمیزش تھی اور وہ پینے کے قابل نہ تھا۔
قیامت کی وہ رات

بیس فیروز پور سے کچھ پہلے ریل سے اتار دیا گیا کیونکہ آگے ہندو سکھ دہشت گردوں نے پٹری اکھاڑ دی تھی۔ چنانچہ ریل کے ہزاروں مسافر ایک بار پھر پاپیادہ عازم سفر ہوئے۔ ریل کے طویل اور تھکا دینے والے سفر کی وجہ سے پہلے ہی لوگوں کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اوپر سے بھوک پیاس کی حالت میں پیدل سفر انتہائی دشوار معلوم ہوا۔ خوراک نہ ملنے کی وجہ سے اکثر لوگوں میں کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ بیماروں اور بوجھوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ کئی میل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم فیروز پور پہنچے۔ وہاں ایک جگہ مہاجریمپ قائم تھا۔ ہم ایک بار پھر بھوکے پیاسے کھلے آسمان تلے رات گزارنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ رات میری زندگی کی ایک عجیب خوفناک اور ہولناک رات تھی۔ اکثر لوگوں کے پاس خوراک بالکل نہیں تھی۔ بھوک سے اکثر لوگوں کا برا حال تھا۔ پیاس کی وجہ سے چھوٹے بڑے سب بلک رہے تھے۔ مجھے میں یہ مناظر کبھی نہیں بھول سکتا جب مائیں اپنے بچوں کو کھانا پکھنے کے جھوٹے دلا سے اور لوریاں دے کر سلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں لیکن معصوم بچوں کی خوفناک چیخوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ اُدھر بیمار ایک بوند کو ترستے لواتھیں سے پانی کی فریاد کر رہے تھے۔ یہ لوگ اپنی بیماری اور تکلیف سے کراہ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ان کا کچھ کیا جائے۔ مگر ہر شخص بے بس اور لاچار تھا۔ جوان باہمت لوگ بھی اپنے پیاروں

یہ سفر بھی روح فرسا تھا۔ قدم قدم پر ہندو اور سکھ موت بن کر کھڑے تھے۔ وہ رات کی تاریکی اور دن کے اُجالے میں ریلوں پر حملہ کرتے۔ ریلوں پر حملے کی اطلاعات تسلسل کے ساتھ موصول ہو رہی تھیں۔ ایک مصدقہ اطلاع یہ تھی کہ ہم سے پہلے جانے والی ریل پر مسلح ہندوؤں اور غنڈوں نے حملہ کر کے تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ یہاں تک کہ سکھوں نے معصوم بچوں کو نیزوں میں پرو کر وحشیانہ رقص کیا۔ نوجوان عورتوں کی عصمت دری کی اور پھر انھیں قتل کر دیا یا ساتھ لے گئے۔ اس دوران ایک ایسی ریل بھی لاہور پہنچی جس میں کوئی انسان سلامت نہیں بچا تھا۔ لاہور میں جو مسلمان رضا کار اور شہری مہاجرین کی خدمت پر مامور تھے، وہ اس وقت حیران رہ گئے جب ایک ریل اسٹیشن پر آ کر ٹکی اور پوری ریل سے کوئی ایک شخص بھی نیچے نہیں اُترا۔ بلکہ ڈبوں سے خون نیچے ٹپک رہا تھا اور ریل لاشوں سے ڈٹی پڑی تھی۔

اس طرح کے واقعات سے تمام مسافر سہم گئے۔ ریل سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ جہاں کھڑی ہوتی، گھنٹوں کھڑی رہتی اور چلنے کا نام نہ لیتی۔ اس وقت ہر آن اور ہر پل یہ خوف سوار تھا کہ ابھی سکھ اور ہندو ملوادرین نیزے اور اسلحہ لہراتے ہوئے آئیں گے اور پوری ریل کو خون میں نہلا دیں گے۔ دوران سفر بھوک تو تھی ہی پانی بھی نہ ملتا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے پیاس سے بلک رہے تھے۔ جہاں ریل رکتی وہاں پانی کا نام و نشان نہ ہوتا۔ اگر کہیں پانی کا کوئی کنواں یا گڑھا موجود تھا تو ہندوؤں نے مسلمانوں کو قتل کر کے لاشیں اس میں پھینک دیں۔ اس پانی میں انسانی خون

اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے لگا۔ مہاجرین میں اکثر لوگوں کی کوئی مخصوص منزل متعین نہ تھی بلکہ جدھر جس کا جی چاہا اُدھر کا رخ کر لیا۔

ہماری منزل لیصل آباد میں سمندری کا علاقہ تھی۔ تقسیم سے پہلے وہاں ہمارے کئی رشتہ دار مقیم تھے۔ بس کے ذریعے سفر کرنا تھا لیکن ہماری والدہ محترمہ نے انکار کر دیا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ بسوں میں بہت زیادہ جھوم ہوتا ہے اور لوگ دم گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ سو ہم نے گنڈا سنگھ والا سے پیدل مارچ شروع کر دیا۔ رات کے وقت لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے موجود پارک میں پہلا پڑاؤ ڈالا۔

لاہور کی چکاچوند روشنیاں روشنی اور خوبصورتی میرے لیے بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ میں نے اس سے قبل کوئی شہر نہیں دیکھا تھا۔ اب میں لاہور کی روشنیاں اور رہنمائیاں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سایا۔ ہمیں اپنی سابقہ تمام تکالیف بھول گئیں۔ میں خوش تھا کہ ہم بڑی اچھی جگہ آ گئے ہیں۔

مجھے یاد ہے رات کے وقت ایک شخص گیس کی روشنی میں سرخ قندھاری اناروں کے دانے نکال رہا تھا۔ گیس کی روشنی اور قندھاری انار کے سرخ دانے دونوں ہی چیزیں میرے لیے اجنبیا تھیں کیونکہ زندگی میں پہلی دفعہ دیکھیں۔ گاؤں میں تو دیے اور لائٹیں کے سوا کسی روشنی کا تصور بھی نہ تھا۔ یوں لاہور نے مجھے اپنا دیوانہ بنا لیا۔ اپنی قسمت پر رشک کرنے لگا کہ گاؤں سے نکل کر شہر کی رونقیں اور خوبصورتیاں دیکھنا نصیب ہوئیں۔ اس طرح پاکستان پہنچنے کے بعد ہماری نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔



کی حالت زار دیکھ کر منہ چھپا کر آنسو بہاتے رہے۔ ایک عجیب مشرچا تھا ہر شخص اپنی مصیبت میں گرفتار سرگرداں و پریشان تھا۔ کچھ بچے روتے پلکتے سو گئے۔ کچھ بچوں کے رونے کی آوازیں صبح تک بے چین کرتی رہیں۔ بیماروں کے کراہنے اور ہائے ہائے کی آوازوں نے ماحول کو غمناک بنا دیا۔ صبح ہوئی تو روانگی کا اذن ملا۔ پھر چیخ پکار اور ہڑبویگ مچ گئی۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ بھوک پیاس کمزوری اور نقاہت کے سبب بیشتر لوگ اپنا وجود لے کر بھی چلنے سے قاصر تھے چہ جائیکہ وہ سامان اٹھاتے یا اپنے بیماروں کو ساتھ لیتے۔

ہم نے پھر ایک تلخ 'لرزہ خیز اور دلخراش منظر دیکھا۔ کئی لوگوں نے اپنے سامان پھینک دیے۔ انتہائی بیمار اور انتہائی لاغر بوڑھوں کو بھی وہیں چھوڑا اور صرف اپنی جان لیے پاکستان روانہ ہو گئے۔ آخر ہمارا اجڑا قافلہ صبح سے شام تک سڑک کرنے کے بعد سرحد تک پہنچ ہی گیا۔ جونہی پاکستان کی مقدس سرزمین آئی، لوگوں میں زندگی، امید اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پاک مٹی کو دیکھ کر اس قدر جذبات میں آئے کہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لوگ والہانہ انداز میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ پاکستان کا مطلب کیا "لا الہ الا اللہ" کے نعرے ہائے مستانہ بلند ہو رہے تھے۔

سرحد کے قریب گنڈا سنگھ والا کے مقام پر حکومت پاکستان کی جانب سے کیپ لگایا گیا تھا۔ پاکستانیوں اور مقامی رضا کاروں نے مہاجرین کا والہانہ استقبال کیا۔ انھیں باعزت طریقے سے کیپ میں ٹھہرایا۔ اچھا کھانا پیش کیا اور ان کی ممکنہ حد تک خدمت کی۔ وہاں بھی ایک رات کا قیام رہا۔ اگلے دن صبح سویرے ہر شخص اپنی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

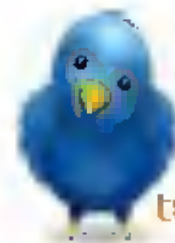
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



حج اکبر

سائرسھے تین لاکھ روپے الہی کامیاں کھڑے کی علی میں
مزدوری کرتا ہے۔ دن افراد کا گھر لانا، دال روٹی پر
مشکل ملتی ہے۔ اوپر سے اکیلا بیٹا، اسے بیماری بھی ایسی
نئی جس کا علاج بادشاہوں کے بس میں ہے۔ وہ مولا
تیرے کام بارے جن کو تو ہی جانتے۔ بندہ بشر کون جو
تیری قدرت کے کارخانے میں ڈھل دے سکتا ہے۔
آپا شہر بانو کی ملازمہ زرینہ نے ایک ہی سانس میں
نرگس کے بیٹے کی بیماری، علاج کا خرچہ اور ساتھ ہی
بھدروں اسب دیکھ سادیا۔

زرینہ کام ختم کر چکی تھی۔ وہ جانے لگی تو آپا
شہر بانو نے کہا ”گھبرا جا، میں چادر لے لوں۔ میرے
ساتھ چل، ذرا نرگس کے بیٹے کی خیر خبر لے آؤں۔
ہمارے محلے دار ہیں، ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔“
نرگس کے گھر دو تین خواتین بیٹھی تھیں۔ بیٹیاں
اسکول گئی ہوئی تھیں۔ آپا شہر بانو نے سلام دعا کے بعد
چارپائی پر بیٹھتے ہی زرینہ سے سنی کہانی دہرا دی۔ نرگس

ایک۔ رحم دل جوڑے کا دل آویز قصہ،
جس نے انمول کار خیر سے اپنے
رب کی خوشنودی حاصل کر لی

سید طاہر نعیم خواجہ زئی

شہر بانو نرگس کا اکلوتا بیٹا سخت بیمار ہے۔
”آپا“ بیماری کو الٹنے کے ساتھ دیشیوں کے بعد
بیٹا عطا کیا تھا۔ سنا ہے، اس کے دل میں
کوئی خرابی ہے، بااگروں نے آپریشن کا مشورہ دیا
ہے۔ مگر یہ بھی بتایا کہ سائرسھے تین لاکھ روپے خرچ
ہوں گے۔ ہائے بچاری نرگس، کہاں سے لائے گی

اردو ڈائجسٹ 136

اگست 2014ء

حسن کے سر پر ہاتھ بھیرا، ہزار روپے کا لوٹا پر سے نکالا اور اس کے سر ہانے رکھ دیا۔ نرمس بہتر اندہ نہ کرتی رہی، آپا شہر بانو کوئی بات سنے بنا زورینہ کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔

.....

آپا شہر بانو کے شوہر حاجی احمد علی کاروباری آدمی تھے۔ دنیا کی ہر آزمائش، کوٹھی کار وغیرہ ہونے کے باوجود وہ اولاد کی نعمت عظیم سے محروم تھے۔ ہر قسم کے علاج کیے، منجس باتیں مگر کچھ کام نہ بنا، سودوئوں میاں بیوی بایوں ہو کر بیٹھ گئے اور اپنی آمدنی حج اور عمرے کی سعادت حاصل کرنے پر خرچ کرنے لگے۔ ہر سال ایک عمرہ اور حج ضرور کرتے۔ کبھی کبھی میاں بیوی کسی غریب نمازی پر بیٹھ کر کوٹھی عمرہ یا حج کرا دیتے۔ انھوں نے زندگی برائے بندگی ہی کو مقصد حیات بنا لیا۔

ہاں کبھی میاں بیوی بیٹھتے تو سونے گھر میں ٹٹھے منے، چلتے پھرتے پھولوں کی خواہش کا تذکرہ چھیڑ بیٹھتے۔ آپا شہر بانو انھیں دوسری شادی کا مشورہ کئی بار دے چکی تھیں۔ حاجی احمد علی ایک ہی جواب دیتے "اگر اللہ نے اولاد کی نعمت اور رحمت سے نوازا ہوا تو تیرے ذریعے ہی نوازے گا۔ حضرت زکریا اور حضرت ابراہیم کو بڑھاپے میں بیٹے عطا کرنے اور ہر شے پر قدرت رکھنے والی ہستی سے بعید نہیں کہ وہ ہمارے خزاں رسیدہ باغ میں بہار لے آئے۔"

آپا شہر بانو اور ان کے میاں جہاں تک ہو سکے، محلے داروں، رشتہ داروں اور ملازموں کے دکھ درد ہانٹتے۔ سخاوت و رحم دلی، حج و عمرے کی سعادت پالنے، نماز، تلاوت، اور درود و وظائف پڑھنے کے باعث لوگ

کے ہونٹ لہ رہے تھے۔ آنکھوں سے ہامتا کی برکھا ساون بھادوں کے مانند برس رہی تھی۔ آپا شہر بانو نے دعا کی صورت چند تسلی بخش جملے کہے "اللہ بے نیاز ہے۔ سارے سبب ہی کے پاس ہیں۔ اس کے خزانوں میں کس چیز کی کمی ہے، وہ تیرے بیٹے کو زندگی صحت اور تندرستی عطا کرے گا۔ لیکن ساتھ ساتھ مالک سے گڑگڑا کر دعا بھی ضرور مانگ! وہ ماں کی دعا نہ صرف سنتا بلکہ قبول بھی کرتا ہے۔"

نرمس کی آنکھوں سے موٹی گر رہے تھے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی "آپا شہر بانو! کہاں سے لاؤں ساڑھے تین لاکھ روپے؟ میاں میرا مزدور، آپ کو پتا ہے، اس کی تنخواہ سے تین وقت کی روٹی، بچپوں کی پڑھائی، کپڑا لٹا اور دوسرے اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے۔ اگر سر چھپانے کا یہ آسرا مکان بھی بیچ دوں، در بدر ہو جاؤں پھر بھی علی حسن کا علاج نہیں کرا سکتی۔ کون نصیبوں جلی ماں ہوگی جو اپنی اولاد کے لیے دعا نہ کرے۔ پھر مجھ جیسی ماں جسے اللہ تعالیٰ نے بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد بیٹا عطا کیا۔ سیکڑوں آستانوں پہ حاضری دی، پلو پھیلا یا، رات کو اٹھ اٹھ کر سوئے مولا کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو کر چلے کائے تو پھر علی حسن اس سوئے مولا نے عطا کیا، میری آنکھوں کی ٹھنڈک، باپ کا سہارا، سات بہنوں کی آنکھوں کا تارا۔"

"جس مولا نے حیرت دعائیں قبول کیں اور تمہیں علی حسن عطا کیا، وہی زندگی اور تندرستی بھی عطا کرے گا۔ دل چھوٹا نہ کر، اس رحیم و کریم کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہو، وہ ضرور آواز سنے گا۔ اپنے رحم و کرم کے در ضرور کھولے گا۔" آپا شہر بانو انھی، چار پائی پر پڑے علی

ان کی بڑی عزت کرتے۔

شام کو حاجی صاحب آئے تو انھیں شہر ہانو کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ نماز مغرب کے بعد انھوں نے بیگم سے پوچھا ”طبیعت تو ٹھیک ہے اداس اداس لگ رہی ہوا“

شہر ہانو نے کہا ”طبیعت تو اللہ کے کرم سے ٹھیک ہے۔“

”تو پھر اداسی اور پریشانی تمہارے چہرے پر کیوں؟“ حاجی صاحب نے پوچھا۔

شہر ہانو نے بیمار علی حسن کا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد جب دونوں میاں بیوی کھانا کھانے بیٹھے تو شہر ہانو نے حاجی صاحب سے پوچھا ”ہر سال ہم حج اور عمرے پر کتنے روپے خرچ کر ڈالتے ہیں؟“

حاجی صاحب نے بتایا ”تین چار لاکھ تو خرچ ہو جاتے ہیں۔“

شہر ہانو نے کہا ”اس سال کے حج اور عمرے کا خرچہ ہم کیوں نہ زمرس کو دے دیں تاکہ وہ اپنے اکلوتے بچے کے دل کا آپریشن کرا سکے۔ اللہ اس کے بچے کو صحت یاب کرے اور ماں کی گود بھری رہے۔ باپ کا آسرا قائم رہے اور بہنوں کا آجکل ان کے سروں پر ہی نکار ہے۔“

حاجی صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ کھانا کھایا، کچھ دیر لان میں ٹہکتے رہے پھر لی دی پر بیوٹ گردانی کرنے لگے۔ پھر الماری سے ایک کتاب نکالی اور کمرے میں لیٹ مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ آپا شہر ہانو بھی اپنا کام مکمل کر کے بستر پر لیٹ گئیں۔ جلد ہی

نیند نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح اٹھے۔ نماز فجر ادا کی۔ تلاوت کلام پاک اور اور درود و تحائف پڑھنے کے بعد آپا شہر ہانو نے ناشتا تیار کیا۔ ناشتے کے بعد حاجی صاحب اپنے شوروم چلے گئے۔ انھوں نے آپا شہر ہانو کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ بیگم نے استفسار کیا۔ تھوڑی دیر بعد زرینہ آ گئی۔ وہ کام کاج کرتے ہوئے محلے بھر کی خبریں بھی آپا شہر ہانو کو سنائے جا رہی تھیں۔ لیکن ان کا دھیان زمرس کے بیٹے حسن کی طرف ہی رہا۔

شام کو حاجی صاحب آئے۔ کپڑے تبدیل کیے۔ بریف کیس کھولا چار لاکھ روپے کی گڈیاں ہاتھ میں پکڑے آپا شہر ہانو کے پاس آئے اور کہا ”یہ لونزمرس کو دے آؤ۔“

موسم بہار میں جب گلاب کی پتھڑی پر اوس مگرے، تو وہ کھل کر گلانی ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال آپا شہر ہانو کا ہوا۔ وہ اتنی خوش ہوئیں کہ حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”آئیے دونوں چلتے ہیں زمرس کے گھر! نیک کام میں دیر کیسی۔“

کچھ ہی دیر میں وہ اپنی منزل پہ پہنچ گئے۔ زمرس کا میاں اور بیٹیاں بھی گھر پر تھیں۔ علی حسن کی بیماری کے متعلق میں نے حاجی صاحب کو بتایا تو کہنے لگے، چلو میں بھی اس کی خیر خبر لے آؤں۔“ آپا شہر ہانو نے تمہید باندھی۔

زمرس اور شیر علی نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ایک بیٹی لپک کر ان کے لیے چائے لے آئی۔ چائے پینے کے دوران ہی آپا شہر ہانو نے اپنا پرس کھولا اور لاکھ لاکھ روپے کی چار گڈیاں زمرس اور شیر علی کے سامنے رکھ

اور علی حسن کو ساتھ بٹھایا۔ پہلے شوروم گئے، اسے کھلوایا پھر اسپتال پہنچے۔ علی حسن کو داخل کرا دیا۔ اسی موقع پر اسپتال کے جملہ اخراجات بھی جمع کرا دیے گئے۔ تین دن بعد علی حسن کو آپریشن کا وقت ملا۔

جس دن آپریشن ہوا تھا، آپا شہر ہانو اور حاجی صاحب بھی اسپتال پہنچ گئے۔ نرگس اور اس کا شوہر پریشان بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر نرگس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا۔ زار و قطار رونے لگی۔ آپا شہر ہانو نے اسے گلے لگایا، تسلی دی اور کہا ”آؤ وضو کریں۔ مصلے پر کھڑے ہو کر بچے کے کامیاب آپریشن کی دعا کریں۔ یاد رکھو، جب ماں اپنی اولاد کے لیے رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرے، تو اس کا انگ انگ مجسم دعا ہو جاتا ہے۔ اور دوا کے ساتھ جب دعا بھی شامل ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ شفا کے کامل عطا فرماتا ہے۔“

دونوں بارگاہ رب العزت میں جھک گئیں۔ دریدہ دل کا دامن پھیلا دیا اور قادر مطلق کے سامنے سر بسجود ہو گئیں۔

طویل دردی کے بعد ڈاکٹر آپریشن تھیر سے باہر آئے اور نوید سنائی کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی خواتین رب تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو گئیں۔ آنکھوں میں تشکر کے موتی چمک رہے تھے۔ حاجی صاحب اور آپا شہر ہانو پھر واپس گھر آ گئے۔ تقریباً دو ہفتے بعد نرگس اور شیر علی بھی علی حسن کو گھر لے آئے۔ رات کو دیگر محلہ داروں کی طرح آپا شہر ہانو اور حاجی صاحب بھی علی حسن کی خیریت دریافت کرتے آئے۔ نرگس اور شیر علی انھیں دیکھ کر فرط مسرت سے اسٹے آب دیدہ ہوئے کہ انھیں شکر یہ ادا کرنے کے لیے الفاظ

دیں۔ غریب میاں بیوی اور ان کی بچیاں اتنی ڈھیر ساری رقم دیکھتے ہی آنکھیں جھپکنا بھول گئے۔ وہ ہنر بنر نوٹوں کی گڈیوں کو تک رہے تھے۔

”لو بھئی، اس رقم سے علی حسن کا علاج کرانا ہے۔ میں نے دل کے ڈاکٹر سے بات بھی کر لی۔ کل علی حسن کو اسپتال داخل کرانا ہے۔ میں سارا بندوبست کر چکا۔ اب یہ رقم سنبھال لو۔“ حاجی صاحب نے کہا۔ شیر علی اور نرگس ہاتھ باندھ کر کہنے لگے ”حاجی صاحب! ہم اتنی بڑی رقم کیسے واپس کریں گے؟ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔“

”بھائی! پابندی تھوڑی ہے، علاج کراؤ، علی حسن ٹھیک ہو گیا تو ایک سال بعد ہر مہینے جتنی رقم تم آسانی سے دے سکو، دے دینا۔“ یہ کہہ کر حاجی صاحب اور آپا شہر ہانو اٹھ کھڑے ہوئے۔

شیر علی کا گھر نامٹم سم کھڑا انھیں جانے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنی ہمت نہ رہی کہ انھیں دروازے تک خدا حافظ کہہ آئے۔ شیر علی کی چھوٹی بچی نے (وڑکر دروازہ بند کیا۔ جب اوٹ آیا، تو نرگس علی حسن سے پوچھ گئی۔ بچیاں باپ سے جا پٹیں۔ شکرانے کے آنسوؤں نے ساری مایوسی و ناامیدی کو پٹا کر اس امید کے سمندر میں پھینک دیا۔ ”سمندر سمندر رحمت تیری، یا اللہ صدقے پیچتن پاک کے، تو نے ہم پر بڑا کرم کیا۔“ نرگس خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

شیر علی نے کہا ”اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں۔ جن کا کوئی نہیں ان کا خدا ہے۔۔۔ نرگس آج ثابت ہو گیا۔“

صبح حاجی صاحب گاڑی لیے آ گئے۔ شیر علی، نرگس

خواب ہے۔ عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے۔ مجھے جلدی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلیے۔“

حاجی صاحب بیگم کو لیے اپنی فیملی لیڈی ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ اور پھر معجزہ ہو گیا۔ لیڈی ڈاکٹر خوشی اور حیرانی کے مارے کچھ لمحے بول نہ سکی پھر بڑی مشکل سے بتایا ”رپورٹ پازیٹو آئی ہے۔ حاجی صاحب مبارک ہو! آپا شہر بانو ماں بننے والی ہے۔ یہ بچہ زمین کیسے فصل کے قائل ہوئی؟ کہاں سے علاج کرایا؟“

حاجی صاحب تو خوشی سے کھل اٹھے۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ مسرت بولے ”اسی ذات واحد علی کل شئی قدیر نے اس بچہ زمین کو ہر ابھرا کیا جس نے ابراہیم اور سارہ کو اسحاق اور حضرت یحییٰ کو بخشی عطا کیے تھے۔“

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپا شہر بانو کی گود بھی ہری کر دی۔ جب چاند سا بیٹا ہوا تو آپا شہر بانو نے اس کا نام ”علی حسن“ رکھا۔ ایک دن حاجی صاحب چہرے پر اطمینان کا نور سہائے بیگم سے کہنے لگے ”دیکھا اللہ نے ہمارا حج اکبر کیسے قبول فرمایا؟“

یہ نہیں مل سکے۔ ان کے آنسو دعا بن کر آپا شہر بانو اور حاجی صاحب کی روح کو بالیدہ کر رہے تھے۔ اٹھتے ہوئے حاجی صاحب نے علی حسن کے سر پر ہاتھ پھیرا، آپا شہر بانو نے اس کا بوسہ لیا۔ حاجی صاحب تب زگس اور شیر علی سے مخاطب ہوئے ”علی حسن اب ہمارا بیٹا ہے۔ تم پر کوئی قرض نہیں، ہم نے اپنے بیٹے کا علاج کرایا ہے۔“

انہوں نے چلتے وقت مزید ایک لاکھ روپے علی حسن کے سر ہانے رکھے اور تیز تیز چلتے گھر سے باہر نکل گئے۔ علی حسن کی خیریت دریافت کرنے آئے سب مہمان حیرانی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے۔ یوں لگتا تھا کہ سب کو سکتہ ہو گیا ہو۔ کچھ لمحے بیچے۔ زگس نے آنسوؤں سے تر روپے کو دو توں ہاتھوں میں اٹھایا اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا ”آپا شہر بانو! اللہ تمہیں بھی علی حسن عطا کرے۔ تیرے کلشن میں بھی بھول اور نکلیاں نکلیں۔“ (آمین)

چند ہفتے بعد علی حسن بالکل ٹھیک ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا۔ دو ماہ گزر گئے۔ ایک دن حاجی صاحب شام گھر آئے تو آپا شہر بانو نے بتایا ”میری طبیعت

قائد کے والدین

محمد علی جناح کا نام ”محمد علی“ ان کے ماموں امیر کبیر موسیٰ قاسم نے رکھا تھا۔ ان کی والدہ بیار سے انھیں محمد کہتی تھیں۔ جناح پونجا کے گھرانے کے ماحول میں یقیناً یہ نئی چیز ہوگی۔ یہ تحقیق تو نئی ہے۔ اس سے پہلے بھی محمد علی جناح کی والدہ کے بارے میں جو معلومات تھیں ان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ ہی دل و دماغ کی نہایت سلیبی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ پانیل کے ایک صوفی بزرگ ”حسن پیر“ سے عقیدت رکھتی تھیں۔ انہی کے اصرار پر محمد علی کو حقیقہ کے لیے حسن پیر کی درگاہ پانیل لے جایا گیا تھا۔ وہاں پورے روایتی انداز سے ان کے حقیقہ کی رسواں ادا کی گئیں۔ ان حقائق سے ظاہر ہے کہ محمد علی جناح کے ماں باپ دونوں روشن دماغ اور روشن ضمیر تھے۔

89% Speculation



ایک روشن چراغ تھا، نہ رہا

خالد اسحاق

ابوالاعجاز عسکری

آئین پاکستان کے خالقوں میں سے ایک،

انتہائی زیرک، سادہ سراج اور دلیر قانون دان کا ذکر خیر

پارلیمنٹ سے باہر لڑی گئی جس میں طرفین کے قانون دان اپنے اپنے ٹیموں پر غور و فکر اور لکھا پڑھی میں مصروف تھے۔ اس زمانے کی متحدہ حزب اختلاف "متحدہ جمہوری محاذ" کے نام سے کہا ہوئی تھی جس کا قانونی دماغ خالد اسحاق تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے

۱۹۷۳ء کی بات ہے، جب آئین پاکستان یہ تشکیل دینے کا مرحلہ شروع ہوا۔ جن دنوں اس پر کام ہو رہا تھا، ایک دن تو قومی اسمبلی میں پڑا جس میں بھی مٹھی سی حزب اختلاف ذوالفقار علی بھٹو کی قوت قاہرہ سے نیرو آزما ہوئی۔ ایک لڑائی

اردو ڈائجسٹ 141 اگست 2014ء

مقدمے لینے بھی چھوڑ دیے اور ساری توجہ اس بڑے کام پر مبذول کر دی۔

بزرگ بتاتے ہیں کہ پروفیسر غفور احمد، مرحوم و مغفور محمود اعظم فاروقی اور محترم سردار شیر باز مزاری جن آئینی نکات سے بھنوکو پریشان کرتے، بلکہ کہیے تختی کا تاج نچاتے، اس کا سبق وہ خالد اسحاق درس گاد ہی سے پڑھ جایا کرتے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں جتنی اچھی باتیں ہیں، وہ انہی کی وجہ سے تھیں اور بھنوشاہی سے وہ جس قدر پاک رہ سکا، وہ بھی خالد اسحاق کی وجہ سے تھا، تو غلط نہ ہوگا۔

آئین پاکستان کے لیے انھوں نے اور جو خدمات انجام دیں، اس کا تذکرہ یوں نہیں ملتا کہ دعوے کرنا اور خدمات گنونا خالد اسحاق کی سرشت میں نہ تھا۔ ہاں ایک بات اس تذکرے میں رہی جاتی ہے اور وہ بھی مرحوم کی زبانی۔ ایک بار اسی آئینی جدوجہد کے حوالے سے انکشاف کیا کہ آئین کے سلسلے میں جتنا کام قانون سازوں اور قانونی ماہرین نے کیا، اس سے بڑھ کر شہید مولانا محمد صلاح الدین نے انجام دیا۔ تفصیل سننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، لیکن بعض دیگر حوالوں سے یہ جانا کہ منتشر الخیال حزب اختلاف کو جمع کرنا اور خالد اسحاق کی رہنمائی پر آمادہ کرنا شہید ہی کا کارنامہ تھا۔

کتاب کے عاشق صادق

خالد صاحب کا تعلق قانون کی دنیا سے تھا۔ وہ کوئی ایسے ویسے قانون دان نہ تھے، بلکہ قانون دان کے ہاتھوں میں ہنٹا اور بولتا۔ تاہم ان کی بڑی وجہ شہرت عظیم الشان لائبریری تھی۔ ایک شخص کی لائبریری کتنی بڑی ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں مختلف اندازے لگائے

جاتے ہیں۔ ایک بار ان کے دفتر چاہا ہوا۔ ملاقات میں تھوڑی دیر تھی۔ معاون سے پوچھ کر ایک طرف چلنا شروع کیا تو واپسی کا راستہ بھول گیا۔ دروازوں کی جگہ چھوڑ کر ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں دکھائی دیں۔ ڈھاکہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جہاں جگہ ملے، وہاں سبزہ لگ آتا ہے۔ اس گھر میں کوئی جگہ ایسی نہیں جو کتابوں سے خالی ہو۔ الماریاں تو بھری ہی ہوتی ہیں، فرش پر بھی کتابیں ہیں۔ باہر کا راستہ ملاٹو میں کتابوں کے رعب میں آچکا تھا۔

مگر یہ نیرت کا پہلا لمحہ نہ تھا۔ پتا چلا کہ اس عمارت سے باہر نکلیں تو سامنے فلینوں کا سلسلہ ہے۔ اس میں ایک، دو تین نہیں، بہت سارے فلیٹ ان ہی کتابوں کے لیے مخصوص ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا، جس روز انھوں نے نئی آنے والی کتابوں کے اندراج نہ کیے ہوں۔

بے شمار مجلے رسالے ان کے ہاں آتے اور نئی کتب کی اشاعت کا پتا دیتے۔ سب خالد صاحب کی نظر سے گزرتے۔ ہر روز وہ نشان لگا کر متعلقہ لوگوں کے حوالے کر دیتے کہ فلاں فلاں کتابیں خرید لی جائیں۔

اصحاب دانش کی محفل

خالد اسحاق ان لوگوں میں سے ایک تھے جو تہذیبوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ ان کا ایک منظر تو ان کی کتابیں ہی تھیں۔ مگر انھوں نے ایک اور اہتمام کر رکھا تھا۔ ہفتہ وار تعطیل کی صبح دس بجے ان کے ہاں اصحاب دانش و بینش کا اجتماع ہوا کرتا۔ اس میں یہ حضرات ہفتہ روزہ کے واقعات اور قوم کو پیش آنے والے امکانی حالات پر کھل کر گفتگو کیا کرتے۔

اس مجلس میں بڑے بڑے دانشور، صحافی،

فرماتے۔ سفید رنگ کی سادہ قمیص پہنتے جو پتلون سے
ہاہر ہوتی، سر پر کروٹیا سے بنی ایک ٹوپی ہوتی۔ اس
لباس میں کم ہی تبدیلی آتی تھی۔ پی ٹی وی والے درس
قرآن کے لیے ان سے درخواست کیا کرتے تھے۔ اس
پر وگرام میں جاتے ہوئے بھی ہالعموم کسی خاص لباس کا
اہتمام نہ ہوتا۔

ایک با اصول شخصیت

خالد اٹخنی اسلامی روایت کے جلو میں پاکستان کی
دو علاقائی زوالات کا سنگم تھے۔ ان کا خاندان پنجاب
سے سندھ آیا تھا۔ والد سندھ میں سول سروس کے اعلیٰ
منصب پر فائز تھے۔ ان کی ساری تعلیم سندھ میں ہوئی
اور وہ اردو، پنجابی اور سندھی یکساں روانی سے بولتے
تھے۔ آپ ۱۳ اگست ۱۹۴۶ء کو شکارپور میں پیدا
ہوئے۔ انگریزی اور عربی پر بھی قدرت حاصل تھی،
بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ گوتالون ان کا اوڑھنا کچھونا
تھا مگر ان کا ایم۔ اے عربی زبان میں ہوا۔

دینی امور کی تعبیر میں ان کی آراء سے تو میں نے
بارہا اختلاف کیا۔ لیکن انھیں کبھی اسلام کے متعلق
محذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے نہیں پایا۔ اللہ کی
کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ سے ان کی وابستگی ہلکتے
اور ناقابل سمجھوتہ تھی۔ اور یہی چیز ان کی شخصیت کا
سب سے نمایاں پہلو تھی اور ان کی امتیازی شناخت
اسی سے عبارت۔

خالد اٹخنی مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو سب کے
سامنے ہے کہ انھوں نے ٹیکس کے بارے میں کبھی
تارہ بندی یا غلط گوشوارے دینے کا رویہ اختیار نہیں کیا۔
شاید وہ بڑے بڑے صنعت کاروں سے بھی زیادہ ٹیکس

سیاستدان، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج
صاحبان، وکلا اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ
شریک ہوئے۔ گفتگو کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی صاحب
ایک مسئلہ اٹھاتے۔ اس پر دیگر احباب باری باری اظہار
خیال کرتے چلے جاتے، یہاں تک کہ گفتگو مکمل ہو
جاتی۔ لوگ توقع کرتے کہ خالد صاحب بات کریں۔
وہ موضوع پر حسب ضرورت مختصر یا طویل گفتگو کرتے۔
اسی دوران مکمل خاموشی ہوتی۔ گفتگو میں جن لوگوں نے
شیں، وہ گھر جاتے ہوئے محسوس کرتے کہ واقعی وہ کوئی
نئی بات جان اور سیکھ کر گھر جا رہے ہیں۔

ان نشستوں کی اپنی ایک تہذیب تھی، ایسا نہیں تھا
کہ جو جہاں آکر بیٹھ جائے۔ اصحاب کی نشستیں علم اور
مرتبے کے مطابق ہوتی تھیں۔ ہم جیسے مبتدیوں کو پچھلی
کرسیوں پر بیٹھنے کا حکم تھا۔ البتہ چائے کبھی کبھار پہلے
مل جاتی۔ کہا کرتے تھے کہ بھی یہ لو جوان ہیں، انہیں
چینی زیادہ دینا۔ ان نشستوں میں حاضر ہونے کی
سعادت مجھے کئی بار حاصل ہوئی۔

ان کی اصول پسندی اور حق بات پر اپنے مفاد کو
ٹھکرا دینے کے کئی واقعات ملتے ہیں۔ جب ایوب دور
میں جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو
انھوں نے اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت
وہ صوبہ مغربی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل تھے۔ اپنے
کیریئر کے سلسلے میں اتنی بڑی قربانی لوگ خال خال ہی
دے سکتے ہیں۔

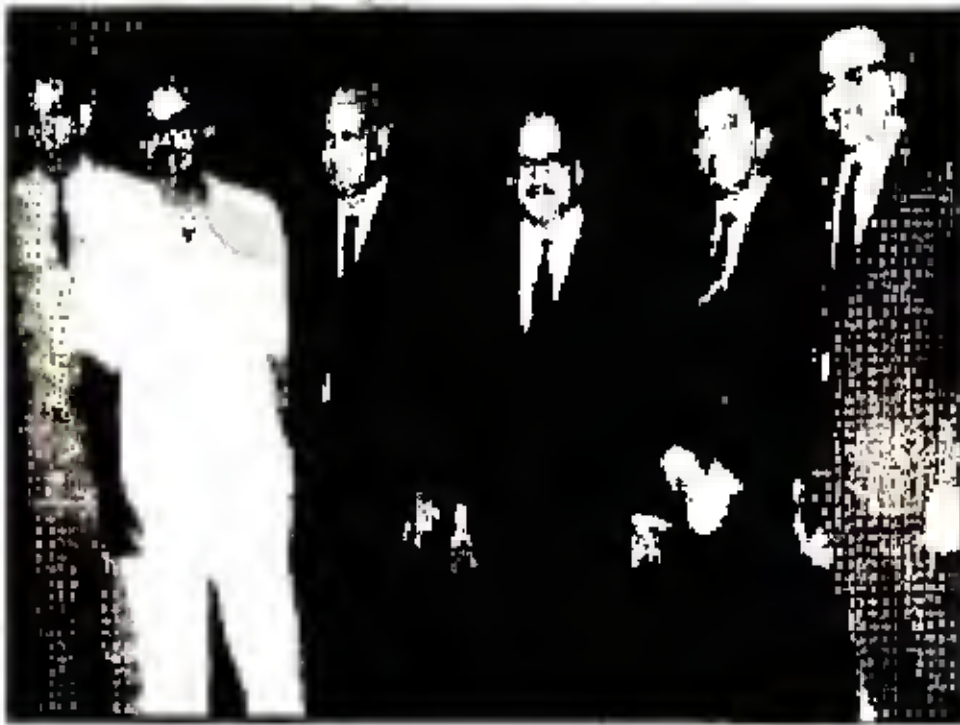
انگریزی تو ظاہر ہے قانون کی زبان ہے، انھیں
عربی پر بھی عبور تھا۔ اس کے علاوہ کم دیش ساری مقامی
زبانیں روانی کے ساتھ بول لیتے۔ ان کے جس ملازم
کی جو مادری زبان ہوتی، اس سے اسی زبان میں گفتگو

لینا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ خاصی ضخیم فاکوں سے واقعات کی تاریخیں اور ان کا تسلسل اعتماد کے ساتھ بالکل درست بیان کرتے۔ ڈپٹس (ریٹائرڈ) غلام رسول شیخ نے ایک بار عدالت میں فرمایا "خالد اسحق آکنو پس کی طرح ایک وقت میں آٹھ آٹھ عدالتوں میں کیس چلاتے ہیں۔"

وقت قیمتی ہے

مرحوم کی زندگی اصول اور لگے بندھے شیڈول کے مطابق رہی۔ تنہا باقاعدگی سے دعا کرتے۔ نماز فجر کے بعد

کے بعد عدالت کے لیے تیاری، اخبار کا مطالعہ اور ہلکا پھلکا ناشر اور پھر مقدمات کی مناسبت سے سوا آٹھ اور ساڑھے



آٹھ کے درمیان عدالت پہنچ جاتے۔ عدالت میں اپنے ساتھ مطالعے کے لیے کوئی کتاب یا خاکل ضرور رکھتے تاکہ کیس کا انتظار کرتے ہوئے وقت ضائع نہ ہو۔ اسی بات کی ہمیں بھی تلقین کرتے۔

مطالعے کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ پوچھنے پر بتایا کہ انگریزی میں لکھے کتابی سائز کے دو سو صفحے ایک گھنٹے میں پڑھ لیتا ہوں۔ عدالت سے جلد فراغت کی صورت میں عموماً کسی کتب فروش کے ہاں پہنچتے اور دنیا

ادا کرتے تھے۔ یہ ان کی دیانت اور قانون کی پاسداری کی روشنی مثال ہے۔ اس سے بھی زیادہ جو چیز میرے لیے متاثر کن تھی وہ ان کا جذبہ انفاق ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کئی غریب خاندان ان کے تعاون سے عزت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور کتنے ہی لائق مگر دسائل سے محروم نوجوانوں نے ان کی مدد سے تعلیم کی منزلیں طے کیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان مساعی کو قبول فرمائے اور ان کو اجر عظیم سے نوازے۔

مرحوم کی آواز شائستہ ہونے کے ساتھ بے حد پات دار تھی۔

ایک ایک لفظ صاف اور تلفظ ڈکشنری کے مطابق، کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ جلدی میں یا اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ کہیں

جج صاحب کوئی سوال نہ کر بیٹھیں۔ اسی بات کی ہمیشہ تلقین کرتے تھے "بولو اس طرح کہ سننے والا آپ کے اعتماد اور سچائی کا یقین کر لے۔ اگر جج کوئی سوال پوچھنا چاہے تو خاموش رہ کر توجہ سے سنو اور واضح جواب دو۔ اگر سوال ماننے کی کوشش کی تو جج صاحب بلا ضرورت کیس کے متعلق شبہ میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔" اس طریقے پر خالد اسحق کو ہمیشہ عمل کرتے پایا۔

ایک دن میں دس سے بارہ مقدمات میں بحث کر

کا فون آیا اور پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ بتایا کہ مقدمے کی تیاری جاری ہے۔ اگلے دن وہ خاتون خالد اسحق کے گھر تشریف لائیں اور ٹیلی فون پر سنائی دینے والا گانا سننے کی فرمائش کی۔ خالد اسحق مسکرائے اور مادام لور جہاں کا لاناگ پلے ریکارڈ گراموفون پر بجنے لگا دیا۔ جب وہ بیگم صاحبہ مطمئن ہوئیں تو وہ ریکارڈ کاغذ میں لپیٹ کر خالد صاحب نے انھیں تحفہ پیش کر دیا۔

کام کی زکوٰۃ

سخت اوقات کار کی وجہ سے خالد اسحق کے کئی معاونین شادی ہوتے ہی اجازت لے کر علیحدہ ہو جاتے۔ سندھ ہائی کورٹ کے ایک موجودہ جج کی شادی اسی سبب خاصی ٹھنڈیوں کا شکار ہو کر ٹوٹے ٹوٹے پڑی۔ آخر انھیں دفتر سے الگ ہونا پڑا۔ ایک اور معاون وکیل، ممتاز احمد شیخ کو شادی کے وقت مشورہ دیا "بھئی شادی کے فوری بعد کے دنوں میں ذرا دیر سے گھر جاؤ۔ تاکہ کچھ دن بعد نارمل وقت پر گھر جاؤ گے تو بیگم صاحبہ خوش ہوں گی کہ ان کی وجہ سے جلد گھر آنا شروع کر دیا۔" ممتاز صاحب نے اس بات پر عمل کیا اور الحمد للہ خوش و خرم ہیں۔

مرحوم خالد اسحق کی غریبوں سے ہمدردی بے حد مثال تھی۔ کئی خاندانوں کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ کئی دکلا کی باقاعدگی سے خیر گیری کرتے۔ کبھی کوئی مقدمہ، کبھی اپنے ساتھ معاونت کے لیے رکھ لیتے یا خاموشی سے ان کی ضرورت پوری کرتے۔ مدد کے لیے ہمیشہ بہانہ تلاش کرتے۔ کسی کا علاج، کسی کے بچے کی تعلیم، گھر کی مرمت، شادی یا غم، غرض اگر معلوم ہو جاتا تو کبھی

کے ہر مضمون پر غنی اور تازہ کتابیں ڈھونڈ کر آرڈر کرتے۔ کراچی کے علاوہ حیدر آباد، سکھر، لاہور، اسلام آباد اور کئی شہروں کے کتب فروش خالد اسحق سے واقف تھے۔ وہ خود ہی نئی کتابیں ان کے گھر بھیج دیتے۔ تمام کتابوں کا اندراج رجسٹر میں ہوتا۔ وہ سرسری طور پر دیکھنے کے بعد کتابوں کی خریداری کا فیصلہ کرتے۔ اس معاملے میں بے حد لبرل تھے اور چاہتے کہ دنیا کی ہر ادنیٰ کتاب جو انگریزی میں لکھی گئی ہو، ان کی لائبریری کا حصہ بنے۔

عدالت کے کام سے فراغت کے بعد گھر آتے اور دوپہر کھانے کے بعد قیلولہ کرتے۔ کبھی عدالت میں دیر ہو جاتی تب بھی سہ پہر چار بجے اپنے گھر آ جاتے۔ وہ وقت نئی کتابوں کی چھان بین اور کتب فروشوں کو ادائیگی کا ہوتا۔ تقریباً ساڑھے چار بجے کراچی چھٹانہ چل دیتے اور باقاعدگی کے ساتھ ٹینس کھیلتے۔ ساتھی احسن ظہیر رضوی نے ایک مرتبہ مشورہ دیا "آپ اسکوئش کھیں نہیں کھیلتے؟"

جواب میں فرمایا "بھئی کھیل وہ کھیل کہ شادیت مار کر خود ہی دوڑنا نہ پڑے۔"

ٹینس سے فارغ ہو کر چیمبرز میں تقریبات نو بجے تک موٹکوں سے ملاقات کرتے۔ نو بجے کھانا اور پھر خیریں سننا ان کا معمول تھا۔ اس کے فوراً بعد لائبریری میں اگلے دن کے مقدمات کی تیاری شروع کرتے۔ عام طور پر رات کو ایک بجے تک معاونین کے ساتھ مصروف رہتے۔ اس دوران گراموفون بھی ہلکی سی آواز بجا رہتا۔

ایک بار ایک ریٹائرڈ جج رات ڈھائی بجے تک خالد اسحق کے ساتھ کام میں مصروف رہے۔ ان کی بیگم

مدد میں دیر نہ کرتے۔ دوستوں اور ضرورت مندوں کے مقدمے فیس لیے بغیر لڑتے۔ ہمیں کہتے "بھئی یہ کام کی زکوٰۃ ہے۔"

اپنی بے پناہ معروضیات کے باوجود گھر کے افراد کو مکمل وقت اور توجہ دیتے۔ مقدمات کے روزمرہ بوجھ کے باوجود اگر اہل خانہ نے سینما جا کر فلم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو ان کا ساتھ دیتے۔ یقیناً خورشید اختر سے تعلق کا یہ حال تھا کہ ۱۲ اگست ۱۹۹۷ء کو فوج گرنے کے بعد وکالت سے مکمل طور پر علیحدہ ہو گئے۔ صحت بھی کافی بگڑ گئی۔ لیکن اگلے سال جونہی خورشید اختر کی بیماری (کینسر) کا پتا چلا، اپنی تمام تکالیف بھول کر یقیناً صاحب کے علاج اور دیکھ بھال میں لگ گئے۔

ان کی زندگی کامیاب گزری۔ بڑی سادہ زندگی گزارنے کی کوشش کرتے۔ ملک کے بڑے قانون دان تھے۔ مالی وسائل انھیں بھرپور انداز میں حاصل تھے۔ یہ صورت حال عموماً "ہوس زر" پیدا کر دیتی ہے لیکن خالد اختر صاحب نے ارادہ اپنے آپ کو اس کیفیت کے غلبے سے محفوظ رکھا۔ انھوں نے جو کچھ کمایا، اس میں جس کا بھی جو حق تھا، اسے پوری دل جمعی سے ادا کیا۔ حکومت کے واجبات پائی پائی ادا کیے۔ ضرورت مندوں اور رشتے داروں کو ان کے حق دیے۔ وہ حسن سلوک اس طرح کرتے کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

درویش صفت انسان

مرحوم نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی ایسے مقدمے لیے جن کے بارے میں یہ علم تھا کہ کامیابی کا صورت میں فریق مخالف پر ناروا ظلم نہیں ہوگا۔ یہ زندگی

کا ایسا میدان ہے جس میں جذبات، مغالطہ، خواہشات اور تعصبات کی غاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنی ہی کوشش کی کہ ان کا دامن ان کانٹوں میں نہ الجھے اور اللہ نے ان کی کوشش کا میاں ہی سے ہمکنار فرمائی۔ وہ "حق" کی حمایت پر آمادہ رہتے، باحق کی حمایت سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔

ایک بار جب میں خالد اختر صاحب سے ملنے گیا، تو میری بارہ سالہ بیٹی بھی ساتھ تھی۔ اسے جب کمرے میں ہر طرف کتابیں نظر آئیں تو اس نے خالد اختر سے سوال کیا کہ انکے آپ سوتے کہاں ہیں؟ آپ کے یہاں تو کوئی بیڈ روم نہیں، سب ریڈنگ روم ہیں۔

انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "یہی ریڈنگ روم ہی میری زندگی ہیں۔ یہ کتابیں ہی میری ساتھی ہیں۔ جب تک میں روزانہ کوئی کتاب نہ دیکھ لوں، مجھے نیند نہیں آتی۔ تم بھی مطالعے کا شوق پیدا کرو۔ یوں تمھارا مشاہدہ تیز ہوگا اور تم اول نمبر سے کامیاب ہو کر دوگی۔" وہ پیٹے کے لحاظ سے تو وکیل تھے اور محض نام کے نہیں، انھوں نے قانون کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا تھا۔ قانون پر کڑی گرفت کے بعد انھوں نے تاریخ اقوام، عالم، قرآن، تفسیر، فقہ، علم الکلام، منطق، ہیئت، جغرافیہ، علم البشریات، فن تعمیر، فن سنگ تراشی، فنون لطیفہ، فلکشن، اقتصادیات، سائنس اور پامسٹری پر ان گنت کتب پڑھ ڈالیں۔ دراصل وہ علم کے پیاسے تھے۔ یہی پیاس انھیں علم کی طرف متوجہ کیے رکھتی۔ پروفیسر حسنین کاظمی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

"خالد اختر کو اللہ کے کرم سے علم کی نہ بچنے والی پیاس بھی ملی تھی۔ یہ ایسی پیاس ہے جسے جتنا سیراب کیا جائے، اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔"

وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ فقر و غنا طبیعت کا خاصہ تھا۔ قانون کی سیزھیاں چڑھتے ہوئے پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ صدر ایوب خان نے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا لگا کر عثمان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی۔ پھر ملک کے نمایاں قانون دانوں کی ایک فہرست تیار کرائی تاکہ ان سے استفادہ کر کے ملک بہتر طور پر چلایا جاسکے۔ اس فہرست میں خالد اختر سر فہرست تھے۔ صدر ایوب خان نے انھیں پاکستان کا ایڈووکیٹ جنرل مقرر کر دیا۔ وہ انھیں ملک و قوم کے مفاد میں ہمیشہ مفید مشورے دیتے رہے۔ تاہم جب ایوب خان نے جماعت اسلامی پر پابندی لگائی تو وہ استعفیٰ دے کر گھر چلے آئے۔

وہ فطرتاً ظالم کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ مقدموں کے ضمن میں بہت دفعہ اعلیٰ عدالتوں میں حاضر ہوئے۔ وہ مقدمہ صرف اس بنیاد پر لیتے کہ حق دار کو اس کا حق ملے اور ظالم اپنے ظلم سے رک جائے۔ وہ کسی پر زیادتی کے رد کار نہ تھے۔ ان کے نزدیک وکالت کا مقصد ظالم کو ظلم سے روکنا تھا، شکست سے دوچار کرنا نہیں۔

ایک بار جماعت اسلامی کے سرکردہ افراد نے خالد

اختر سے رابطہ کر کے اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے رضی کیا۔ انھوں نے بطور ذریعہ وکیل جس طرح جماعت اسلامی کا مقدمہ لڑا اور کامیابی حاصل کی، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ مولانا مسعودی کو پھانسی کی سزا ہوئی تو ان کے وکلا کو مشورے بھی خالد اختر نے ہی دیے تھے۔

قلام اسحاق خاں نے نواز شریف کی پہلی حکومت برطرف کی تو مسلم لیگ نے خالد اختر سے رابطہ کر کے انھیں اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے تیار کیا۔ انھوں نے نواز شریف کا کیس نہ صرف اپنے ہاتھ میں لیا، بلکہ حکومت کو بحال بھی کرا دیا۔

ارباب اقتدار نے انھیں حکومت میں لانے کی خاطر ہزار طرح کے ضمن کیے۔ ایک دفعہ عدالت عالیہ اور تین بار عدالت عظمیٰ میں جج بنانے کی پیش کش بھی ہوئی مگر وہ کسی طرح حکومت کے ایوانوں میں جانے کو تیار نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ حکومت کے مقررہ مشاہرے میں غریبوں کی مدد نہ کر سکیں گے۔ وہ غریبوں اور مستحق افراد کی چوری چھپے بھی ادا کیا کرتے تھے۔ ان کی وفات سے لوگ ان کی مہربانیوں سے محروم ہو گئے۔ آپ نے فروری ۲۰۰۴ء کو دنیا سے منہ موڑ لیا۔

قائد اعظم کے بھائی بہن

محمد علی جناح اپنے سات بہن بھائیوں میں سے سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹی بہن تھیں رمت جو ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئیں۔ پھر بھائی بند علی (پیدائش ۱۸۸۰ء) ان کی پیٹھ پر ایک اور بہن مریم بی (پیدائش ۱۸۸۲ء) مریم کے بعد پھر ایک بھائی احمد علی (پیدائش ۱۸۸۶ء)۔ احمد علی کے بعد دو بہنیں شیریں (پیدائش ۱۸۸۸ء) اور فاطمہ (پیدائش ۱۸۹۶ء)۔ فاطمہ سے چھوٹا ایک بھائی اور تھا جو پیدا ہونے کے بعد عقیقے سے پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کا نام نہیں رکھا گیا صرف ”بچو“ کے عرف سے اسے پکارا گیا تھا۔



دلخراش یا لیں

معصوم بچیوں کی لاشوں سے بٹے

یہ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانی کے عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں تو اس کے روز قریباً ایک سو پاکستانی زائرین پر مشتمل وفد سرہند سے قریب ۲۰ کلومیٹر دور واقع ایک قصبہ براس کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرام مدفون ہیں۔ زائرین کے لیے دو بسیں مخصوص تھیں۔ سیری نشست پاکستانی وفد کے قائد مسٹر جس (درا صدیق چودھری کے ساتھ تھی۔ بھٹہ دہری گٹھڑی سے تیار شدہ غصا اس وقت بھی ان کے ساتھ تھا، اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی تو جس صاحب مرحوم نے غاصب دیہاتی لہجے میں تنگدلی کا اظہار کیا۔

میرے لیے ان کی یہ سنگدلی تھوڑی کا مرغان تھی۔

براس کے

تین کنوئیں

شہدائے تحریک آزادی کی لازوال قربانیوں
کے امین بے جان بھارتی گواہ

عطا الحق تاقی



جسٹس صاحب قیام پاکستان کے بعد مغویہ خواتین تلاش کرانے میں مدد دینے والے کمیشن کے رکن تھے۔ انھوں نے جان پتیلی پر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے بتایا، اس وقت تم سڑک کے دونوں جانب جو ہرے بھرے کھیت دیکھ رہے ہو، ۱۹۴۷ء میں یہاں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے سروں کی سرخ فصلیں کاٹی گئی تھیں۔ تم نے عورت کے کئی روپ دیکھے ہوں گے۔ مگر اس کی بے چارگی اور مظلومیت کا رخ شاید اس طرح دیکھنا ہو جیسا میں نے دیکھا۔ جب مجھے پتا چلتا کہ کسی گاؤں میں مسلمان عورتیں درندوں کے قبضے میں ہیں تو چند سپاہیوں کے ساتھ خون کے پیاسے افراد کے درمیان سے گزر کر ان تک پہنچتا۔ مگر کئی بار یوں ہوا کہ مغویہ ہمیں دیکھ کر ساتھ چلنے کی بجائے اس وحشی کے پہلو میں جا کھڑی ہوتی جس نے اس کے والدین کو قتل کیا اور اسے اٹھا کر اپنے گھر لایا تھا۔

جب ہم اسے یقین دلاتے کہ اب وہ قتل طور پر محفوظ ہے اور اسے غنڈے سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تو وہ ہمارے ساتھ چلنے پر رضا مند ہوتی۔ پھر مغویہ عورتوں کے کیمپ میں پہنچ کر وہ اپنے بچے کچھ کسی عزیز کے گھر لے کر چلیاں لے لے کر روتی۔ جسٹس صاحب نے بتایا: ”میری آنکھوں نے وہ خوں آشام مناظر دیکھے ہیں کہ ایک وقت میں انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ گیا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میری ملاقات ان بچیوں سے بھی ہوئی جو پورے گاؤں کی ملکیت تھیں۔ اس وقت ہم جس علاقے سے گزر رہے ہیں یہاں مسلمان عورتوں کے برہنہ جلوس نکلتے تھے۔

”مگر میں تمہیں ایک واقعہ ضرور سناؤں گا۔“ جسٹس صاحب نے کہا ”ایک بار مجھے اطلاع ملی کہ کسی سید زادی کو ایک بھگلی نے اپنے گھر ڈالا ہوا ہے۔ میں سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں پہنچا اور دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہوا۔ دیکھا مچن میں ایک بچی کھانا کھا رہی تھی اور ایک طرف جائے نماز بھی تھی! اتنے میں دوسرے کمرے سے ادھیڑ عمر کا کالا بھنگ شخص نکلا اور ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی بھگلی تھا۔

اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ منہ سے خون جاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا اور لیٹس کے دامن سے منہ پونچھتے ہوئے کھانا پانی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے نحیف آواز میں پوچھا ”تم اسے لینے آئے ہو؟“

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو ہاتھ میں ایک پونلی تھی۔ وہ سیدھا لڑکی کی طرف گیا اور کہا: ”بھئی! میرے پاس تمہیں الوداع کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اس پونلی میں بس ایک ڈوپٹہ ہے۔“ پھر ڈوپٹہ لڑکی کے سر پر اوڑھاتے ہوئے اس کی آنکھیں چھٹک پڑیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ اٹھاپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

بس تیزی سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ براس قصبہ ایک نیلے پر واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو سٹی کے بنے گھروں سے اچانک بے شمار بچے نکلے اور ہماری بس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس گاؤں میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی۔ چٹاں چہ نٹے نٹے بچوں نے

واقع اور اپنی حقیقی شکل میں موجود تھا۔ لیکن لاشوں کے پٹ جانے کی وجہ سے اس کا پانی پینے کے قابل نہیں رہا تھا، لہذا اب اس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔

وہاں تک پہنچتے پہنچتے ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ گئے۔ غم کی شدت سے زائرین کے کلیجے شق تھے اور آنکھیں سادہ کی طرح برس رہی تھیں۔ خود مجھے یوں لگا، میں ۱۹۷۷ء کی بجائے ۱۹۴۷ء میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ جوان مردوں اور بوڑھی عورتوں کی لاشوں سے یہ میدان انا پڑا ہے۔ وحشی درندے شراب کے نئے میں دھت بھیا تک قہقہے لگاتے بچوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ وہ اپنے والدین اور عزیز و اقربا کی لاشیں پھلاتی کنوئیں کے پاس آتی اور ایک ایک کر کے ان میں پھلانگ لگاتی ہیں۔ کنواں لاشوں سے بھر گیا اس کا پانی کناروں سے بہنے لگا۔ پھر یہ بہتا پانی فریاد کے لیے اس چار دیواری کے نیچے جمع ہو گیا جہاں انہیا کے مزار ہیں۔

وفد میں شامل ایک درویش بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر جوں جوں ان کی ہچکیوں بھری آواز بلند ہوئی زائرین کی آدھکا میں شدت آتی گئی۔ روتے روتے گلے رندھ گئے۔ بھائی تیس برس بعد اپنی بہنوں کی خبر لینے آئے تھے اور پلی بھر کے بعد انھوں نے پھر جدا ہو جانا تھا۔ کئی ہندو اور سکھ عورتیں بھی ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر دلخراش منظر دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے بہتے آنسو خشک کرنے کے لیے اپنے پلو آنکھوں پر رکھ لیے۔ ایک عورت کو دیکھا کہ اس کے چہرے پر شدید کرب تھا۔ وہ ایک ایک زائر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد

سروں پر چوٹ سے کیے ہوئے تھے۔ زائرین بسوں سے اترے اور تدرے بلندی پر واقع اس چار دیواری میں داخل ہو گئے جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انہیا نے کرام مدفون تھے۔ وہاں کئی کئی گز لمبی دو تین قبریں مہینہ طور پر ان انہیا کی تھیں۔ زائرین نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور دعا مانگی۔

دعا سے فراغت کے بعد بسوں کی طرف واپس جانے کے لیے ڈھلان سے اترتے ہوئے اچانک ایک دبلا پتلا ہندو گاندہ جنسں حدیق چودھری کے پاس آیا، ان کے کان میں سرگوشیاں کیں اور پھر زائرین کے آگے آگے چلے گا۔ جنسں صاحب نے ہمیں بتایا، یہ ہندو انھیں بتا کر گیا ہے کہ سکھوں نے اس گاؤں میں وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ سیکڑوں مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی تھی، بے شمار مسلمان عورتوں کو اپنے گھر قید کر لیا تھا۔ وہ آج بھی انہی گھروں میں ہندو ان کے بچوں کی مائیں ہیں۔ نیز یہ کہ سیکڑوں مسلمان لڑکیوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں چھلائیں لگا دی تھیں۔ یہ کنوئیں ان کی لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ ان میں سے تین کنوئیں اس کے علم میں ہیں اور وہ ان کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے۔ یہ خبر آگ کی طرح زائرین میں پھیل گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس شخص کے پیچھے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک ہموار جگہ رک گیا جہاں خود رو پھول لہلہا رہے تھے۔ انہی پھولوں کے نیچے وہ دو کنوئیں تھے جو مسلمان لڑکیوں کی لاشوں سے بھر گئے تھے۔ اب انھیں بند کیا جا چکا تھا۔ وہاں بھی فاتحہ خوانی کی گئی۔ تیسرا کنواں بہت سادے گھروں کے درمیان

نہیں۔ وہ یہ بھی جان جائیں گے کہ اگر اس ملک پر آنچ آئی تو تلواریں ایک بار پھر ہوا میں لہرائیں گی اور بہنوں کی چیخ پکار اندھے کنوؤں میں دم توڑ دے گی۔“
اس نوجوان نے مزید کہا: ”یہ کنوئیں ان بدنیت دانشوروں کو بھی دکھائیں جو پاکستانی قوم کے لیے انہیں دوبارہ کھودنا چاہتے ہیں۔“

واپسی پر ہندو اور سکھ بچے ایک بار پھر ہماری بسوں کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ معصوم لٹکا ہوں سے ہمارے معصوم چہرے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک پیارے سے بچے کو گود میں اٹھایا اور اس کے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بڑباں حال کہا: ”بیٹے اقم تو معصوم ہو، یہ کنوئیں بھی معصوموں کی لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اگر تاریک طوفانی راتوں میں تم ان کنوؤں سے چٹخیں سنو تو ان پر کان نہ رہو اور اصرار۔ ہم یہ امانتیں تمہارے بڑوں کے ہجائے تمہیں سپرد کر رہے ہیں کہ بچے اس دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں۔“

اس نے بے اختیار چیخ ماری اور پھر بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مجھے لگا، یہ عورت ان عورتوں میں سے ایک ہے جن کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں اور آنکھیں پارے لگی ہیں۔

دعا سے فراغت کے بعد سندھ یونیورسٹی کے ایک نوجوان نے مجھ سے کہا: ”یہاں آنے سے پہلے میں اکھنڈ بھارت کا قائل تھا۔ میری گزارش ہے، آپ واپس جائیں تو یہ تجویز پیش کریں کہ جو پاکستانی اپنے دلوں میں پاکستان کے حوالے سے شکوک و شبہات رکھتے ہیں، انہیں یہاں لا کر یہ کنوئیں دکھائے جائیں۔ یہ خونچکاں منظرئی نسل کے ان افراد کو خصوصاً دکھایا جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان تاریخی عوامل کے بغیر قائم ہوا۔“

۱۹۷۷ء کے بعد جنم لینے والی نسل کے افراد یہ کنوئیں دیکھ کر جان جائیں گے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے دارالامان، پاکستان کی خاطر کتنی قربانیاں دی

قومی کردار کی ضرورت

قائد اعظم اسلام آباد کالج لاہور کے خیر طلبہ کی خدمات کی بہت قدر کرتے اور ان پر بہت مہربان تھے۔ ایک بار طلبہ کی ایک مجلس میں جس میں حکیم آغا احمد قریشی بھی موجود تھے قائد اعظم مسلمانوں کے عروج و زوال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کسی طالب علم نے پوچھا: ”آخر ہم میں سب سے بڑی کمی کیا ہے؟“
قائد اعظم: ہندی مسلمانوں میں قومی کردار کی کمی ہے۔ نوجوانوں کو اپنی سیرت کی تعمیر کرنی چاہیے اور قومی کردار پیدا کرنا چاہیے۔

یہ سن کر آفتاب قریشی نے کچھ کہا تو نہیں، لیکن چہرے سے قائد اعظم نے ان کے جذبات پڑھ لیے اور کہا: ”اقم نوجوان اور مجلس ہو اس لیے ہر شخص کو اپنے جیسا سمجھتے ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ زمانے کے انقلابات سے گزرا ہوں۔ مجھے مسلمان قوم کا خوب علم ہے۔ اب حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں۔ مگر اب بھی مسلم قوم میں ایسے افراد موجود ہیں جو ذاتی مفاد کو ملی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔“
مسلمان قوم کی سب سے بڑی ضرورت قومی کردار ہے۔ (پروفیسر سعید راشد علیگ)

لمحاضر فكريه



دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو

بھارتی مسلمان اچھوت بن گئے

سید عاتق محمد

بھارت میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو
معاشرے سے کاٹ کر رکھ دیا ہے۔
دہلا دینے والے حقائق



اردو انجسٹ 152
نومبر 2014ء

لاچار اور تنگ دست ہوتی۔ بڑے مسلم زمین داروں اور وادیوں کو چھوڑ کر بیشتر مسلمان چھوٹی موٹی ملازمتوں کے سہارے ششم پٹنم زندگیاں گزار رہے ہوتے۔

بھارتی مسلمانوں کی بے چارگی، تکالیف اور مسائل دیکھ کر حضرت قائد اعظم اور دیگر قائدین تحریک آزادی کی بصیرت کو داد دینی پڑتی ہے۔ یہ پاکستان ہی ہے جس نے کروڑوں مسلمانوں کو غربت و بے چارگی کی زندگی سے نجات دلائی اور وہ خوشحال و آسائشات سے بھرپور زندگیاں گزارنے کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ آزاد وطن کی برکت سے پاکستانیوں کو جو نعمتیں ملیں، کوئی ان کا انکار کرنے تو یہ ناشکری کی بدترین مثال ہوگی۔

☆☆

بھارت کی آبادی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ ان میں قریباً ۹۵ کروڑ ہندو ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد قریباً اٹھارہ کروڑ (۱۷ اعشاریہ ۱۳ فیصد) ہے۔ بقیہ اقلیتوں میں عیسائی (۱۳ اعشاریہ ۲ فیصد) اور سکھ (۷ اعشاریہ ۱ فیصد) شامل ہیں۔

پانچ کروڑ بھارتی مسلمان شہروں میں بستے ہیں اور باقی دیہات میں، مگر ان کا معیار زندگی ایک جیسا ہے۔..... ۹ اعشاریہ ۹۶ فیصد بھارتی مسلمان غریب گنے جاتے ہیں۔ ان کی روزانہ آمدن ۱۰۰ تا ۵۰۰ روپے کے درمیان ہے۔ بھارت میں جتنے بھی بوجھ اٹھانے والے (پانڈی) اور دیگر سخت اور کمندے کام ہیں، وہ عموماً مسلمان یا دلت ہی انجام دیتے ہیں۔

دیہات میں مقیم مسلمان کھیتوں یا نزدیکی کارخانوں میں بحیثیت مزدور ملازم ہیں۔ شہروں

حسین بھارتی ریاست گجرات کے شہر احمد آباد میں مقیم کھاتے چنے مسلمان تاجر ہیں۔ ان کے پاس کار ہے۔ وہ آسانی پوش علاقے میں رہنے کا خرچ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر علی مجبور ہیں کہ وہ جو ہاپورہ میں رہائش رکھیں۔

جو ہاپورہ ایشیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا گتھو (Ghetto) ہے۔ اس اصطلاح سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں ایک مذہبی فرقے کے لوگ معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارتے ہیں۔ اس مسلم علاقے میں چار لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں۔

علی حسین کی مجبوری یہ ہے کہ احمد آباد کے پوش ہندو علاقوں میں کوئی انھیں گھر فروخت نہیں کرتا۔ نہ ہی کوئی مکان کرائے پر دستیاب ہوتا ہے۔ یہ تنگ صورت حال صرف علی حسین کو درپیش نہیں، احمد آباد بلکہ بیشتر بھارتی شہروں میں مسلمان اچھوت کی حیثیت حاصل کر چکے۔

بھارت میں آج قدم قدم پر مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی نسبت کم تنخواہیں لینے پر مجبور ہیں۔ اکثر ہندو ہاں کیا ان سے تو چن آمیز سلوک کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارتی مسلمانوں کی حالت تار پاکستانیوں کے لیے چشم کشا ہے۔

ڈرا سوچئے، اگر پاکستان نہ بننا، تو عین ممکن تھا آج لاہور، کراچی اور وطن عزیز کے دیگر بڑے شہروں میں صنعت و تجارت پر ہندو ہی چھائے ہوتے۔ یقیناً مغربی پنجاب، بلوچستان، خیبر پختون خواہ اور سندھ میں مسلم آبادی زیادہ ہوتی، مگر ہو سکتا ہے اکثریت بھارتی مسلمانوں کے مانند غریب

ایس ایس کے پرچارک' زیندر مودی سے بھی بھارتی مسلمانوں کو بہتری کی کچھ امید نہیں۔

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک بھارتی مسلمان اپنی حالت بدلنے پر خود توجہ نہیں دیتے وہ پستی و زوال ہی کا شکار رہیں گے۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت آزاد ہوا تو پورے ملک میں مسلمانوں کی وقف جائیدادیں جیسے لاکھ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ بد قسمتی سے مسلمان ان کی حفاظت نہیں کر سکے اور وہ حجاز اذات و بعد انتظامی کی نذر ہو کر ہاتھوں سے نکل گئے۔

بھارتی مسلم دانشوروں کا کہنا ہے کہ اگر آج یہ اوقاف مسلمانوں کی دسترس میں ہوتے تو ان سے صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کی مد میں اربوں روپے آمدن ہوتی۔ اس بھاری رقم کو مسلم کیونٹی پر خرچ کر کے اس کی حالت سدھارنا ممکن تھا۔ اور یوں فنڈز کے لیے باہر سے مدد نہ لینا پڑتی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ۲۰۲۵ء تک بھارت میں ہیں تاہم کبھی کروڑ کے ٹک بھگ مسلمان آباد ہوں گے۔ گویا کرۂ ارض پر یہ انڈویشیا اور پاکستان کے بعد تیسری بڑی مسلم آبادی ہوگی۔ مگر افسوس کہ بیشتر بھارتی مسلمان مجبور و مقہور قوم کے مانند زندگی گزار رہے ہوں گے۔ ہندو اکثریت کا جن انھیں اپنے ظالم پنجوں میں دبوچ چکا ہے۔

اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پاکستان نہ بننے کی صورت موجودہ پاکستانی صوبوں میں بے بیشتر مسلمان ویسی ہی آزادی و خود مختاری سے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہوتے جو آج انھیں حاصل ہے؟



کے مسلمان ڈرائیور، ہارپچا، پھیری والے، چھوٹے دکاندار، قصاب وغیرہ کا پیشہ اپنائے ہوئے ہیں۔ بہت کم مسلمان صاحب جائیداد، خوشحال اور معاشرے میں بلند مقام کے حامل ہیں۔

کیرالہ وادی کشمیر حیدر آباد کن شہر اور نئی دہلی کے علاوہ بیشتر بھارتی ریاستوں میں حقیقتاً مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ اکثریت ان کا استحصال کرتی ہے تو حکومت بھی ان کا مدد انہیں کرتی۔ اسی لیے غربت ملاؤ قسم کی سرکاری اسکیموں سے بھی مسلمانوں کو خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔

بھارتی مسلمانوں کے زوال اور پسماندگی کی ایک بڑی وجہ ان کا ناخواندہ رہنا ہے۔ قول ان کی آبادیوں میں اسکول نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دوم بیشتر مسلمان خود بھی دلچسپی نہیں لیتے کہ اپنے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کریں۔ اسی لیے مسلمانوں کی بیشتر تعداد الف بے پے لکھ پڑھ لینے ہی کو کافی سمجھتی ہے۔

ناخواندہ ہونے کے باعث ہی خصوصاً سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ۲۰۱۰ء کی ایک تحقیقی رپورٹ کی رو سے انڈین سول سروس میں صرف ۲۷ اعشاریہ ۲ فیصد ملازم مسلمان تھے۔ اسی طرح انڈین پولیس سروس میں صرف ۶۵ اعشاریہ ۳ فیصد ملازمین مسلمان نکلے۔ مزید برآں سرکاری محکموں میں عموماً ایسے ہی مسلمان بھرتی کیے جاتے ہیں جو بذریعہ برین واشنگ سیکورٹی کہ لادین بن چکے ہوں۔

۱۹۴۷ء سے بھارت میں کانگریسی لیفٹ اور قوم پرست ہندو حکومتیں آچکیں مگر مسلمانوں کے حالات نہ بدلے بلکہ مزید خراب ہو گئے۔ اب آر

آخری شعبہ

ایک انوکھے فنکار کی حیرت ناک داستان،
اس کے آخری تماشے نے بھی ناظرین کو
گنگ کر دیا

ڈاکٹر سلیم اختر



جب اس نے چاقو نکالا تو وہ ہالٹس پر سکون تھا
صرف اس کی ہر عزم آنکھوں میں مقصد کی
چمک دیکھی جاسکتی تھی۔ اھر خوب صورت
لڑکی بھی خنزیر ہوئے باگھیرائے بغیر لنگی باندھے دیکھ رہی
تھی بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں چاقو کی دھار پر
مرکز اوہ پلکیں جھپکائے بغیر اپنی جانب بڑھتے چاقو کو دیکھ
رہی تھی۔ اس کی سانس ڈکی ہوئی تھی وہ خوف سے پتھر ہو چکی
تھی یا پھر وہ قطعی طور پر بے پروا تھی۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔
اور پھر وہ چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیتا ہے۔ خون
کا فوارہ ابلتا ہے اور وہ کما ہے بغیر گر جاتی ہے۔ اس نے اسے
ایک لمحے کے لیے ایسے مصور کی نظروں سے دیکھا جو تکمیل
کے بعد اپنے شاہکار پر آخری تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس
کے بعد وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھنے میں مدد دیتا ہے۔
تالیوں کی کوچ میں دونوں ناظرین کے سامنے
چمکتے ہیں تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
بلاشبہ وہ بڑا شعبہ باز تھا، اتنا نظمیں کہ دوسرے شعبہ باز
اس کے فن کی قسم کھاتے تھے۔ شعبہ بازوں کی دنیا میں
ہڈنی سے بڑا اور کوئی نام نہ تھا۔ مگر اب اس کے بارے
میں یہ طے تھا کہ یہ ہڈنی سے بھی بڑا فن کار ہے۔
اس نے زندگی شعبہ بازی کے لیے وقف کر رکھی
تھی۔ جہاں دوسرے شعبہ بازوں کا فن ختم ہوتا وہیں
اس کے کارناموں کا آغاز ہو جاتا۔ اسے ہمیشہ
خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی۔ وہ ایسے شعبہ باز
تکمل سچے اور فنکارانہ انداز سے پیش کرتا کہ ناظرین
دنگ رہ جاتے۔ آنکھیں دیکھ رہی ہوتیں مگر عقل تو ضیع
نہ کر پاتی۔ بلاشبہ وہ شعبہ باز کو کرشمہ بنا دیتا۔

زراے انداز سے کہ بعض اوقات تو آمد بھی ایک شعبہ لگتی۔
وہ شو کے دوران ناظرین سے دلچسپ اور شوخ گفتگو کرتا جاتا
ایسی باتیں کہ ناظرین بھی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔
الغرض! شو اس کے فن کی بنیاد تھا۔ خوب
سے خوب تر کی جستجو مطمح نظر اور شعبہ کو کرشمہ بنا دینا
مقصد حیات!

اور پھر ایک دن بڑے بڑے اخبارات میں
اشہار چھپے۔ دیواروں پر بڑے بڑے جہازی پوسٹر
لگے اور لاؤڈ سپیکروں سے گلی گلی میں یہ اعلان کرایا گیا
کہ اس مرحلہ وہ ایسا سچا شعبہ پیش کرے گا کہ حقیقت
سے بڑھ کر حقیقی ثابت ہوگا۔ یہ اس کا آخری شعبہ
تھا۔ اس تکمل ترین شعبہ کے بعد وہ شعبہ بازو
ترک کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دنیا بھر کے شعبہ بازو
کو چیلنج دیا کہ کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں دکھا سکتا اور نہ ہی
مستقبل میں دکھانے کا سوچ سکے گا۔

اس آخری شعبہ کی اتنی تشہیر ہوئی کہ تمام شہر
میں چرچا ہونے لگا۔ یہ شومنت تھا اس لیے آخری
شعبہ دیکھنے تمام شہر امنڈ آیا۔ چنانچہ بے حد وسیع
پنڈال بھی گویا سکڑ گیا۔ سامعین نے دیکھا کہ آج اسٹیج
کا انداز بھی بدلا بدلا سا ہے۔ پہلے تو سیاہ یا گہرے نیلے
رنگ کے پردے ہوتے تھے اور بالعموم اسٹیج نیم تاریک
ہوتا۔ روشنی کا دائرہ ڈال کر شعبہ اُجاگر کیا جاتا مگر اب
اسٹیج روشنیوں میں نہا رہا تھا۔

ایک غیر روایتی بات یہ تھی کہ وہ شعبہ بازو
کے روایتی لباس کے برعکس عام کپڑوں میں ملہوس
تھا۔ اسٹیج بھی بالکل خالی تھا نہ میز نہ اس پر دھری تاش
کی مکتی نہ وہ سیاہ لمبی ٹوپی جس سے وہ کبوتر نکالتا
تھا اور نہ وہ بوتل جسے الٹا کر دینے کے باوجود اس سے

وہ ڈولی کا ریشمی پردہ اٹھاتا تو اندر سے سرخ
جوڑے میں ملہوس دلہن برآمد ہوتی۔ جھومڑیکا اور نتھ
پہنے منہدی لگے ہاتھوں سے آداب بجالاتی۔ وہ اس کا
ہاتھ پکڑا سے دو قدم ہی چلاتا تو سب کی نگاہوں کے
سامنے وہ گھدستہ میں تبدیل ہو جاتی۔ سرخ مگلاب کے
تازہ کھلے پھولوں کا گلدستہ آودا اسٹیج سے اتر کر ہال میں
آتا اور ناظرین میں پھول تقسیم کرتا جاتا۔ خواتین کے
جوڑے میں پھول لگتا تو مردوں کے کوٹ میں۔

جب آخری پھول ایک بچی کو دے کر اسٹیج کی
طرف مڑتا تو لوگ کیا دیکھتے کہ مرکزی دروازے
سے دلہن اندر داخل ہو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں
وہی سرخ مگلاب کا گلدستہ ہے۔ عورتیں گھبرا کر اپنے
جوڑوں پر ہاتھ مار رہیں مگر وہاں پھول موجود ہوتے۔

الغرض ایسے ایسے شعبے تھے کہ ناظرین
تالیاں بجاتے بجاتے تھک جاتے مگر تشفی نہ ہوتی۔
اس نے زندگی تکمیل فن کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ
ہر وقت منت نہا اور حیران کن شعبہ تخلیق کرنے میں لگا
رہتا۔ کہانی کا رُشاعر یا مصور کے مانند وہ بھی یقیناً
تخلیقی فن کار تھا۔ جس طرح کہانی کار اور شاعر الفاظ
اور استعاروں کے شعبہ سے دکھاتے ہیں اور مصور
رنگوں کے بالکل اسی طرح وہ بھی آنکھ کے لیے حیرت
کے منظر تخلیق کرتا۔ وہ خود کو ایک فن کار سمجھتا تھا۔

اس نے دیگر شعبہ بازو کے مانند نہ تو خود کو
جادوگر، جگ جاسٹر یا پروفیسر کہلوانا پسند کیا اور نہ ہی سیاہ
واسکٹ پر خریدے ہوئے چاندی کے میڈل سجاوا۔ یہاں
بھی اس کی انفرادیت تھی کہ وہ ہر شو کے مخصوص مزاج کے
مطابق لباس پہنتا۔ اسٹیج پر اس کی آمد کا انداز جداگانہ ہوتا۔ وہ
روایتی طور پر اسٹیج کے بغلی دروازے سے داخل نہ ہوتا بلکہ اس

پانی نہ گرتا۔ اس کا وہ نائب بھی غائب تھا جس کے کان سے وہ کچے بعد دیگرے اٹھنے لگتا جاتا۔ وہ خوب صورت لڑکی بھی نہ تھی جسے ایک الماری میں بند کر کے وہ نصف درجن تلواریں گھونپ دیتا۔

اسٹیج پر روشنیوں میں وہ تنہا کھڑا تھا اس نے نگاہیں اٹھائیں تو سر ہی سر دکھائی دیے۔ تب وہ یوں گویا ہوا:

”معزز خواتین و حضرات! میں نے تمام عمر آپ حضرات کا دل بہلانے میں بسر کی ہے۔ میری سلی رانی کہ ہمیشہ نیا سے نیا شعبہ پیش کیا جائے۔ آپ معزز خواتین و حضرات کی سرپرستی سے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔“

تالیوں کے شور میں وہ ایک لمحہ ٹکا سب کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ اس نے پھر چند ایسے شعبہ داروں کا تذکرہ کیا جو ناقابل یقین ہونے کی حد تک حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ سامعین نے تالیاں بجا بجا کر گویا اس کی تائید کی۔ اس نے پھر سامعین کو دیکھا۔ ہر ایک نے یوں محسوس کیا کہ یہ نظر صرف اس کے لیے تھی۔ وہ طویل سانس لے کر بولا:

”اگرچہ مجھے آپ کی توجہ اور سرپرستی حاصل رہی۔ آپ کی مسلسل عنایت ہی میری زندگی کا سرمایہ ہے (پر شور تالیاں) اور اگر میری کوئی عزت ہے تو وہ اس شعبہ ہازی ہی کی بنا پر ہے (مزید تالیاں) تاہم آہستہ آہستہ اس شعبہ ہازی کی بے معنویت کا احساس بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے میرا فن مکمل ہوا مجھ میں اکتاہٹ بڑھتی گئی۔ کرشمہ نما شعبہ کے بعد اس کے بے کار ہونے کا تلخ احساس بڑھ جاتا۔“

وہ پھر رکا سامعین سانس روکے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ شعبہ ہازی جس راز سے پردہ اٹھا رہا تھا وہ بذات خود ایک شعبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی: ”جیسے جیسے فن میں پختگی آتی گئی شعبہ کو کرشمہ بنادینے

کا جذبہ شدید تر ہوتا گیا۔ ساتھ ہی ان سب کے بے معنی ہونے کا احساس بھی بڑھ گیا۔ معزز سرپرستو! میرا فن ہی میری زندگی ہے اور میں نے زندگی تکمیل فن کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ لہذا فن کی بے معنویت کا مطلب ہے زندگی کی بے معنویت..... یوں جب زندگی بے معنی ہو جائے تو پھر فن بھی اس میں معنی نہیں بھر سکتا۔ خصوصاً جب فن کے بے معنی ہونے کا آسیب بھی ذہن پر مسلط ہو۔“

اس نے ایک مرتبہ پھر سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور یہ اعلان کیا ”اس لیے میں نے اب خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

اس پر سامعین خوب ہنسے۔ سب نے تالیاں اور سیٹیاں بجا کر اظہارِ پسندیدگی کیا۔ یقیناً وہ کوئی انوکھا شعبہ پیش کرنے والا تھا۔ سب شعبہ ہازی کی اس عادت سے آگاہ تھے کہ وہ ہر شعبہ کے کو حقیقت سے قریب تر کرنے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ ڈرامائی رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سوچ کر سب نے مزید تالیاں بجاائیں۔

تالیوں کی گونج میں شعبہ ہازی نے پستول نکالا اور یوں گویا ہوا: ”معزز ناظرین! یہ اصلی پستول ہے۔ یہ دیکھیے اس میں اصلی گولیاں بھر رہا ہوں۔“

اور پھر وہ سامعین سے مخاطب ہوا:

”جو صاحب چاہیں آ کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔“ دو تین حضرات نے اسٹیج پر جا کر اطمینان کر لیا۔ واقعی پستول اور گولیاں اصلی تھیں۔ کم از کم ان میں کوئی شعبہ ہازی نہ تھی۔ وہ پستول کتنی پر رکھ کر ان سے یوں مخاطب ہوا: ”اچھا تو معزز سرپرستو! خدا حافظ! معزز خواتین و حضرات! آخری سلام..... یہ ہے میرا بہترین مکمل ترین اور آخری شعبہ!“ اس نے پر شور تالیوں میں پستول کی بلبلی دہادی۔

مزاح



"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں....."
 "نہیں مجھے یقین ہے، تجھے بچے شروع ہوتا ہے۔"
 "تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں
 چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہیے کہ کیا بولوں؟
 خیر جناب! تمہرات کے دن چار بچے ان کے مکان
 پہنچا ہوں اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے
 وقت پر پہنچ جائیں۔ مگر دولت خانے پر تو آدم نہ آدم زاد
 سارے مردانے کمرے گھوم جاتا ہوں ہر کھڑکی سے جھانکتا
 بیٹھے بٹھائے جو کرائے رسوائی

سینما کا عشق

قدم قدم پر ستم اٹھانے کے باوجود فلموں سے ناتانہ
 توڑنے والے ایک فلمی عاشق کا کھٹ مسٹھا ماجرا

پطرس بخاری



کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ
 خدا کے۔ اس میں میری سستی کو ذرا دخل نہیں یہ
 سب تصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا
 ہے۔ وہ کہنے کو تو دوست ہیں لیکن خدا شاہد
 ہے کہ ان کی دوستی سے جو نقصان ہمیں پہنچے کسی دشمن
 کے بھی قبضہ قدرت سے باہر ہوں گے۔

جب سینما جانے کا ارادہ ہوتا تو ہفتہ بھر پہلے انہیں
 کہہ دیتا کہ بھی مرزا جی! اگلی جمعرات کو سینما چلو گے؟
 میری مراد یہ ہوتی کہ وہ پہلے سے تیار رہیں اور اپنی تمام
 مصروفیتیں کچھ اس ادھب سے ترتیب دے لیں کہ
 جمعرات کے دن ان کے کام میں کچھ حرج واقع نہ ہو۔
 لیکن وہ جواب میں عجیب قدر رشائی فرماتے:

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں؟ کیا ہم انسان
 نہیں؟ ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی اور پھر کبھی ہم
 نے ایسی بے مردی آج تک برتی ہے کہ تم نے چلنے کو کہا
 ہو اور پھر ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو۔"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیا سا ہو جاتا۔ کچھ دیر
 چپ رہتا اور پھر دلی زبان سے کہتا "بھئی اب کے ہو
 سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میری یہ بات عام طور پر بال دی جاتی، کیونکہ اس
 سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا۔ خیر میں

بہت زور نہیں دیتا صرف ان کو بات
 سمجھانے کے لیے اتنا کہہ دیتا "کیوں بھئی!
 آج کل سینما تجھے بچے شروع ہو جاتا ہے
 نا؟"

"مرزا صاحب عجیب معصومیت کے
 انداز میں جواب دیتے" بھئی یہ ہم کو
 معلوم نہیں۔"

"میرا یہ خیال ہے مجھے بچے ہی شروع
 ہوتا ہے۔"

ہوں ہر شگاف سے آواز دیتا ہوں لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تک آکر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا اور دس پندرہ منٹ بیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ بلائنگ پیپر پر تصویریں بناتا ہوں۔ پھر سگریٹ سلگاتا اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہوکا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آتا اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔

ہر کام کے بعد مرزا صاحب کو آواز دے لیتا ہوں اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں۔ نہا رہے تھے تو شاید غسل خانے سے باہر نکل چکے ہوں لیکن میری آواز مکان کی دستوں سے گونج کر واپس آ جاتی۔ آخر کار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زمانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنا کھولتا خون قابو میں لا کر متانت اور اخلاق بڑی مشکل سے مد نظر رکھ کر پوچھتا ہوں:

”کیوں حضرت..... آپ اندر بھی تھے؟ میری آواز آپ نے نہیں سنی؟“

”اچھا یہ تم تھے میں سمجھا کوئی اور ہے۔“
آنکھیں بند کر کے سر پیچھے ڈال لیتا اور دانت چوس کر خفے کو پی جاتا ہوں۔ پھر کانٹے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں ”تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟“
”کہاں.....“

”ارے بندہ خدا! آج سینما نہیں جاتا؟“
”ہاں ہاں! سینما سینما۔“ یہ کہہ کر دو کرسی پر بیٹھ جاتے اور کہتے ہیں ”میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ایسی جو مجھے یاد نہیں آئی! اچھا ہوا تم لے یاد دلادیا..... ورنہ مجھے رات بھر الجھن ہی رہتی۔“
”تو پھر اب چلیں؟“

”ہاں وہ تو چلیں گے ہی میں سوچ رہا تھا کہ آج

ڈرا کپڑے بدل لیتے خدا جانے دھولی کھنٹ کپڑے بھی لایا ہے یا نہیں! بار بار ان دھویوں کا تو کوئی انتظام کرو۔ اگر نکل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں! اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں بے بس ہوں! صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں۔“

”بھئی مرزا! اللہ مجھ پر رحم کر! میں سینما چلنے کو آیا ہوں! دھویوں کا انتظار کرنے نہیں۔ یاد بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو! پونے چھ بجے اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو!“

مرزا صاحب عجیب مریکا نہ تبسم کے ساتھ کرسی سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی! تمہاری لطافت خواہش آخر پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ پھر یہ کہہ کر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے لیکن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر عجیب ہے کہ اگر میرا اختیار چلے تو قانون کی رو سے انھیں کپڑے اتارنے ہی نہ دوں۔ آدھ گھنٹے بعد وہ کپڑے پہنے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں بھی! میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے تک پہنچ کر مڑ کے دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب! پھر اندر جاتا ہوں! مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہیں۔

”ارے بھائی چلو.....“
”چل تو رہا ہوں! بار! آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟“
”اور یہ تم کیا کر رہے ہو؟“
”پان کے لیے تمباکو لے رہا تھا۔“

تمام رات مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے رہے۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا تو پھر چلنا شروع کر دیتا..... پھر آگے نکل جاتا..... پھر ٹھہر جاتا.....

رستہ نکال لیتا۔

بٹھنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا جیسے ٹکٹ خریدے بغیر اندر گھس آیا اور چوروں کی طرح بیٹھا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں کرسی کی پشت پر کوئی پھھر یا پالتو پسو معلوم ہوتا۔ چنانچہ وہ دائیں طرف سے اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے۔ میں مصیبت کا مارا بھی دوسری طرف جھک جاتا۔ ایک دو لمحے بعد ہی وہ پھھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا۔ چنانچہ ہم دونوں بھی بہت تڑا بدل لیتے۔ غرض یہ دل نگلی یوں ہی جاری رہتی۔ وہ دائیں تو میں بائیں میں بائیں تو وہ دائیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں کیا کھیلا جا رہا ہے۔ دل تو یہی چاہتا کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں ”لے بیٹا، دیکھو تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔“

پچھلے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ”یار تم سے بچھا نہیں بیٹھا جاتا اب جو ہمیں ساتھ لائے ہو تو فلم دیکھتے دو۔“

میں غصے میں آ کر آنکھیں بند کرنا اور قتل عدا خود کشی زہر خوردانی کے معاملات پر غور کرنے لگتا۔ دل میں کہتا ایسی کی تیسری اس فلم کی سوسو تسمیں کھانا کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔ اور اگر آیا بھی تو اس کینت مرزا سے ذکر نہیں کروں گا۔ پانچ بجے تھکنے پہلے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرے والی چٹری بہن کر آؤں گا۔ اپنے اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر لٹکا دوں گا۔ بہر حال مرزا کے پاس نہ پھنگوں گا۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروا سکے بھتے پھر کسی اچھی فلم کا اشتہار دیکھ پاتا تو سب سے پہلے مرزا کے پاس جاتا اور ٹنگو پھر وہیں سے شروع ہو جاتی۔ ”کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات کو سینما چلو گے نا؟“

غرض چلتا دوگنی رفتار سے ہوں اور پہنچتا ان کے ساتھ۔ ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوئے تو اندھیرا گھپ بہتیرا آنکھیں جھپکاتا کچھ بھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز لگاتا ”دروازہ بند کر دو جی۔“ یا اللہ اب جاؤں کہاں..... رستہ کرسی دیوار آدی کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم اور آگے بڑھتا تو سران بالٹیوں سے جا ٹکراتا جو آگ بجھانے کے لیے دیوار پر لگتی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے۔ جہاں ذرا تاریک سا دھبہ دکھائی دے جائے وہاں سمجھتا خالی کرسی ہوگی۔ خفیہ کمر ہو کر اس کا رخ کرتا۔ اس کے پاؤں کو پہچاند اس کے ٹھنوں سے ٹکرا خواتین سے دامن بچا آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا تو وہاں سے نکال دیا جاتا۔

لوگوں کے دھکوں کی بد سے آخر ایک کرسی تک جا پہنچا۔ مرزا صاحب سے کہتا ”میں نہ جانتا تھا کہ جلدی چلو خوا خواہ ہم کو رسوا کر دینا!“

”گدھا کہیں کا!“ اس گفت بیانی سے معلوم ہوتا کہ ساتھ کی کرسی پر جو بزرگ بیٹھے ہیں اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا کہ فلم کون سی ہے؟ اب اس کی کہانی کیا ہے؟ اور کہاں تک پہنچ چکی؟ سمجھ میں صرف اہل قدر آتا کہ ایک عورت ہے جو کسی مسئلے سے نمٹنا چاہتی ہے۔ اتنے میں آگے کی کرسی پر بیٹھے حضرت ایک وسیع اور فراخ انگرائی لیتے۔ اس دوران کم از کم تین سو فٹ فلم گزر جاتی۔ جب انگرائی لپیٹ لیتے تو سر کھانا شروع کرتے۔ اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے بلکہ بازو دیتے ہی خفیہ رکھتے۔ میں مجبوراً سر نیچا کر کے چائے دانی کے دستے کے بیچ میں سے اپنی نظر کے لیے

تاریخ کہانی

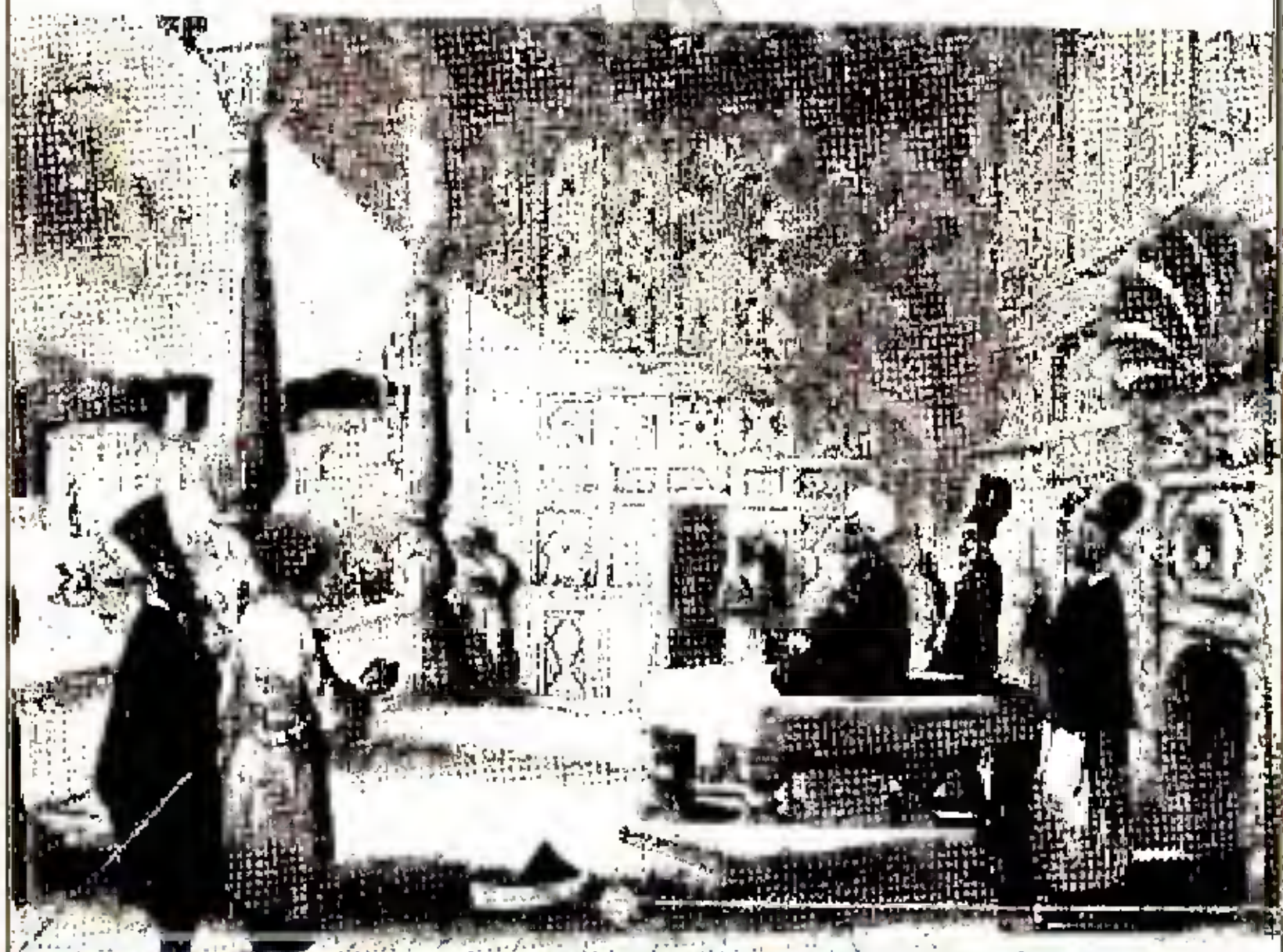
شاہ افغانستان کی واپسی

چشمی قسط

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے جب احمد شاہ ابدالی نے جدید افغانستان کی بنیاد رکھی۔ لیکن یہ تب سے مقامی اور عالمی قوتوں کی سازشوں اور خفیہ چالوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ ماضی میں ان سازشوں کے مرکزی کردار شاہ شجاع شاہ زمان انگریز اور سکھ تھے۔ یہ دو طاقتور افغانستان پر حکومت کرتے رہے۔ ”شاہ افغانستان کی واپسی“ اسی دور کی سازشیں اور چالیں عیاں کرتی ہے۔

دور حاضر میں افغانستان کی سیاسی صورت حال مزید پیچیدہ ہو چکی۔ ایک طرف امریکا و بھارت ہیں۔ دوسری طرف طالبان اور تیسری سمت افغان حکومت جس کی عمل داری صرف کاہل تک محدود ہے۔ اب یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ افغانستان کا اصل حاکم کون بنتا ہے۔ فی الحال ماضی کی طرف پلٹے جب سابق حکمران شاہ شجاع سکھ اور انگریز اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑنے میں مصروف تھے۔

پروفیسر محمد فاروق قریشی



مجموعی اعتبار کی تفصیل: افغانستان، پاکستان کا شمالی ہمسایہ ملک ہے۔ یہ کوہ ہندو کش کی برف پوش چوٹیوں اور پہاڑی دروں کے درمیان پہاڑی میدان اور سرکاری خطوں پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۶۵۰,۰۰۰ مربع میل ہے اور وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مغربی ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تین کروڑ ہے جو تاہک ازبک، خزار، دریائی، بلوچی اور پشتون قبائل پر مشتمل ہے۔ یہاں قبائل کے درمیان خون کے جنگوں اور لڑائیاں ہوتی رہتی اور جنگجو سرداروں کے درمیان اتحاد بننے گزرتے رہتے ہیں۔ کل وقوع کے اعتبار سے مالی بساط پر افغانستان کی اہمیت منفرد ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں افغانستان مالی و اقتصادی طاقتوں روس اور برطانیہ کے درمیان سرد جنگ کا میدان بن گیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔

۱۷۷۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے دریائی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس میں موجودہ افغانستان، پشاور، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور کشمیر کے علاقے شامل تھے۔ احمد شاہ ابدالی کا تعلق سیدوزئی قبیلے سے تھا۔ ۱۷۷۱ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ ۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کے انتقال کے بعد اس کے چوتھے بیٹوں میں جانشینی کی لڑائی چھڑ گئی۔ یہاں چار شاہ زمان، شاہ محمود اور شاہ شجاع نے یکے بعد دیگرے اقتدار سنبھالا۔ شاہ شجاع نے ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۹ء تک افغانستان پر حکومت کی۔ پھر اس کے سوتیلے بھائی شاہ محمود نے سیدوزئی مخالف قبیلے بارک زئی سے مل کر شاہ شجاع کو ہلاک کی لڑائی میں شکست دی اور تخت سے محروم کر دیا۔ شاہ شجاع کچھ عداوت مانھیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گیا اور کشمیر کے گورنر کی قید میں رہا۔ شجاع کی بیوی وفاقہ یکتہ سیدوزئی حرم اور بچوں کے ساتھ لدھیانہ میں انگریزوں کی مصلحت داری میں پناہ لے چکی تھی۔ اس نے پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ سے مذاکرات کر کے شاہ شجاع کو کشمیر سے واپس دلوائی لیکن اس کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کو لاہور میں نظر بند کر دیا۔ دوران حراست میں کوخت انڈیش اور مصائب برداشت کرنے پڑے۔ اس کے بیٹے کو اس کے سامنے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا گھر ملہ ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ پھر شجاع سے اس کی سب سے قیمتی شے ایک گولہ بھرا بھیجتھا لیا گیا۔ پھر بھی اس کو واپس نہ ملی۔ مجبوراً شجاع نے اپنے وفادار ملازمین کی مدد سے ایک سرنگ کھودی اور اس کے راستے لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ واپس کے بعد وہ لدھیانہ میں انگریزوں کے سپہ سالار کے طور پر اپنی بیوی و اولاد تکم سے جاملے۔

تیس سالہ جلاوطنی کے دور میں شجاع نے تین مرتبہ اپنا تخت و تاج حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پہلی مرتبہ اس نے کچھ فوج اکٹھی کر کے کشمیر پر حملہ کیا لیکن ہمساز کار موسم اور دشوار گزار راستے کی وجہ سے ناکام رہا۔ دوسری مرتبہ اس نے پھر وفاقہ یکتہ کے زور و جوش و خروش سے فوج بھرتی کی اور سندھ کے رستے قحط حار پر حملہ آور ہوا لیکن بارک زئی حکمرانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کی فوج ہار ہو گئی اور خود اسے بھاگ کر اپنی جان بچانا پڑی۔ تیسری مرتبہ اس نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے ساتھ فی ہمت کے ذریعے پشاور پر قبضہ کر لیا لیکن اپنے غیر ضروری تکبر اور شان و شوہ کے لیے اسے اپنے اتحادی ہزاروں کی تعداد ہاں کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ پھر اس کو لدھیانہ میں پناہ لینا پڑی۔

شاہ شجاع اپنے کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کے لیے چوتھی اور آخری مرتبہ انگریزوں کی افدس آدری کے ہمساز افغانستان پہنچا۔ افغانستان پر بالادستی حاصل کرنے کی گریٹ گیم (Great Game) میں روس نے برطانیہ کو سفارتی شکست دے دی۔ اور افغانستان کے طاقتور امیر دوست محمد خان کے ساتھ سفارتی اور فوجی معاہدے کر لیے۔ جواب اسی فزول کے طور پر ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل ہارڈن آک لینڈ نے فوجی قوت کے بل بوتے پر جلاوطن شاہ شجاع کو کچھ تکی ہار شاہ کے طور پر افغانستان کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۸۳۸ء میں شاہ شجاع اور برطانیہ کی افدس آدری کی مشترکہ فوجی کا آغاز کیا گیا۔

جولائی ۱۸۳۸ء میں میک ٹیکنن نے لدھیانہ میں شاہ شجاع سے ملاقات کی اور اس کو منصوبے سے آگاہ کیا۔ شجاع منصوبہ سازی میں شامل نہ کیے جانے پر ناخوش تھا لیکن اس کے پاس اس کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے انگریزوں سے یمنین واپائیاں حاصل کیں کہ اس کے خاندانی اور ملکی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ نیز افغانستان کی تعمیر نو کے لیے مالی امداد دی جائے گی۔ اس طرح برطانیہ رنجیت سنگھ اور شجاع کے اتحاد و ملاش کے نتیجے میں شجاع نے چوتھی مرتبہ اپنے تخت کی بازیابی کے لیے افغانستان کا رنجیت سفر باندھا۔ پہلی ایڈن اپنے ایک خط میں شملہ کے فرحت بخش موسم اور وہاں کے ذرا اور دافس پارٹیوں کی تعریف کرتی ہے۔ لاہر آگ لینڈ شملہ میں افغانستان پر حملے کے پروگرام کو آخری شکل دے رہا تھا۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے اس منصوبے پر شکوک کا اظہار کیا لیکن میک ٹیکنن اور

اس کے تحت گیر ساقیوں نے اس کو حملے پر آمادہ کر لیا۔ لارڈ آف لینڈ نے "شملہ منشور" کا اعلان کیا جس میں اس ارادے کا اظہار کیا گیا کہ برطانیہ افغانستان تحت کے اصل حقدار شاہ شجاع کی فوجی مدد کرے گا تاکہ وہ اپنا تخت دوبارہ حاصل کر لے۔ تاریخ میں اس کو پہلی جنگ افغان جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنگ منصوبے کے مطابق انگریز ہندو برٹس کو سر کا خطاب دے کر سندھ روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ فوجوں کے سفر میں سہولت پیدا کرے۔ برطانیہ، رنجیت سنگھ اور شجاع کی افواج فیروز پور میں جمع ہوئیں۔ فوجی دستوں اور چھیاریوں کی شاندار پرلہ ہوئی۔ وہاں آف لینڈ اور رنجیت سنگھ کی پہلی ملاقات ہوئی۔ رات کے کھانے پر لیٹی رنجیت سنگھ کی سمر انگیز شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اس کو اپنی ویکی کشید کردہ شراب پلائی۔ اگلے دن سرخ درویشوں میں ملبوس اندرس آرمی کے تیزہ بردار سوار، پیادہ اور گھڑ سوار دستے بے شمار اہول۔ اہلیوں، گھوڑوں، توپوں، گولہ بارود، اشیائے خورد و نوش کے ہمراہ شکار پر کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں انھوں نے دربار پر کشنوں کا پہل تعمیر کیا۔ فوج نے دریا کو پار کر کے بلوچستان کے راستے افغانستان کا سفر اختیار کیا۔ یہ ایک طاقتور اور محبوب کن فوج تھی لیکن راستے کی بھوک، پیاس، بے انتہا گرمی اور بلوچی ڈاکوؤں کے حملوں نے اس کی سلامتی کو خطرات پیدا کر دیے۔ علاقہ بے آباد، خمر، پیاز کی صحرا کی مانند تھا۔ بہت سے سپاہی اور دوسرے ملازم موت کا شکار ہو گئے۔ خوراک کی بھی قلت ہو گئی۔ غرضیکہ انتہائی ناساھد موگی حالات، سفر کی صہوتوں اور ڈاکوؤں کے خوف و ہراس نے فوجی جوانوں کو کمزور اور عاجز کر دیا۔ آخر کار وہ درہ بولان سے گزر کر کوئٹہ پہنچ گئے۔ کوئٹہ سے آگے وہ درہ کھوجک سے گزرے اور طویل مہر آزا سطر کے بعد افغانستان میں داخل ہو گئے۔ راستے میں ان کا واسطہ اچکزئی قبیلے کے بادشاہ گھڑ سواروں سے ہوا۔ وہ ان سے پوچھتے تھے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ جنرل ناٹ ان کی وجاہت اور بے خوفی سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جواب دیا کہ شاہ شجاع دوست محمد سے اپنا حق واپس لینے آیا ہے۔ افغان نے جواب دیا کہ اگر تم وہاں اور بنارس پر حق رکھتے ہو تو دوست محمد کا بل پر حق رکھتا ہے اور وہ اس کو قائم رکھے گا۔ جنرل ناٹ کو یقین ہو گیا کہ افغان لڑے بغیر اپنا ملک نہیں چھوڑیں گے۔

جب اندرس آرمی قندھار کے قریب پہنچی تو برٹس کے سرافزساں صوبہ دار لال کشمیری کو اطلاع ملی کہ دوست محمد کا قریبی ساتھی حاجی خان کا کڑا دو سوسا قیوں سمیت شجاع کے ساتھ مدد و فواداری کے لیے تیار ہے۔ حاجی خان کا کڑا ایک حریف، بے خمیر اور ناقابل اعتماد شخص تھا۔ اب وہ شاہ شجاع سے قندھار میں حصہ اور مراعات چاہتا تھا۔ آئندہ چند دنوں میں مزید افغان امرا شجاع سے آئے۔ ۲۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو شجاع، قاتماند انداز میں قندھار میں داخل ہوا۔ برٹس اور میک نیکنس جن اس کے ہمراہ تھے، راستے میں شہر کے لوگوں نے شاہ شجاع کا استقبال پھولوں کے بادوں سے کیا۔ شجاع نے اپنے وزیر احمد شاہ ابدالی کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور اس سے ملحق خانقاہ میں محمد بنعلی کے مقدس چنے کی بھی زیارت کی۔ تین سال پہلے برکت اور کامیابی کے حصول کے لیے دوست محمد بھی یہاں آیا تھا۔ اڑبھو سوسال بعد امیر المومنین ملا عمر نے بھی یہاں حاضری دی۔ قندھار فتح کر اندرس آرمی کے افسر اور جوان سفر کے مصائب کو بھول گئے اور وہاں کے پر لطف موسم اور خوراک اور پہلوں کی بہتات پر خوشی سے مہم اٹھے۔ یہ جگہ سڑکی در ماندہ اور نیم فائدہ زدہ فوج کے لیے جنت سے کم نہیں تھی۔

خرید لیا گیا۔ یہ ہندوستانی خزانے پر بھاری بوجھ تھا اور جلد ہی واضح ہو گیا کہ افغانستان پر قبضہ سستا ثابت نہیں ہو گا۔ لیکن یہ حکمت عملی امن قائم کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ لارڈ آف لینڈ نے لندن کی حکومت کو کابل میں امن و سکون اور شجاع کی حکومت کی مقبولیت کی رپورٹ بھیج دی۔ بہت سے سیدوزی امرا کو شجاع کی مصالحت پالیسی پر تحفظات تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس

محمد نے افغانستان پر اپنی ہاتھوں سے حکومت کی تھی اور اپنے جہادی منصوبوں کی تکمیل کے لیے لوگوں پر بھاری ٹیکس لگائے تھے اور ان کی جائدادیں بھی ضبط کی تھیں۔ اس کے مقابلے میں شاہ شجاع کی حکومت لوگوں کے لیے نرم اور قابل قبول تھی۔ کابل پر قبضے کے ابتدائی چند ماہ میں ممتاز درانی امرا، غلجی سرداروں اور علما کو

دوست

طرح بارک زئی قبیلے کو عزت دی جا رہی ہے اور ان کے عہدے اور مراعات بحال کی جا رہی ہیں، زیادہ دیر نہیں گئے گی کہ اختلاف اور عداوت کا شعلہ پھر بھڑک اٹھے گا کیونکہ دونوں قبائل میں خون کا جھگڑا دوسلوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ جلد ہی شاہ شجاع بارک زئیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا جائے گا۔ فردوسی اس کو یوں بیان کرتا ہے۔ (ترجمہ)

تم نے باپ کو قتل کیا اور انتقام کے بیج بوئے
ارے مقتول کا بیٹا کب چین سے بیٹھے گا؟
تم نے سانپ کو مارا اور سنبھ لیے کو پالا
کس قسم کی حماقت کا ارتکاب کر رہے ہو؟
لارڈ آف لینڈ نے افغانستان پر قبضے کے فوری بعد
اپنی مہم پسند سوچ کا رخ چین کی طرف موڑ لیا۔ بجائے
اس کے شاہ شجاع کی کمزور حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے
ضروری مالی امداد فراہم کی جاتی اور کابل اور قندھار میں
افواج کے لیے قلعے تعمیر کیے جاتے، فوج کو بہتر ترقی واپس
بلا لیا گیا اور شجاع اور میک ٹیکنسن کے مالی وسائل کو محدود کر
دیا گیا۔ جب شجاع کا حرم لدھیانہ سے کابل پہنچ گیا تو
اس نے میک ٹیکنسن پر دباؤ ڈالا کہ وہ فوج کو بالاحصار سے
باہر نکالے کیونکہ یہ بات اس کے لیے تنگ و عار کا باعث
تھی کہ فوج اور حرم ایک ہی جگہ رہیں۔ چونکہ قلعہ تعمیر
کرنے کی ممانعت تھی اس لیے فوج کی قیادت نے کھلے
میدان میں ایک چھاؤنی تعمیر کر لی جس کا دفاع ممکن نہیں
تھا۔ یہ ایک انتہائی احسان فیصلہ تھا کہ ایک اجنبی ملک
میں، جہاں دشمن قبائل موجود تھے اس طرح کا ناقابل
دفاع فوجی اڈا چھاؤنی تعمیر کیا جائے۔ نیز فوجیوں کا گولہ
بارود اور دوائے خورد و نوش ایک پرانے قلعے میں ذخیرہ کی
گئیں جس کے حفاظتی انتظامات بھی ناکافی تھے۔

اس عرصے میں برطانوی فوجی افسروں اور افغان
خواتین کے درمیان شادیوں اور دوستانہ تعلقات کی
خبریں عام ہو گئیں۔ خصوصاً کابل میں فوجیوں کے لیے
عصمت فروشی کا کاروبار چل نکلا۔ ان مواقع سے بھرپور
فائدہ اٹھانے والوں میں الیگزینڈر برنس سرفہرست تھا۔
اس نے کابل کے مرکز میں اپنی رہائش گاہ کی تزئین و
آرائش کر لی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے اور شرابیں
ہر وقت موجود ہوتی تھیں۔ اس کے پاس کشمیری عورتوں
کا ایک گروہ تھا جو اس کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں۔
کابل میں اس کی بے حیائی اور غش و طرب کے قصے
زبان زد خالص و عام تھے۔ برطانوی فوجیوں اور
بازاری افغان عورتوں کا اختلاط اتنا عام ہو گیا کہ وہ
افغان عورتوں کی آسمان وستیابی کے گیت گاتے بھرتے
تھے۔ معززین شہر جو اسلامی شریعت پر یقین رکھتے تھے
افغان آباد کی نیلائی پر پریشانی اور غصے کا اظہار کرنے
لگے تھے۔ محمد حسین ہراتی تحریر کرتا ہے۔ (ترجمہ)

خیر خواہوں نے شاہ شجاع کو رپورٹ بھیجی کہ کابل
میں طوائفوں کی ایک سرگرم منڈی ہے جہاں سے ان کو
دن رات گھوڑوں پر انگش کیمپ میں لایا جاتا ہے۔ اس
سے ریاست کی اخلاقی بنیاد تباہی کا شکار ہو رہی ہے۔
شجاع نے یہ معاملہ میک ٹیکنسن کے سپرد کر دیا۔ اس نے
کہا ”اگر ہم فوجیوں کو جنسی تسکین سے روکیں گے تو وہ
بیکار ہو جائیں گے۔“ شجاع نے جواب دیا ”یہ بات
درست ہو سکتی ہے لیکن بہتر ہے کہ اس مملکت میں
سپاہیوں کو انکم و ضبط کا پابند بنایا جائے اور ظاہری طور پر
اخلاقیات کا احترام کیا جائے۔“ لیکن میک ٹیکنسن نے
شاہ کی وارننگ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اب یہ بات سب
پر عیاں ہو چکی تھی کہ شجاع صرف نام کا بادشاہ ہے اور

فوج اور حکومت کے معاملات پر اس کی کوئی گرفت نہ تھی۔ درحقیقت برطانوی عسکری قیادت اور شجاع کے درمیان ملکی اقتدار اور اختیارات کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ عوام میں یہ احساس عام تھا کہ شجاع کے بجائے میک نیگن حکومت چلا رہا ہے۔ بارک زئی مخالفین نے شجاع کو بدنام کرنے کے لیے پروپیگنڈا شروع کر دیا اور باغیانہ جذبات کو ہوا دینے لگے۔ اس طرح نئی حکومت اور افغان عوام کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے۔

برطانوی قیادت اور شاہ شجاع کے درمیان بڑا اختلاف فوج کے معاملے پر تھا۔ لارڈ آک لینڈ نے میک نیگن کو واضح ہدایات دیں تھیں کہ افغان نیشنل آرمی کو منظم اور مضبوط کیا جائے تاکہ وہ برطانوی فوج کی داپسی کے بعد شجاع کو تحفظ اور ملک میں امن و امان فراہم کرے۔ دوسری طرف وہ الاؤنس جو افغان قبائلی سرداروں کو سیاسی اور فوجی حمایت حاصل کرنے کے لیے باقاعدگی سے دیا جاتا تھا کافی کم کر دیا گیا۔ افغان سردار توقع کرتے تھے کہ دولت مند قریبی ان کے الاؤنس میں اضافہ کریں گے۔ شجاع بھی یہ سمجھتا تھا کہ فراخ دلانہ انتظام و انکزام افغان سرداروں کی غیر مشروط حمایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ مزید برآں شاہ محسوس کرتا تھا کہ افغان نیشنل آرمی اس کے ماتحت نہیں جس سے اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ برطانیہ کی مالی امداد کے بغیر وہ اتنی بڑی فوج نہیں رکھ سکتا۔ ان حالات میں شجاع سخت افسردگی اور مایوسی کا شکار ہو گیا۔ وہ گھٹنوں بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا۔ اسے آج کا کابل اپنی جوانی کے کابل سے بہت مختلف محسوس ہوتا تھا۔ وہ برطانوی حکام کے ساتھ معاہدے کے مطابق ملکی نظم و نسق اور فوج پر

مکمل اختیارات چاہتا تھا۔ لیکن روزمرہ کے حکومتی امور میں میک نیگن اور برنس کی مداخلت اور بالادستی بڑھتی جا رہی تھی۔ شجاع کا بااعتماد گورنر ملاشکور ظاہر داری قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ شاہ شجاع بااختیار حکمران ہے۔ اس وجہ سے انگریز افسر ملاشکور کے خلاف ہو گئے۔

اگرچہ شاہ شجاع اپنی شاہانہ شان و شوکت کی مبالغہ آمیز نمائش کرتا تھا لیکن افغان عوام میں اس کے لیے کوئی گرم جوشی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ اس کو فرنگیوں کا کٹھ پتلی بادشاہ سمجھتے تھے۔ اس کے غیر ضروری درباری تکلفات نے بھی عوام کو اس سے دور کر دیا تھا۔ اس کا حکمرانی کا یہ انداز دوست محمد کے عوامی انداز سے بہت مختلف تھا۔ افغان سردار بھی شجاع کے دربار میں ہاتھ پاندھ کر کھڑے ہوتے اور غیر ضروری انتظار کرنے میں ذلت اور بے عزتی محسوس کرتے تھے۔ افغان علما بھی فرنگیوں کی آمد کے باعث شجاع سے نفرت کرنے لگے تھے۔ میک نیگن نے افغان سرداروں کی آمدنی میں کمی کر کے روایتی قبائلی نظام اور سرداروں کی مستقل آمدنی کے ذریعے کو سبوتاژ کر دیا۔ اس سے شجاع کے دو بڑے حامی سردار عبداللہ خان اپکزیکی اور امین اللہ خان لغاری اپنے ملک میں کافر انگریزوں کی موجودگی اور سرداری نظام میں ان کی مداخلت سے تنگ پا ہو گئے اور کابل میں انگریزوں کی مخالفت کے مرکزی راہنما بن گئے۔

بارک زئی مخالفین کو باغیانہ جذبات کی پرورش کے لیے نہایت سازگار ماحول مل گیا تھا۔ افغان عوام کا لالچ، مذہبی تعصب اور غیر ملیکیوں اور ان کے کلچر سے نفرت ایسے آتش گیر جذبات تھے جن کو بھڑکانے میں دیر نہیں لگی۔ علما بھی شجاع کی حکومت کے خلاف متحد ہو گئے جب انگریز افسروں نے عظیم صوفی خافاہ "عاشقاں

د عارفان" کی وقف جاگیر کو غصب کر لیا۔ یہ بے تدبیری اور بدانتظامی کی انتہا تھی کیونکہ یہ خانقاہ ایک اہم اور قدیم روحانی مرکز تھی اور صدیوں سے پارک زمینوں کا مدفن بھی۔ اس کا انتظام دو نہایت طاقتور اور بااثر مذہبی راہنما بھائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ میر مسجدی اور میر حاجی تھے۔ میر حاجی مل جیستی مسجد کے خطیب اور کابل کے علما کے قائد بھی تھے۔ صورت حال کو مزید دگرگوں کرنے میں سیک نیگلن کا ہاتھ تھا جس نے ملاؤں کو کنٹرول کرنا اور ان کے نظام انصاف میں دخل

دینا شروع کر دیا تھا۔ ملاؤں کو اس پر سخت اعتراض تھا جس طرح یہ "لائسنس یافتہ کافر" ان کے شہر کو غلط کاریوں میں مبتلا کر رہے تھے اور انگریز اور ہندوستانی فوجی ٹیلیوں میں کھلے عام شراب نوشی اور بدکاری کے مرتکب ہو رہے تھے۔ شجاع کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات اس وقت انتہا کو پہنچ گئے جب جولائی

۱۹۴۰ء میں میر حاجی کے ایمپائر افغانستان کے علما نے جمعے کے خطبے میں شاہ شجاع کا نام صاف کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ ان کی رائے میں افغانستان کے اصل حکمران کافر تھے اور شجاع محض ایک نام نہاد کٹھ پتلی۔

سمجھدار انگریز افسروں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ شہر میں فوجیوں کی کم تعداد، انگریزوں سے نفرت اور بڑھتے ہوئے مخالفانہ عوامی جذبات کسی سرکشی اور بغاوت کا سبب بن سکتے ہیں۔ اگست ۱۹۴۰ء میں شجاع اور انگریز افسروں کو یہ خوفناک خبر ملی کہ دوست محمد بخارا کے تہ خانے سے باہر نکل آیا ہے۔ پتا چلا کہ کابل کے

ایک تاجر خان کبیر نے جو دوست محمد کا ممنون احسان تھا، تہ خانے کے محافل کو دس ہزار روپے رشوت دی اور دوست محمد کو بخارا سے بچ نکلنے میں مدد دی۔ خبریں آ رہی تھیں کہ دوست محمد شمالی افغانستان میں پہنچ چکا ہے اور اس نے مقدس جنگ یعنی جہاد کا علم بلند کر دیا ہے۔ اگست کے اواخر میں سیگان کے مقام پر برطانوی چوکی کو بیس میل پیچھے ہامیان میں دھکیل دیا گیا۔ صورت حال اس وقت بدتر ہو گئی جب شجاع کی فوج کا ایک دستہ جو امیر دوست محمد پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا



تھا، ہائی ہو گیا اور دشمن کے ساتھ جا ملا۔ تقریباً اسی وقت کوہستان کے تاجک قبائل نے شاہ کے خلاف بغاوت کر دی کیونکہ ۱۸۳۹ء میں کابل پر قبضہ کرنے میں انہوں نے جو مدد کی تھی شاہ نے اس کا مناسب معاوضہ ادا نہیں کیا تھا اور اپنے تمام وعدوں سے بھر گیا تھا۔ افغانوں کو انقلاب کے لیے اٹھ کھڑے ہونے میں صرف ایک سال لگا لیکن اب انگریزوں کے خلاف جہاد شروع ہو چکا تھا۔

دوست محمد کے ساتھ اس کا بیٹا اکبر خان بھی قید خانے سے بچ نکلا تھا لیکن اس کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ دوست محمد نے خان کبیر کی مدد سے ایک صوفی فقیر کا بھیس بدل لیا اور بخارا سے روانہ ہو گیا لیکن غلط راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے وہ ایک بخر پہاڑی صحرا میں پھنس گیا۔ اس کا گھوڑا مسلسل سفر اور تھکان سے مر گیا۔ خوش قسمتی سے امیر کو بچ جانے والا ایک کارواں مل گیا۔ راستے میں چرائی چچی کے مقام پر بخبری اطلاع

پر بخارا حکومت کے ملازموں نے کارواں کی تلاشی لی لیکن امیر کو تلاش نہ کر سکے کیونکہ امیر نے نہایت چالاکی سے روشناس کی مدد سے اپنی ڈاڑھی کا رنگ تبدیل کر لیا تھا۔ قافلے کے ساتھ شہر سبز پہنچ کر بھوکے پیاسے امیر نے درویشوں کے ایک ڈیرے پر پڑاؤ کیا۔ وہاں قلندر لوگ چائے پی رہے تھے لیکن انھوں نے اس فقیر کو کوئی توجہ دی نہ ہی کھانے پینے کی کوئی پیشکش کی۔ امیر خالی پیٹ شہر کے اندر داخل ہو گیا اور لوگوں سے ملا کبیر نامی تاجر کے بارے میں پوچھا۔ ملا کبیر کاہل سے تعلق رکھتا تھا لیکن شہر سبز میں بھی اس کا ایک گھر تھا۔ جب اس نے امیر کو دیکھا تو اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اسے بحفاظت گھر کے اندر لے گیا۔ امیر کی کسمپرسی دیکھ کر ملا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنی خدمات امیر کے سپرد کر دیں۔ کچھ دیر وہاں آرام کے بعد امیر نے ملا کبیر کو شہر سبز کے گورنر کے پاس بھیجا کہ وہ اس کو امیر کے آنے کی اطلاع کرے۔ گورنر یہ خبر سن کر خود ملا کبیر کے گھر آ گیا، امیر سے بہت احترام سے پیش آیا اور اسے شاہی مہمان خانے لے گیا۔ مہمان نوازی کے فرائض سے فارغ ہو کر گورنر نے امیر بخارا کے قابل ملامت رویے کا ذکر کیا اور پیشکش کی کہ وہ اس سے انتقام لینے کے لیے فوج بھیج سکتا ہے۔ دوست محمد نے اس پیشکش کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کے بجائے اسے سات سو گھڑسوار دیے جائیں جو دریائے اوکس کے پار اس کا ساتھ دیں۔ گورنر رضامند ہو گیا اور اس نے ضروری ساز و سامان اور اشیائے خورد و نوش کا بندوبست کرنے کے بعد سات سو گھڑسوار فوجی بطور محافظ امیر کے ہمراہ روانہ کر دیے۔

یہاں سے امیر دست محمد کی قسمت اس پر مہربان

ہو گئی۔ وہ دریائے اوکس پار کر کے بحریہ بلخ پہنچ گیا۔ بالآخر امیر خامرد میں اپنے سابق ازبک میزبان میرولی کے پاس جا پہنچا جہاں امیر کا بیٹا افضل خان اس کا منتظر تھا۔ میرولی نے امیر کی ہر ممکن مدد کرنے کی پیشکش کی۔ اس کے ساتھ اس نے امیر کو ایک بری خبر سنائی کہ اس کے بھائی نواب جبار خان نے اس کی رہائی سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو اور امیر کے حرم کو برطانوی حکام کے سپرد کر دیا تھا۔ اس خبر سے امیر غضب ناک ہو گیا اور اس نے فرنگیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ امیر نے ہزاروں سے کم ازبک گھڑسواروں کے ساتھ جنوب کی طرف پیش قدمی کی اور پہلی برطانوی فوجی چوکی کے سپاہیوں کو مار بھگا یا۔ اس کے خلد بعد ہامیان میں تعینات افغان فوج کے سالار صالح محمد نے شجاع کو چھوڑ کر امیر کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس اُمنڈتے ہوئے بحران کی خبر کاہل پہنچ گئی اور اس نے انگریز فوجیوں اور شاہ شجاع کو خوفزدہ کر دیا اور وہ بچ نکلنے کے ممکنہ راستوں کے بارے میں سوچنے لگے۔ ۱۸ ستمبر کو ہامیان میں برطانوی فوج اور امیر کی فوج میں مقابلہ ہوا۔ جدید اسلحے اور توپوں سے لیس تربیت یافتہ برطانوی فوج نے بڑی آسانی سے افغان گھڑسوار دستے کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ ایک سو جوانوں کے نقصان اور اپنی ران پر شدید زخم کے بعد امیر نے اپنی باقی فوج کو میدان سے ہٹا لیا۔ لیکن پسپا ہونے کے بجائے بلا خوف و خطر پہاڑوں پر خشک دریائی گزرگاہوں اور چمکند ٹیلوں پر چلتے ہوئے کاہل کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کوہستان میں تاجک ہانپوں سے جا ملے۔ اگرچہ کوہستان میں اس کے بہت سے دشمن موجود تھے لیکن

پھر معاہدے کے خلاف جنرل سیل اور پرنس تیمور نے اس کے قلعے پر حملہ کر کے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے اہل خانہ کو قتل کر دیا اور اس کی زمینیں دشمنوں میں تقسیم کر دیں۔ غضبناک میر مسجدی زخمی حالت میں بخرو کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ انگریزوں کی اس وحشیانہ کارروائی سے کوہستانی باشندے دہشت زدہ ہو گئے۔ انگریزوں نے میر مسجدی کو ہمیشہ کے لیے اپنا دشمن بنالیا۔ یہ ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔

اکتوبر ۱۸۴۰ء میں برطانوی افواج کو ایک بڑا دھچکا لگا جب چاریکمر میں افغان فوج کا تربیت یافتہ سکواڈرن دوست محمد سے چالا۔ موہن اہل کشمیری کے مطابق یہ سب سے بڑا نقصان تھا جس کا سامنا برطانوی فوج کو افغانستان کے قبضے کے دوران کرنا پڑا۔ بیشتر عوام اور سردار منتظر تھے کہ کون فتح مند ہوتا ہے جب کہ وہ موجودہ حکومت سے غیر مطمئن تھے کہ انھوں نے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کیے۔ آخر کار ۲ نومبر ۱۸۴۰ء کو چاریکمر کے فوجی اڈے سے دور بیخ شیر کی وادی میں دلوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ کہنی کی فوج ایک ہائی قلعے پر حملے کرنے کے لیے پردان درہ کی طرف بڑھ رہی تھی، جب انھیں خبر ملی کہ دوست محمد ان پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ چند منٹ کے اندر امیر اور اس کے چار سو گھڑسوار برطانوی فوج کے سامنے نمودار ہوئے۔ کہنی کی توپیں عقب میں تھیں ان کو آگے لانے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے کہنی کے گھڑسوار افسروں نے حملہ کرنے کے لیے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی لیکن انھیں بہت دیر بعد پتا چلا کہ ان کے اپنے ہندوستانی گھڑسواروں نے رخ موڑا اور فرار ہو گئے۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ دوست محمد کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ کہنی افسر ڈاکٹر لارڈ

اس نے انگریز دشمنی کے مفروضے پر جو اٹھایا۔ اسے امید تھی کہ کافر حکومت کے خلاف مشترکہ نفرت پھیل جائے گی۔ چنانچہ اس نے تاجک سرداروں کے پاس قاصد بھیجے اور اپنے اتحادی صفی میر آف نقاب کو ذمہ داری سونپی کہ وہ کوہستان کے میروں اور شیخوں کو قائل کرے کہ وہ سب امیر کی قیادت میں جمع ہو جائیں۔ اسے بہت اطمینان اور خوشی ہوئی جب اس کی تجاویز کے فوری مثبت جوابات موصول ہونا شروع ہوئے۔

یہ ایک دلیرانہ لیکن پرخطر حکمت علمی تھی۔ میکملن نے پرنس اور جنرل سیل کو درجنٹ فوج کے ساتھ چاریکمر کے ضلعی صدر مقام پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا۔ اس طرح انھوں نے کوہستان اور امیر کے درمیان شاہراہ کو بند کر دیا۔ دوست محمد نے کہنی کی فوج کا براہ راست مقابلہ کرنے کے بجائے گوریلا جنگ کی حکمت عملی اختیار کی۔ وہ آپا تک حملہ کر کے کہنی کی سرکاری فوج کو جانی نقصان پہنچاتے۔ جنرل سیل نے ہائی دیہات میں ہانگیوں کے ٹھکانوں، فصلوں اور درختوں کو تباہ کر دیا اور کوہ دامن کے قریب ہائی قلعوں کا محاصرہ کر لیا جب کہ پرنس نے کوہستانی سرداروں کو رشوت پیش کی کہ وہ امیر کو دھوکے سے ان کے سپرد کر دیں۔ لیکن ان پر فریب کوششوں کے باوجود امیر ان کے ہاتھ نہ آیا، بلکہ دو ماہ کی جھڑپوں اور لڑائیوں میں انگریزوں کو نقصان اٹھا کر چاریکمر تک پسپا ہونا پڑا۔ اکثر کوہستانی سردار سرکشی ترک کرنے پر آمادہ تھے بشرطیکہ گزشتہ سال شہاب کی طرف سے کیے گئے وعدے پورے کیے جائیں۔ ایک بااثر مذہبی راہنما اور نقشبندی پیر میر مسجدی بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو چکا تھا لیکن

کے ہاتھ کو پکڑ لیا، ان کو اپنی پیشانی سے لگایا اور بوسہ دیا۔ سروہیم میک نیگن فوراً نیچے اترا اور کہا "خوش آمدید۔ خوش آمدید!" اور پھر اس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ دوست محمد داخل ہوتے ہی مشرقی انداز میں سجدے کی حالت میں چلا گیا اور اپنی پیڑی اتار کر پیشانی فرش پر رکھ دی۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس نے اطاعت کی علامت کے طور پر اپنی تلوار پیش کر دی اور کہا اب یہ اس کے لیے بیکار ہے۔ میک نیگن نے فوراً تلوار واپس کر دی اور امیر کو بغین دلا لیا کہ اس کی طرف سے برطانوی حکومت کی مخالفت کے باوجود اس کا ہر ممکن خیال رکھا جائے گا۔ امیر نے جواب دیا کہ یہ اس کا مقدر تھا اور وہ اپنے مقدر کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ امیر ایک مضبوط جسم والا طاقتور شخص تھا۔ اس کی ناک عتاقی، ابرو قوس نما اور ڈاڑھی اور مونچھیں بڑا رشیدہ تھیں۔ لارنس کہتا ہے "امیر کے استقبال کے لیے خیمے لگا دیے گئے اور اسے میری گھڑی میں دے دیا گیا۔" اس کا ہمارے قبضے میں آ جانا ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ دو دن کی

اور بہت سے دوسرے فوجی مارے گئے۔ دوست محمد کی فتح کے صرف دو دن بعد ۴ نومبر کو منتظر میک نیگن اپنے ملٹری سیکرٹری اور مختصر گھڑسوار محافظ دستے کے ہمراہ کابل کے مضافات میں شام کے وقت گھڑسواری کر رہا تھا۔ ایک دن قبل ڈاکٹر لارڈ اور بہت سے دوسرے افسروں کی موت کی خبر نے سب کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کا پورا دن مختلف تجاویز پر بحث مباحثہ کرتے ہوئے گزرا تھا۔

ملٹری سیکرٹری چارلس لارنس کے بقول "جب ہم میک نیگن کی رہائش گاہ کے قریب پہنچے تو اچانک ایک گھڑسوار ہمارے قریب آیا، اپنا گھوڑا میرے اور میک نیگن کے گھوڑے کے درمیان لے آیا اور مجھ سے پوچھا "کیا وہ لارڈ صاحب ہیں؟" میرے ہاں کہنے پر اس نے میک نیگن کے گھوڑے کی لگام کو پکڑ لیا اور کہا "امیر، امیر!" میک نیگن نے کہا "کون، کہاں۔" فوراً ہی ایک اور گھڑسوار نزدیک آیا اس نے گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگائی اور گھوڑے کی رکاب اور میک نیگن

امیر دوست محمد ہتھیار ڈالتے ہوئے



گمرانی کے دوران میں بمشکل ہی سوسکا اور بار بار اس کے پیسے میں جھانکتا رہا۔

اگر ایک طرف برطانوی حکام حیرت زدہ تھے کہ امیر اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ کیسے آگیا اور یہ کہ شاید اس کو احساس نہیں ہو سکا کہ وہ نفع کے کتنا قریب پہنچ چکا تھا۔ دوسری طرف امیر اپنی زندگی کے تحفظ کے لیے ہتھیار ڈال کر ترک ایرانی پروٹوکول پر عمل کر رہا تھا۔ اس خطے میں شکست خوردہ حکمرانوں کا قاتلین کے سامنے ہتھیار ڈالنا اور اطاعت اختیار کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ یہ عمل زندگی کی حفاظت کے ساتھ مستقبل میں حالات کے تغیر کے ساتھ اقتدار میں واپس آنے کے امکانات بھی رکھتا تھا۔ دراصل انگریزوں کی طرف سے امیر کے سر کی قیمت دو لاکھ روپے رکھی گئی تھی۔ اور امیر کو یقین تھا کہ افغان اس انعام کے لالچ میں اس کے ساتھ غداری کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ نیز یہ ایک طرح کا اعتراف تھا کہ اب اقتدار کا حیلن اس کے حق میں نہیں اور برطانیہ اقتدار کے نئے کھلاڑی کے طور پر منظر عام پر آچکا ہے۔ وہ پرامید تھا کہ جلد یا بدیر انگریز اسے اقتدار میں لے آئیں گے یا پھر ان کے زوال کے بعد وہ خود یہ موقع حاصل کر لے گا۔

امیر دوست محمد کو ہندوستان بھجوانے کے فوری انتظامات کیے گئے۔ اس سے وعدہ کیا گیا کہ اس کو فیاضانہ پیشین دی جائے گی اور وہ اپنے حرم کے ساتھ رہے گا جس کوئی الحال غزنی کے قلعے میں رکھا گیا تھا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ اس کو لدھیانہ میں شاہ شجاع کی خالی کردہ رہائش گاہ دی جائے گی۔ امیر کے کاہل میں نو دن کے قیام کے دوران امیر میک نیلن دوست بن گئے۔ میک نیلن نے آگ لینڈ سے سفارش کی "امیر

دوست محمد، شجاع کے مقابلے میں فیاضانہ سلوک کا مستحق ہے۔ شجاع کا ہمارے اوپر کوئی حق نہیں تھا کیونکہ ہم نے اس کو تخت سے محروم نہیں کیا تھا۔ جب کہ دوست محمد کو ہم نے ہر طرف کیا۔ اگرچہ اس نے ہمیں کبھی تکلیف نہیں پہنچائی تھی پھر بھی وہ ہماری پالیسی کا نشانہ بنا۔" دوسرے الفاظ میں میک نیلن نے گویا اعتراف کر لیا کہ بہادر امیر نے ہمیشہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھا اور اس کو غیر ضروری طور پر اس کی مملکت اور تخت سے محروم کیا گیا۔ امیر بہت خوش تھا کہ اس نے انگریزوں کے سامنے دستبرداری سے پہلے پروان درہ میں اپنی بہادری ثابت کر دی تھی۔

امیر نے صرف ایک معاملے پر برطانوی حکام سے تعاون کرنے سے انکار کیا۔ میک نیلن نے بار بار اس پر زور دیا کہ وہ ایک مرتبہ شاہ شجاع سے ملے لیکن دوست محمد نے صاف انکار کر دیا۔ دوست محمد نے کھانے کے وہ خوان نعمت بھی واپس کر دیے جو شاہ شجاع نے اپنے شکست خوردہ حریف کو بھیجے تھے جو افغان آئین عزت کی رو سے ایک اخلاقی توجہ تھی۔ میک نیلن کی متعدد التجاؤں کے جواب میں اس نے کہا اگر شجاع کچھ کہتا چاہتا ہے تو وہ آئے اور آپ کی موجودگی میں بات کر لے۔ برطانوی حکام نے دوست محمد کو سیدوزئی بادشاہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا جس سے شجاع بہت ناراض ہوا۔ وہ کئی ہفتوں سے میک نیلن پر زور دے رہا تھا کہ دوست محمد کو قتل یا کم از کم اندھا کر دیا جائے لیکن میک نیلن نے ایسی باتوں پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ شجاع کو بڑا دکھ تھا کہ بارک زئی قبیلے کے افراد انگریزوں کی حمایت سے پوری آزادی کے ساتھ اپنے کاروبار میں مصروف تھے۔

مرکز بنے گا اور اپنے باپ سے بھی کہیں زیادہ پر تشدد، بے رحم اور موثر ثابت ہوگا۔

اپریل ۱۸۴۱ء میں افغانستان میں برطانوی فوج کا نیا کمانڈر میجر جنرل ولیم پلنٹن افغانستان کے سرکاری دارالحکومت جلال آباد میں پہنچا جہاں شاہ شجاع مقیم تھا۔ پہلے سالہ جنرل جوڑوں کے شدید درد (گھٹیا) میں مبتلا تھا اور سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتا تھا۔ وائزلو کے بعد گزشتہ پچیس سال سے اس نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کافی سال بھٹنوا پر گزارنے کے بعد

اب اپنے بدستے ہوئے قرضہ جات ادا کرنے کے لیے باقاعدہ فوجی سروں میں واپس آ گیا تھا۔ وہ قوت فیصلہ سے بھی محروم تھا۔ ہندوستان اور افغانستان کے بارے میں قریباً نابلد تھا اور اپنی کمان میں ہندوستانی فوج کے ساتھ کوئی ہمدردی بھی نہیں رکھتا تھا۔ کابل پہنچنے پر وہ شہر کے بارے میں ناگوار تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ پلنٹن کی اہلیت کولنڈن میں کسی نے دیکھا نہ ہی آگ لینڈ نے کوئی توجہ دی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ساری فوج میں سب سے زیادہ ناگوار، غیر ہر دلعزیز اور غیر پسندیدہ افسر جان فیلٹن کو اس کاڑھی مقرر کر دیا گیا۔

افغانستان کے جنوب مشرق میں پنجاب کی رباست انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد دو سال کے عرصے میں تین حکمران تبدیل ہو چکے تھے۔ سکھ فوجیوں نے فرانسیسی اور انگریز افسروں کو قتل کر دیا اور سارے ملک میں قوت مار شروع کر دی تھی۔ پنجاب برطانیہ کے اتحادی کے بجائے ایک دشمن

اس رویے سے بادشاہ کا وقار خاک میں مل گیا تھا۔

۱۳ نومبر ۱۸۴۰ء کو دوست محمد افضل خان کی سمیت میں کابل سے رخصت ہوا۔ اس کے بیٹے افضل خان نے بھی باپ کے ایما پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ جلال آباد میں وہ دونوں اپنے حرم سے جاملے جس میں دوست محمد کی نو بیویاں اس کے بیٹوں کی لکیں بیویاں ایک سو دو ہانہ یاں اور دو سو دس غلام اور نوکر شامل تھے۔ بچوں سمیت ان کی کل تعداد تین سو اکیاسی تھی۔ امیر کی بادشاہ دستبرداری کی خبر سے اس تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو

گیا اور لدھیانہ پہنچتے تک امیر کے خاندان کے تمام افراد ان سے آملے تھے۔ ان میں اس کے بائیس بیٹے اور انیس دیگر رشتہ داروں کے علاوہ چار سو نوکر اور تین سو خادما کیں شامل ہو گئیں۔ اس طرح جلاوطن امیر کے ہمراہ کل ایک ہزار ایک سو پندرہ افراد تھے۔



دسمبر کے آخر میں بارک زئی قافلے کی لدھیانہ آمد کابل اور شملہ دونوں کے لیے انتہائی اطمینان کا باعث تھی۔ جنرل کاکٹن جس نے افغانستان میں برطانوی فوجی کمانڈر کے طور پر اپنی اہمیت کھل کرنے کے بعد بارک زئیوں کو بحفاظت لدھیانہ پہنچایا، نے اپنے جانشین کے نام پیغام لکھا ”تمہیں یہاں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں امن ہی امن ہے۔“ لیکن حقیقت میں بغاوت ختم نہیں ہوئی تھی۔ دوست محمد کا سب سے زیادہ جنگجو بیٹا اکبر خان کسی نہ کسی طرح بخارا کے قید خانے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ جلد ہی مزاحمت کا نیا طاقتور

ریاست میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ چیز برطانوی حکام کے لیے باعث تشویش بھی کیونکہ پنجاب، افغانستان اور ہندوستان میں برطانوی عملداری کے درمیان حائل تھا۔ بلکہ ایسی رپورٹیں مل رہی تھیں کہ سکھ سردار پشاور کے اردگرد باغی بادرک زئی اور درانی سرداروں کو پناہ اور مدد فراہم کر رہے تھے۔ دوسری طرف افغانستان کے مغرب میں ایرانی سرحد پر بھی ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ ہرات کے طاقتور وزیر یار محمد علیکو زئی نے ہرات کے حکمران شاہ شجاع کے عم زاد کامران شاہ سید زئی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ پھر ایران کے بادشاہ محمد شاہ کے ساتھ برطانیہ کے خلاف اتحاد قائم کر لیا۔ علاوہ ازیں قندھار کے جنوب مغرب میں واقع ہلمند اور قلات میں درانی، توفی اور غلزی برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگرچہ توفی قبائل پر ٹیکس کا نفاذ بغاوت کی غوری وجہ بنا لیکن مزاحمت نے جلد اسلامی رنگ اختیار کر لیا۔ باغی اپنے آپ کو اسلام کے سپاہی اور مزاحمت کو جہاد کا نام دے رہے تھے۔ ہلمند میں باغی راہنما اختر خان درانی نے عظمت اسلام کی بحالی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ جنرل ٹاٹ نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے ایک سریع الحریکت فورس قائم کر لی تھی اور موثر طور پر کارروائی کر رہا تھا۔ ٹاٹ کے ساتھ نہایت قابل اور ہوشیار سیاسی معاون ہنری رالسن کام کر رہا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ قندھار اور ہلمند کے علاقے میں غازیوں کے اجتماعات اور اعلان جہاد کی اطلاعات حکام ہالا کو بھیجتا تھا۔ اس نے اس حوالے سے میک ٹیکن کو کئی تفصیلی رپورٹس بھیجیں۔ کابل کے شمال میں کوہستان میں بھی صورت حال دھماکا خیز ہو چکی تھی۔ ایلڈرڈ پانگر نے

کوہستان کے علاقے میں براہتی ہوئی ہے جیسی، برطانوی فوجوں کی کمزور دفاعی پوزیشن اور کوہستانی سرداروں کے شجاع کی حکومت پر عدم اطمینان پر مبنی کئی رپورٹس میک ٹیکن کو ارسال کیں لیکن اس نے ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس نے لکھا "اور ہاتوں کے علاوہ بغاوت کے اسباب میں غیر ملکوں سے نفرت، ذہنی پسندی، ہمارے فوجیوں کی ہلاروک ٹوک کارروائیاں خصوصاً عورتوں کو کھلے عام لے جانا اور زنا کاری، مقامی باشندوں کا جسد اور انتقام بھی شامل ہیں۔ برطانیہ کے مخالفین ہماری کردار کشی کر رہے ہیں، لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا رہے ہیں اور قانون شکن عناصر کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ کئی ہوائی فصولوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ نہروں کے کناروں میں شگاف ڈالے جا رہے ہیں۔ ہر وقت وسیع پیمانے پر سازش اور بغاوت کی انوائس گردش میں رہتی ہیں۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ کوہستانی سرداروں سے بریغمال کے طور پر افراد کا مطالبہ کیا جائے۔" مولانا حامد شاہ کشمیری نے اس وقت کے کابل کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ (ترجمہ)

فرنگی کے ظلم و ستم سے تالاں تھے لوگ اس کے غرور اور حاکیت کا شکار تھے لوگ افغان آبرو اور آن باقی نہ تھی ذرا قانون اور امن کا نام باقی نہ تھا ذرا ذلیل و رسوا ہو چکے تھے خوانین سارے خاک میں مل گئے تھے ان کے خواب سارے ہر شخص کو عدلی امیر کی یاد آتی تھی دن رات اس کی واپسی کی تمنا کی جاتی تھی اکثر برطانوی افسروں نے سمجھ لیا تھا کہ اینگلو سیدوزئی حکومت ناکام ہوتی جا رہی ہے۔ اگرچہ میک

لیکن اس خیال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن صورت حال کا حل کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

لندن میں بورڈ آف کنٹرول کے صدر نے کہا کہ دوست محمد کی گرفتاری کے بعد فوج کی تعداد کو انتہائی کم کر دیا گیا ہے۔ اس میں زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ افغانستان پر اخراجات اور سرمایہ کاری میں اضافہ ناگزیر ہے۔ بالائی افغان حکومت کو قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ "انگریز افغانستان کے حکمران ہیں اور شجاع کو تمام احکامات کی تعمیل کا پابند کیا جانا چاہیے۔ افغانستان سے واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برٹس بھی اسی خیال کا حامی تھا۔ بہت سے انگریز افسران کا یہ بھی خیال تھا کہ ان مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ پنجاب اور افغانستان کو کمپنی کی عملداری میں شامل کر لیا جائے۔

میک ٹیکن بھی افغانستان کی سرحدوں میں ہرات، پنجاب اور اتر تک علاقوں سمیت دریائے اوکس تک توسیع چاہتا تھا تاکہ وسطی ایشیا سے روس کی ممکنہ پیش قدمی کا سدباب کیا جاسکے۔ لیکن ان سب خوش کن عزائم کے باوجود تلخ حقیقت یہ تھی کہ کلکتہ کا سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ افغانستان پر قبضہ توقع سے کہیں زیادہ مہنگا ثابت ہوا تھا کیونکہ سالانہ اخراجات میں لاکھ پاؤنڈ تک پہنچ گئے تھے جو کمپنی کی ایلون اور چائے کی تجارت کے منافع سے کئی گنا زیادہ تھے۔ فروری ۱۸۴۱ء میں لارڈ آک لینڈ کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ چھ ماہ ختم ہونے سے پہلے ہندوستان کا خزانہ خالی ہو جائے گا۔ مارچ میں آک لینڈ نے میک ٹیکن کو لکھا "ہماری سب سے بڑی ضرورت روپیہ ہے۔ اخراجات کی موجودہ شرح کے مطابق ہم آپ کو کب تک سہارا دے سکیں

گے۔ میں کہہ نہیں سکتا۔"

ان مشکل اور ناسازگار حالات میں میک ٹیکن کی ایک اعلیٰ تر معاشرتی مرتبے کی مہتمنی بیوی فرانس اپنی بیٹی، طوطے اور پانچ آیاؤں کے ہمراہ پنجاب کے راستے کابل چھاؤنی کی طرف عازم سفر تھی۔ اس کی روانگی سے شملہ میں موجود ایڈن سسٹرز نے سکون کا سانس لیا کیونکہ وہ اس کی محبت سے گریزاں رہتی تھیں۔ جنرل سیل کی بیوی فلورینسیا سیل اس کی ہمسفر تھی جو بہت بڑے پیاؤ اور اپنی خوبصورت بیٹی الیزینڈرینا کے ساتھ کابل پہنچی۔ ان خواتین کی کابل آمد سے بہت سے لوگ خوش نہیں ہوئے۔ کینٹ کے سرجن ڈاکٹر جان میگلجھ کے بقول دونوں خواتین یکساں طور پر بے شرم اور غیر منہب تھیں اور الیزینڈرینا سیل خوش مزاج ہونے کے باوصف جاہل اور ان پڑھ تھی۔ لیکن اس کی ناخوشگونی کے باوجود چھاؤنی میں نصف درجن نوجوان افسران کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ لیڈی سیل اپنی بیٹی کے تمام عاشقوں کو ناپسند کرتی تھی لیکن جلد ہی نوجوان انجینئر جان اسٹوارٹ اپنے کنوارے ساتھیوں سے بازی لے گیا۔ لیڈی سیل کرنل میں اپنے باغیچے سے پھولوں کے بیج اپنے ساتھ لائی تھی جن کو اس نے اپنے کابل بکن گارڈن میں کاشت کیا۔ اس کے بقول افغان معززین اس کے پھولوں کے دیوانے تھے اور ان کے بیج حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

انگریز افسروں کی بیگمات کے کابل پہنچنے ہی شاہ شجاع نے اپنے نایاب بھائی شاہ زمان اور اس کے اور اپنے حرم کی لدھیانہ سے کابل واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ پنجاب کی صورت حال قابو سے باہر ہونے سے پہلے ان کی

خواتین اور اس کا زر و جواہر کا سرمایہ بحفاظت اس کے پاس پہنچ جائیں۔ دو جوان اسکاٹش افسروں جارج براؤنٹ اور کولن میکسوی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ قافلہ شاہ زمان، اس کے بیٹوں، خواتین، ملازموں سمیت چھ ہزار افراد پر مشتمل تھا جس کے لیے پندرہ ہزار اونٹوں کی ضرورت تھی۔ قافلے کی حفاظت کے لیے مذکورہ افسروں کی کمان میں پانچ سو آدمیوں کا حفاظتی دستہ ہمراہ تھا۔ دونوں افسر اپنی قابلیت اور مہارت سے قافلے کو پنجاب کے سرکش سکھ فوجیوں اور جمہور کے باغی سرحدی محافلکوں سے بچا کر بغیر کوئی گولی چلائے بحفاظت کابل لے گئے۔ اس اثنا میں شاہ شجاع نے برطانیہ کی نو جوان ملکہ وکٹوریا کی طرف سے شاہ کو بھیجے گئے تہنیتی پیغام کے جواب میں ایک محبت آمیز خط تحریر کیا۔ اس میں شاہ نے ملکہ کے خط پر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا، ملکہ کے حسن و جمال، عقل و دانش، عدل و انصاف اور عظمت اور سر بلندی کے بیان، من زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور اپنی دلی محبت و وفاداری اور خلوص کا یقین دلایا۔ لیکن ملکہ سے محبت و عقیدت کے علی الرغم شجاع کابل میں موجود برطانوی افسروں کی بالادستی سے کافی بیزار ہو چکا تھا اور ان کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں سے تالاں تھا۔

اسی عرصے میں میک میکسن ایک سنگین غلطی کا مرتکب ہوا۔ اس نے برنس کی سفارش پر شجاع کے وفادار اور ہائٹ گورنر ملاشکور کو ہارک زئی وفادار عثمان خان سے بدل دیا اور اس کو نظام الدولہ کا خطاب دے دیا۔ ملاشکور کو برطرف کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ اس سے نہ صرف شجاع اور انگریز حکام کے درمیان اختلاف کی خلیج مزید وسیع ہو گئی، بلکہ عثمان خان کے جادہانہ اور

گستاخانہ رویے کی وجہ سے حکومت کے حامی سردار بدظن ہو کر مخالف مذہبی تحریک میں شامل ہو گئے۔ میک میکسن کی شبہ پر نظام الدولہ اتنا با اختیار اور مغرور ہو گیا تھا کہ وہ شاہ شجاع کی بھی پروا نہیں کرتا تھا اور اس کی منظوری کے بغیر شجاع کا کوئی فیصلہ نافذ العمل نہیں ہوتا تھا۔ اس صورت حال نے افغان عوام کے اس شک کو یقین میں بدل دیا کہ شجاع اپنی حکومت میں کوئی اختیار نہیں رکھتا اور حتمی اختیارات اور اقتدار انگریز حکام کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ نکتہ ہارک زئی مخالفین کی پروپیگنڈا مشین کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ شجاع کو انگریزوں کے احسانات کا احساس تھا اور وہ ایک وفادار و تعاونی کے طور پر تشدد کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا لیکن ایک بے بس کٹھ پتلی کا منصب اس کو منظور نہیں تھا۔ شجاع نے اپنے ان جذبات کا اظہار برنس سے کیا لیکن برنس کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ اپنے افسر میک میکسن سے متفق تھا جب اس نے کہا "شجاع ایک بوڑھی عورت کی طرح ہے جو اپنے عوام پر حکومت کرنے کے لیے موزاں نہیں۔ میں اس کے موزوں یا غیر موزوں ہونے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ہم یہاں اس کی حکومت چلانے آئے ہیں اور یہ کام ہم ضرور کریں گے۔"

اگست ۱۸۴۱ء میں لارڈ آئک لینڈ نے میک میکسن کو مراسلہ بھیجا کہ کمپنی کے مالی حالات اتنے دگرگوں ہو چکے ہیں کہ وہ صرف تنخواہیں ادا کرنے کے لیے ہندوستانی تاجروں سے منہ مانگی شرح سود پر پچاس لاکھ پاؤنڈ مستعار لینے پر مجبور ہیں۔ میک میکسن کو حکم دیا گیا کہ وہ افغانستان میں ہر قسم کے اخراجات پر فوری اور قابل قدر کوئی کرے۔ میک میکسن نے احتجاج کیا لیکن احکامات کی تعمیل پر آمادگی بھی ظاہر کر دی۔ اس

خیبر اور پشاور کے قبائل کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ اور یہ سڑکوں، دروں، چیک پوسٹوں کی حفاظت اور محفوظ تجارتی و سفارتی اسفار کے بدلے میں دی جاتی ہے۔ یہ ایک طرح سے افغانستان سے ہندوستان تک راہداری کو محفوظ رکھنے کا معاوضہ ہے جو کبھی کسی حکمران نے ہند نہیں کیا۔ میک نیگن اور نظام الدولہ کے رویے سے مایوس ہو کر ان قبائل نے اپنے گھر چھوڑ دیے اور پہاڑوں پر چلے گئے اور سرکشی، بغاوت، لوٹ مار اور سڑکوں کی بندش کو اپنا معمول بنالیا۔ انھوں نے قرآن پر حلف اٹھایا کہ وہ بغاوت کریں گے اور افغانستان سے برطانوی فوج کے انخلا تک آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ مولانا کشمیری اکبر نامہ میں رقمطراز ہے کہ درانی اور غلوی سرداروں کی قائل سے روانگی احتجاج سے زیادہ ایک سوہنی بھی حکمت عملی تھی۔ (ترجمہ)

رات ہوئی تو قائل کے سردار جمع ہوئے عبداللہ خاں اچکزئی کے گھر پر مشورے ہوئے ابھی طوفان سر سے نہیں گزرا انھوں نے کہا تیرکمان تیار، عمل کا وقت ہے سب نے کہا میدان جنگ میں تلوار کے زخم سے مرنا فرنگ کی قید میں زندگی سے بہتر ہے تمام برائیوں کی ہے جز الگیرینڈر برنس بے حیا، مکار، بڑا سازشی ہے برنس غلوی قبائل کی بغاوت اور جنرل الفنسٹن پر گھیا کا حملہ تقریباً ایک ہی وقت پر ہوا۔ الفنسٹن کے سرجن ڈاکٹر کیمپبل نے مریض کا معائنہ کیا اور اس کی خراب حالت دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔ اس کے مطابق بیماری نے جنرل کے تمام جوڑوں پر شدید حملہ کر دیا تھا۔ وہ ایک تباہ شدہ اوجانچا کی طرح تھا اور اپنی ذیوبی انجام

نے قائل کے دربار میں غلوی اور خیبر قبائل کے سرداروں کو بلایا اور ان کو بتایا کہ ان کے وطن تک میں آٹھ ہزار کی کٹوتی کی جا رہی ہے۔ سب سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں مشرقی افغانستان کے غلوی قبائل اور ان کا سردار محمد شاہ خان غلوی تھا جو اکبر خان کا سر تھا اور خیبر کے علاقے میں امن وامان کا ذمہ دار تھا۔ یہ میک نیگن کی سب سے بڑی غلطی تھی جس کے نتیجے میں افغانستان پر قبضے کی پوری عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو گئی۔ غلوی سرداروں کو امید تھی کہ ان کو اچھی کارکردگی پر انعام و اکرام کے لیے قائل بلایا جا رہا ہے۔ انھوں نے اس اقدام کو معاہدے کی خلاف ورزی اور غداری قرار دیا۔ سردار اپنی آمدنی میں کٹوتی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ انگریزوں کے آنے کے بعد ضروریات زندگی کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور غربت اور فاقہ کشی کی چیخ بکار عام ہو چکی تھی۔ بد قسمتی سے میک نیگن نے کٹوتی کی تفصیل اور اس کے فائدہ کو نظام الدولہ عثمان خان پر چھوڑ دیا جس کے سرداروں کے ساتھ گستاخانہ اور دھمکی آمیز رویے نے سب کو حکام سے برگشتہ کر دیا۔ شاہ شجاع کی موجودگی میں عثمان خان اور صدر خان درانی کے درمیان تلخ جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ نظام الدولہ نے میک نیگن سے شکایت کی جس کے نتیجے میں صدر خان کو دربار سے برخاست کر دیا گیا۔ اس صورت حال پر درانی سرداروں میں بے چینی پھیل گئی اور بارک زئی، شاہ کی بے بسی پر خوشیاں منانے لگے۔

نظام الدولہ کی سفارش پر میک نیگن نے غلوی سرداروں کے دلیفے بند کر دیے یا ان میں کافی کٹوتی کر دی جس پر انھوں نے شدید احتجاج کیا۔ غلوی سرداروں کا موقف تھا کہ مغلوں کے دور سے غلوی،

دینے سے یکسر معذور اور ناقابل علاج ہو چکا تھا۔
افغانستان نے آک لینڈ کو مراسلہ بھیجا اور درخواست کی
کہ اسے لڑائے سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اسی دوران
میک نیکسن نے افغانستان میں برطانوی فوج کو مزید کم
کرنے کے لیے کرنل رابرٹ سیل اور اس کے بریگیڈ کو
واپس ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ذمہ ایک کام
یہ بھی تھا کہ وہ واپسی کے سفر میں غلوی قبائل کو سرکشی کا
مزا چکھائے۔ سیل کا بریگیڈ ۹ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں کابل
سے روانہ ہوا۔ اگلے چند دنوں میں سیل کے دستے پر



کرنل رابرٹ سیل

افغان غلوی قبائل نے کئی دفعہ شب
خون مارا اور ان کو بھاری جانی و مالی
نقصان پہنچایا۔ کابل خوردورے سے
گزرتے ہوئے برطانوی فوجیوں کو
شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سیل
خود بھی بری طرح زخمی ہوا۔ بالآخر
سیل کو مذاکرات پر مجبور ہونا پڑا۔ اس
نے محفوظ راستے کے عوض افغان قبیلے
کو ۳۰۰۰۰ روپے ادا کیے۔ اپنے
رضیوں کو واپس کابل بھیجا اور ہاتھی تاندرہ بریگیڈ کے
ساتھ تیز رفتاری سے جلال آباد کی طرف پیش قدمی کی۔
چند دن کے اندر بریگیڈ کے ۲۵۰ آدمی مارے جا چکے
تھے اور بہت سا ساز و سامان اور گولہ بارود لوٹا جا چکا تھا۔
ظاہر تھا کہ یہ صرف غلوی قبائل کی اپنی آمدنی بحال
کروانے کے لیے احتجاجی کارروائی نہ تھی بلکہ پورا ملک
برطانوی حکمرانوں اور فوجیوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا
تھا۔ افغان باغیوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی
تھی۔ دروں میں اور کابل کے ارد گرد بھی لڑائی کی
افواہیں عام تھیں۔

سیل کا بریگیڈ ۱۳ نومبر کو جلال آباد پہنچا۔ اس قصبے
پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے قلعہ بندی کو مضبوط
کیا۔ اگلی صبح ہی بڑی تعداد میں غلوی اور شنواری قبائلی
جمودار ہوئے اور انھوں نے قصبے کا محاصرہ کر لیا۔ سیل
نے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے صورت حال کی
اطلاع پشاور میں برٹش ریذینسی کو بجھوا دی۔ اس نے لکھا
”باغیوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔
ہمیں سپاہیوں، خزانے، خوراک اور گولہ بارود کی سخت
ضرورت ہے۔ سپاہی نصف راشن پر ہیں۔ ہمارے
پاس صرف چھ دن کے لیے چاول
ہے اور آٹا بالکل نہیں۔ مدد کے لیے
فوری اقدامات کیے جائیں۔“

جنوبی افغانستان میں وسیع پیمانے پر
بغاوت واضح طور پر ناگزیر دکھائی
دے رہی تھی۔ قندھار میں پوٹینیکل
ایجنٹ ہنری رالینسن کا کہنا تھا ”غیر
ملکیوں کے خلاف مخالفانہ جذبات
میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان
کے ملا ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک
ہمارے خلاف تبلیغ کر رہے ہیں۔ سرولیم میک نیکسن کی
غلطیوں نے یہ افسوسناک نتیجہ دکھایا ہے۔ لارڈ آک
لینڈ نے اس شخص کو کیسے یہاں کا حاکم بنایا دیا جس نے
انگریزوں کے نام سے وابستہ ہر چیز کو قابل نفرت بنا
دیا۔“ غزنی کا کمانڈر کرنل تھامس پامر بھی یکساں
تشویش میں مبتلا تھا۔ چاریکر میں ایملڈ ڈ پائٹر سب
سے زیادہ خوفزدہ تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کے گورکھا
دستے کا قتل عام ہونے والا ہے۔ تاہم میک نیکسن ابھی
تک ان رپورٹوں کا مستحضر اثر رہا تھا۔ اس کے ضرورت

سے زیادہ اعتماد اور ہٹ دھرمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لارڈ آف لینڈ نے افغانستان میں اس کی کارکردگی کا اس کی توقع سے بڑھ کر انعام دینے کا فیصلہ کر لیا تھا یعنی بھٹی کی گورنر شپ اور مالابار ہل پر شاندار رہائش گاہ۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد اس ناشر کے ساتھ اس ملک سے واپس جائے کہ وہاں امن و سکون اور ترقی کا دور دورہ تھا اور بعد میں پیش آنے والے سانحات کی ذمہ دار کسی جانشین پر ڈالی جاسکے۔ میک ٹیکن کی روانگی کی صورت میں اس اعلیٰ منصب پر برنس کے فائز ہونے کے امکانات سب سے زیادہ تھے۔ اگرچہ وہ ہمیشہ اس عہدے کا متمنی رہا تھا لیکن اب محمدرش حالات کے پیش نظر وہ بھی متاثر تھا۔ اس کی پیش و طرب کی سرگرمیوں نے اس کو افغانستان میں نفرت کی علامت بنا دیا تھا۔

کابل کے سردار اور امراء افغانستان پر برطانیہ کے قبضے، غلو کی سرداروں کے الاؤنس میں کٹوتی، شاہ شجاع کی بے وقعتی اور ملاشکور کی برطرفی پر ناراض اور نالاں تھے۔ شاہ شجاع کی حکومتی معاملات میں اپنا بے بسی کی شکایات نے بھی قابض برطانوی فوج کے خلاف نفرت کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کیا۔ رات کے وقت انھوں نے قرآن پر حلف اٹھایا کہ وہ قابض افواج کے خلاف متحد رہیں گے اور ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ مولانا حامد کشمیری جنگ نامہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔ (ترجمہ)

شاہ شجاع ہے بے اختیار و بے سپاہ
لاٹ جنگل ہے نشے میں مبتلا
برنس ہے اپنے غرور اور نشاط میں مگن
اس سے بہتر لمحہ ہاتھ نہ آئے گا پھر کبھی

وقت گزرتا جا رہا ہے ویر مت کرو
شکار کو ہاتھ سے نکلنے مت دو
بد معاش برنس کو پکڑنے میں جلدی کرو
طلوع منس کے ساتھ صاب یہاں کرو
یکم نومبر ۱۸۴۱ء رمضان کے پہلے ہفتہ میں عبداللہ خان اچکزئی کی ایک باندی رات کے وقت فرار ہو کر انگریزوں برنس کی رہائش گاہ پر چلی گئی۔ جب خان نے اپنے ایک ملازم کو بھیجا کہ وہ لڑکی کو واپس لے آئے تو برنس نے طاقت اور غرور کے نشے میں ملازم کو شدید زد و کوب کیا اور گھر سے باہر پھینک دیا۔ موہن لال کشمیری کے مطابق یہ حد سے زیادہ اشتعال انگیز حرکت تھی۔ عبداللہ خان اچکزئی نے پہلے امین اللہ خان لغاری کو قرآن کا واسطہ دے کر انگریزوں کے خلاف ساتھ دینے کی اپیل کی۔ جب وہ متفق ہو گیا تو پھر اس نے اپنے گھر پر کابل کے سرداروں کا جرگہ بلا دیا اور ان سے خطاب کیا۔ ”اب ہم انگریزوں کی حکومت کو گرانے میں حق بجانب ہیں۔ ان کے قلم و استبداد کا ہاتھ چھوٹے بڑے شہریوں کی آن اور عزت تک پہنچ گیا ہے۔ ایک باندی کی عصمت دری کی کوئی حقیقت نہیں لیکن ہمیں اس سلسلے کو ہمیں روکنا ہوگا ورنہ یہ انگریز اپنی خواہشات کے گدھے پر سوار ہو کر حقائق کا ارتکاب کریں گے۔ وہ جلد ہی ہم سب کو گرفتار کر کے کالا پانی قید خانے میں بھیج دیں گے۔ میں خدا پر بھروسہ کرتا ہوں اور پیغمبر محمد ﷺ کا علم جہاد بلند کرتا ہوں۔ اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو یہ ہماری خواہش کے مطابق ہوگا۔ اور اگر ہم جنگ میں مر جاتے ہیں تو پھر بھی یہ ذلت اور رسوائی کی زندگی سے بہتر ہے۔“

تمام سردار جو اس کے بچپن کے دوست بھی تھے مقدس جنگ یعنی جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔ جب

موہن لال کو اپنے مخبروں کے ذریعے سازشیوں کی میننگ کا علم ہوا تو وہ فوراً برنس کے پاس گیا اور اس کو ممکنہ بغاوت کے بارے میں خبردار کیا۔ برنس اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دن اس کے لیے کیا خبر لائے گا۔ لیکن غلطی قہاں نے تمام درے بند کر دیے تھے اس لیے اس روز کا بل میں کوئی ڈاک نہیں پہنچی۔ اس کا خیال تھا کہ چند دن کے اندر میک نیگن بھیجی چلا جائے گا مگر وہ سرداروں کو ان کے الاؤنس بحال کر کے وام کر سے گا۔ جب موہن لال پل خشتی بازار میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا، سازشی حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ صبح ہونے سے پہلے ہی وہ برنس کے گھر پر حملے اور حفاظت پر مامور سپاہیوں کا اپنی تلواریں سے کام تمام کر دیا۔ لڑائی کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور کاہل کے لوگوں نے اس کو خدا کی طرف سے انعام سمجھ کر خوش آمدید کہا۔ انھوں نے اپنی دکانیں بند کیں اور چھپار لے کر چائے دقوعہ پر پہنچ گئے۔ صبح ہوتے ہوئے افغان نڈی دلی کی طرح گلیوں میں نمودار ہوئے اور انگریز پلڈر برنس کے گھر کے گرد جمع ہو گئے۔

۲ نومبر کی صبح سردار صاف تھی۔ کاہل شہر سے باہر چھاؤنی میں شاہ شجاع کی فوج کو متخاوا تقسیم کرنے والا افسر ہیو جانسن جلد بیدار ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ شہر میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر وہ چھاؤنی میں رات گزارے اگرچہ شہر کے مرکزی شور بازار میں اس کی افغان محبوبہ اس کی خطر رہی۔ اس کا اپنا گھر برنس کے گھر کے مقابل واقع تھا۔ طلوع آفتاب کے آدھ گھنٹہ بعد اس کے چڑا سیوں نے اس کو بتایا کہ اس کے گھر اور خزانہ

کے سامنے ایک ہجوم جمع ہو چکا ہے۔ وہ اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور برنس ان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانسن نے اپنا گھوڑا تیار کرایا اور اپنے گھر تک جانے کا ارادہ کیا لیکن ایک ملازم نے اس کو بتایا کہ برنس اور میرے گھر کی گلی پر ہجوم کا مکمل قبضہ ہو چکا ہے۔ وہ گیٹ توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میرا خزانے کا محافظ ان پر گولیاں چلا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میرا گھر تک پہنچنا ناممکن ہے کیونکہ باغیوں کی تعداد ہر لمحے بڑھتی جا رہی ہے اور وہ یورپی اور ہندوستانی باشندوں کو قتل کر رہے ہیں۔

جانسن کہتا ہے "میں نے سوچا کہ ان رپورٹس کی موجودگی میں جزئی انفیشن کی طرف سے اس بغاوت کو برد کرنے اور خزانے اور برنس کی زندگی بچانے کے لیے ایک دستہ فوری طور پر بھیجا جائے گا اور بہتر ہو گا کہ میں بھی اس کے ساتھ ہی جاؤں۔ میں نے دیکھا کہ شہر کی طرف سے گہرے دھوکے کے ہادل اٹھ رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باغیوں نے میرے گھر کو آگ لگا دی ہے۔ میں نے شدید فائرنگ کی آوازیں بھی سنیں۔ لیکن ہم حیران تھے کہ جنرل نے خزانے اور برنس اور دوسرے عملے کو بچانے کے لیے ابھی تک کسی دستے کی روانگی کا حکم کیوں نہیں دیا۔ بار بار پوچھنے پر پتا چلا کہ ہنگامے کی خبروں کے بعد بیمار جنرل نے گھوڑے پر سوار ہونے کی کوشش کی تو وہ دھپ سے نیچے گرا اور گھوڑا اس کے اوپر گر گیا۔ اس کے بعد وہ تقریباً مفلوج الحواس ہو گیا۔ اس دوران ان کو پھیل گئی جو جع ثابت ہوئی کہ سرکش باغیوں نے گیٹ اور دیوار توڑ کر میرے گھر اور خزانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور حفاظت پر مامور کیشنڈ افسروں کے علاوہ ایک صوبیدار اور ۲۸ سپاہیوں کو قتل کر

دیا تھا۔ میرے گھریلو ملازمین نے سارا خزانہ لوٹ لیا جو ایک لاکھ ستر ہزار روپے پر مشتمل تھا اور میرے ذاتی مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔

میک نیکسن کے نوجوان ملٹری سیکرٹری جارج لارنس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مصیبت آنے والی ہے۔ اس نے جھاڑنی میں سب فوجیوں کو تیاری کا پیغام دے دیا۔ اس کے ایک ملازم نے جو شہر سے واپس آیا تھا، بتایا کہ تمام دکانیں بند ہو چکی ہیں اور گلیوں میں مسلح افراد کا ہجوم ہوتا جا رہا ہے۔ لارنس نے میک نیکسن کو تجویز پیش کی کہ

جھاڑنی میں موجود پانچ ہزار فوجیوں کو فوری طور پر صورتحال سے نمٹنے کے لیے شہر بھیجا جائے اور بغاوت کے راہنما امین اللہ خان لغاری اور عبداللہ خان اچکزئی کو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن یہ تجویز فوراً رد کر دی گئی۔ اور اسے مشورے دیے گئے کہ لے شاہ شجاع کے پاس بالاحصار جانے کا حکم دیا گیا۔ لارنس جمع نو بجے

چار سپاہیوں کی مصیبت میں جھاڑنی سے روانہ ہوا۔ راستے میں گھات لگانے والے افراد نے ان پر حملہ کر دیا لیکن وہ اپنی مہارت اور تیز رفتاری سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بالاحصار میں جب لارنس کی ملاقات شاہ شجاع سے ہوئی تو وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے کہا "کیا یہ وہی انجام نہیں جس سے میں نے میک نیکسن کو پہلے ہی خبردار کیا تھا مگر اس نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا۔" لارنس کے پہنچنے سے پہلے ہی شاہ اپنے بیٹے فتح جنگ اور نظام الدولہ عثمان خان کو کچھ سپاہیوں کے ساتھ شہر میں ہنگامے پر قابو

پانے کے لیے بھیج چکا تھا۔ لارنس اس حقیقت سے باخبر تھا کہ انگریز افسران مبینوں سے شجاع کو کامل اور غیر موثر کہہ رہے تھے۔ لیکن جب بحران شروع ہوا تو اسی نے شہر میں بغاوت کو دبانے کے لیے فوری اقدام کیا اور اپنے وفادار اینگلو انڈین کمانڈر ولیم کیمپبل اور فتح جنگ کو ایک ہزار آدمیوں اور دو توپوں کے ساتھ ہجوم کے خلاف کارروائی کے لیے بھیجا۔ درحقیقت شجاع ہی وہ واحد شخص تھا جس نے برنس کی زندگی بچانے کی کوشش کی مگر چھوٹے گزشتہ عشرے سے شجاع کا سب سے بڑا ناقد رہا تھا۔ لارنس کی موجودگی میں فتح جنگ کی کامیاب کارروائی کی خبریں شجاع تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔



سر ایلزینڈر برنس

تاہم کچھ دیر بعد واقعات میں خطرناک تبدیلی آئی شروع ہو گئی۔ جلد ہی خبر ملی کہ کیمپبل اور فتح جنگ کے فوجیوں پر شہر کی جنگ گلیوں میں حملہ کیا گیا ہے اور گھروں میں پیچھے ہوئے نشانہ بازوں نے ان کے سوا آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ان کی توپیں بھی چھین گئیں اور ان کو برنس کے گھر سے کچھ فاصلے پر روک دیا گیا۔ شجاع اپنے بیٹے کی سلامتی کے لیے فکر مند ہو گیا اور پدرانہ شفقت سے مجبور ہو کر اس نے اپنے بیٹے اور نظام الدولہ کو واپس بلا لیا۔ نظام الدولہ نے واپسی پر سخت لمبے میں غصے کا اظہار کیا "فتح کے قریب ہمیں واپس بلانے سے آپ کے فوجیوں کو شکست ہو جائے گی اور ہم سب مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔"

برنس کو اپنی مقبولیت اور سلامتی کا اتنا یقین تھا کہ

اس کے پاس صرف بارہ محافظ تھے۔ نظام الدولہ نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ گھر چھوڑ دے اور اس کے ساتھ بالاحصار چلا جائے کیونکہ اس کی ذاتی سلامتی زبردست خطرے میں تھی۔ برنس نظام الدولہ کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن اس کے محافظ دستے کے انصرنے اس کو یاد دلایا کہ اس کو وہاں ٹھہر کر میک ٹیکنسن کے جواب کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس لیے نظام الدولہ اکیلا ہی روانہ ہو گیا اور وعدہ کیا کہ وہ شاہ شجاع کے فوجیوں کی ایک بٹالین کے ہمراہ واپس آئے گا۔ اس اثنا میں بغاوت کے راہنما عبداللہ خان اچکزئی کے حکم پر باغیوں نے برنس کے گھر سے متصل باغ میں پوزیشن سنبھال لی۔ باقی راہنما برنس سے اس لیے نفرت کرتے تھے کہ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزوں کو افغانستان میں لانے کا ذمہ دار وہی ہے۔ اس پر یہ بھی الزام تھا کہ وہ ان کو مناسب احترام نہیں دیتا۔ وہ اس کو افغانستان میں ایک نہایت متضاد اور ناقابل قبول نظام کے نفاذ کا ذمہ دار بھی سمجھتے تھے۔

برنس اپنے آپ کو نچلے طبقات میں ہر دلعزیز سمجھتا تھا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مھلک تھی۔ اس لیے جب برنس نے اپنے دو اچھی باغی راہنماؤں کے پاس بھیجے تاکہ وہ اپنی شکایات بتائیں اور اس کے ساتھ امن کی شرائط طے کریں تو انھوں نے پہلے کا سر قلم کر دیا اور دوسرے کو واپس جانے دیا تاکہ وہ یہ پیغام پہنچا سکے۔ پھر سرداراں نے اپنے آدمی مکالوں کی چھتوں پر تعینات کر دیے تاکہ وہ برنس کے محکم میں اتر سکیں۔ موہن لال کشمیری کے بقول تقریباً دو سو آدمیوں نے گھر کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ برنس بالائی منزل کی کھڑکی سے باغیوں کو پرسکون رہنے کی تلقین کر رہا تھا اور ان سب کو پرکشش انعامات کی پیشکش کر رہا تھا۔

عین اس لمحے باغیوں نے برنس کے گھر کے دروازے کو آگ لگا دی۔ آگ کے شعلے اس کمرے تک پہنچ رہے تھے جہاں برنس اور اس کا بھائی کھڑے ہجوم کو دیکھ رہے تھے اور رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ برنس کا بھائی باہر باغیچے میں آیا اور اس نے چھ آدمیوں کو مار ڈالا اور پھر اس کے کھڑے کر دیے گئے۔ اس کے بعد برنس کے ساتھ کیا ہوا ٹھیک طور پر معلوم نہیں کیونکہ کسی عینی شاہد کا بیان تاریخ میں موجود نہیں۔ اس کی موت کے بارے میں مرزا عطاء نشی عبدالکریم، موہن لال و دیگر کی بیان کردہ روایات موجود ہیں۔ ان میں موہن لال کی روایت نسبتاً قابل اعتبار ہے۔ وہ بیان کرتا ہے۔ "جب آگ نے کمرے کو جلا کر خاکستر کر دیا تو سرانگیزہ بڑھ کر برنس اپنے باغ میں آ گیا۔ اس نے ہجوم سے اپنی زندگی بچانے کے لیے التجا کی لیکن جواب میں اس پر گولیوں اور پھٹکار کی بارش کی گئی۔ جب اس کو اپنی زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے اپنی سیاہ عکائی آنکھوں پر ہاتھ لی تاکہ وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ موت اس پر کس طرف سے دار کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ غضب ناک ہجوم فی الفور اس پر ٹوٹ پڑا۔ دو سو بہادر افغانوں کی آبدار گواروں نے اس کے جسم کے چھتھرے اڑا دیے۔ اس وقت اس کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ مولانا کشمیری کے مطابق (ترجمہ)

انھوں نے اس کے کھڑے لٹکا دیے بلند دیکھا سبھی نے بہتا ہوا خون ہر طرف مال و دولت اور اسباب سب لوٹا گیا خزاں میں شجر جیسے ٹنڈ منڈ ہو گیا (جاری ہے) ◆◆◆

کھیل اور کھلاڑی
خوشیوں اور غموں سے سجے

ورلڈ کپ کے یادگار لمحات

فٹ بال کے عالمی میلے میں جنم لینے والے
ورلڈ کپ واقعات کا تذکرہ

ایضاح

برازیل میں ہونے والا فٹ بال ورلڈ کپ اپنے جلو
میں کئی یادگار لمحے سمیٹے رکھتے ہو گیا۔ اس دوران کبھی
خوشیوں کی بہار دیکھنے کو ملی تو کبھی اداسیوں کی خراں نظر
آئی۔ چونکہ بظاہر دنیائے فٹ بال میں میچ فلکسٹک کی وبا
نہیں پھیلی اس لیے سنسنی خیز مقابلے دیکھنے کو ملے۔ اور
آخر کار جرمن ٹیم فاتح بن کر وطن واپس لوٹی۔ ذیل میں
ان لمحات اور واقعات کا تذکرہ پیش ہے جو ورلڈ کپ
۲۰۱۴ء کو غیر معمولی دلچسپ بنا گئے۔

کھلاڑی یا آدم خور؟

۲۴ جون کو گرورپ ڈی کی دو ٹیموں اٹلی اور
یوراگوئے کے مابین مقابلہ ہوا۔ اگلے مرحلے میں پہنچنے
کے لیے ضروری تھا کہ یوراگوئے مقابلہ جیت لے۔
جبکہ اٹلی محض میچ برابر کرنے پر اگلے مرحلے میں پہنچ
جاتا۔ توقع کے مطابق کھیل بہت دلچسپ ثابت ہوا۔



شمارہ ۱۰۱۱ سہ ماہی کوئی نئی کی کر

کبھی اطالوی زور دار حملہ کرتے تو کبھی پورا گوئن کھلاڑیوں کا پلہ بھاری ہو جاتا۔ کھیل کے ۷۹ ویں منٹ تک میچ برابر تھا۔

اسی وقت دوران کھیل پورا گوئن کھلاڑی لوئس سوریز اطالوی فٹ بالر گیورگیو کیلی سے ٹکرا گیا۔ اس پر سوریز کو اتنا تازہ آیا کہ پورا گوئن فٹ بالر نے اطالوی کھلاڑی کا کندھا چبا لیا۔ جب بیمار کیلنی تکلیف کے مارے چیخیں مارنے لگا تو ریفری کو ہوش آیا۔ اس نے سرخ کارڈ دکھا کر سوریز کو باہر نکال دیا۔

☆ ☆

۲۷ سالہ لوئس سوریز

ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ کم سن ہی تھا کہ طلاق نے اس کے ماں باپ کو علیحدہ کر دیا۔ سوریز پھر اپنا پیٹ بھرنے کی خاطر کم سنی

میں ملازمتیں کرنے لگا۔ کبھی جھگڑا اور کبھی مزدور۔ غرض اس نے لڑکپن میں بہت تکالیف برداشت کیں اور بڑا سخت زمانہ دیکھا۔

لڑکپن میں دوران ملازمت ہی وہ کھیلوں اور پارکوں میں فٹ بال بھی کھیلنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کے جوہر نمایاں ہوئے تو ایک مقامی فٹ بال کلب نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ ۲۰۰۹ء میں جب مشہور ولندیزی فٹ بال کلب آجکس (Ajax) نے اسے بھرتی کیا تو سوریز کو عالمی شہرت ملی۔

لیکن لڑکپن میں سوریز نے جو تلخیاں سہی تھیں

انہوں نے اسے خاصا تشدد اور لڑاکا بنا دیا۔ یہ کیفیت ۲۰۱۰ء میں نمایاں ہوئی جب ایک میچ کے دوران اسی نے معاصر کھلاڑی عثمان پاکل کا بازو کاٹ کھایا۔

تین سال بعد ۲۰۱۳ء میں سوریز نے ایک اور کھلاڑی برزیل آریوچ کے کندھے پر کاٹ لیا۔ تب اس پر اس میچ نہ کھیلنے کی پابندی لگا دی گئی۔ اب یہ تیسرا انوکھا واقعہ ہے کہ سوریز دوران کھیل ٹیش میں آ کر انسان سے حیوان بن گیا۔

۲۷ جون کو فلینا کی ڈسپلری کمیٹی نے سوریز کو نو بین الاقوامی میچ کھیلنے سے روک دیا۔ اس سزا نے اسے ورلڈ کپ سے باہر کر ڈالا۔ چونکہ وہ پورا گوئن ٹیم کا بہترین کھلاڑی تھا لہذا وہ اس کی عدم موجودگی میں بمشکل اگلے مرحلے میں پہنچ پائی۔ سچ ہے غصے کا نتیجہ برا ہی نکلتا ہے۔



لوئس سوریز ایک کھلاڑی تھا جسے بونے

تھامس میولر

پرتگال کی ٹیم میں بھی تھی (Pepe) نامی فٹ بالر جلد آپ سے باہر ہونے والے کھلاڑیوں میں سے ہے۔ اس کی غصہ ماک کی کا مظاہرہ پرتگال اور جرمنی کے مابین مقابلے میں سامنے آیا۔

ہوا یہ کہ دوران کھیل مشہور جرمن فارورڈ تھامس میولر اور تھی ٹکرا گئے۔ کھیل کھیل میں دھکم پیل ہو ہی جاتی ہے۔ مگر اس ٹکراؤ نے تھی کو چراغ پا کر دیا۔ موصوف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ میولر کو سر سے ٹکرو دے ماری۔ وہ بیمار اہلہا کر رہ گیا۔

سرفہرست ٹھہرے گی۔ اس گروپ میں برطانیہ کے علاوہ اٹلی، یوراگوئے اور کوسٹاریکا شامل تھے۔

لیکن چاروں ٹیموں کے باہمی مقابلے شروع ہوئے تو نتائج نے بھی سبھی کو حیران پریشان کر دیا۔ خصوصاً انگریز تو اپنی ٹیم کی پے در پے ناکامیوں سے گھبرا کر دامن میں منہ پھپھانے لگے۔ کسی کو برطانوی ٹیم سے اتنا خراب کھیل پیش کرنے کی توقع نہیں تھی۔

پہلے میچ میں اٹالیوں نے انگریزوں کو شکست دی۔ پھر دوسرے میچ میں یوراگوئے کی کمزور ٹیم نے انہیں ہرایا۔ تیسرے میچ میں برطانیہ اور کوسٹاریکا کا مقابلہ برابر رہا۔ یوں انگریز ٹیم بہت خفت اٹھا کر وطن واپس پہنچی۔

گروپ ڈی بی میں سابق چیمپئن اٹلی کی بھی جنوبی امریکن ٹیموں نے خوب درگت بنائی۔ اس طرح دو بڑی یورپی ٹیموں کا غرور خاک میں مل گیا۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ دونوں ٹیموں کا تعلق سابقہ نو آبادیاتی طاقتوں (برطانیہ اور اٹلی) سے تھا۔

کوسٹاریکا کی ولولہ انگیز کہانی

ورلڈ کپ ۲۰۱۳ء میں کوسٹاریکا کی ٹیم تیس ممالک کی کمزور ترین ٹیموں میں شامل تھی۔ جب عالمی کپ کا آغاز ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ عام ہی ٹیم کا رہائے نمایاں انجام دے گی۔

یہ ٹیم گروپ ڈی میں شامل تھی۔ اس کا پہلا جوڑ یوراگوئے کی مضبوط ٹیم سے پڑا۔ کوسٹاریکا ٹیم نے مقابلہ دو گول سے جیت لیا۔ اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں احساس ہوا کہ یہ ٹیم کرشمہ دکھانے کا ہونا رکھتی ہے۔

۲۰ جون کو اٹلی اور کوسٹاریکا کا میچ ہوا۔ یہ مقابلہ بھی کوسٹاریکا ٹیم نے جیتا۔ اس جیت کی خوشی میں کوسٹاریکا

یہ تلخ واقعہ بھی ورلڈ کپ ۲۰۱۳ء میں یادگار ثابت ہوا اور دیکھنے والوں پر عیاں کر گیا کہ اپنے جذبات کنٹرول میں رکھنا ہی عقل مندی ہے۔

ہالینڈ کا ”قتل عام“

۱۳ جون کو گروپ بی کی دو ٹیموں ہالینڈ اور اسپین کا آمنہ سامنا ہوا۔ اسپین نے ۲۰۱۰ء میں عالمی کپ جیتا تھا۔ سو بھی کواکٹے وار مقابلے کی توقع تھی۔ پچھلے کپ کے فائنل میں اسپین نے ولندیزیوں کو ہرا کر ہی ثرانی جیتی تھی۔

کھیل کے ۲۷ ویں منٹ میں اسپین نے ایک گول کر دیا۔ یوں ہسپانیہ کا پلہ بھاری ہوا۔ مگر خسارے میں جا کر ولندیزی ٹیم نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ ان کا جوش و جذبہ سوا ہو گیا۔

اب ولندیزیوں نے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور ہسپانوی ٹیم پر تباہ توڑ حملے کیے۔ چنانچہ انھوں نے پانچ گول دے مارے اور مقابلہ جیت گئے۔ یہ ۱۹۵۰ء کے بعد ہسپانوی ٹیم کی بدترین شکست تھی اور پہلا موقع تھا کہ اپنے اعزاز کا دفاع کرتی ٹیم کو اتنے زیادہ گول کھانے پڑے۔

اس شکست سے ہسپانوی ٹیم اتنا ہلکا لی کہ اس کے میچ میں چل سے بھی ہار گئی۔ تاہم آسٹریلیا سے جیت کر وہ اپنا کچھ وقار بحال کرنے میں کامیاب رہی۔ ویسے کھیل کوئی بھی ہٹ ہر ٹیم پر برد اور آتا ہے۔ کبھی وہ عمدہ کارکردگی دکھاتی تو کبھی ٹائٹس ٹائٹس ہو جاتی ہے۔

برطانیہ کی درگت

برطانوی ٹیم میں ”ائن روئی“ سٹیون گیریڈ اور فرینک لمپارڈ جیسے عالمی شہرت یافتہ فٹ بالر شامل تھے۔ سو سبھی کو یقین واثق تھا کہ وہ گروپ ڈی میں

نیٹار اور میسی

ورلڈ کپ ۲۰۱۳ء میں رونالڈو اور وائٹ روڈی نہیں چل سکے۔ البتہ ارجنٹائن لیونل مسی برازیلی فٹ بالر نیٹار اور جرمن تھامس میسر کی پینگ ضرور چڑھی رہی۔ یہ دونوں ہی عالمی کپ کے ڈھلے تھے۔ اور ان کا کھیل دیکھنے و تیا بھر سے عاشقان فٹ بال برازیل پہنچے۔

نیٹار نے گروپ اسٹیج میں کروشیا اور کیمرون کے خلاف عمدہ گول کیے۔ نیز دیگر میچوں میں اچھا کھیل دکھایا۔ بد قسمتی سے کولمبیا کے میچ میں وہ ایسا زخمی ہوا کہ پھر نہ کھیل سکا۔ اور اس کا ٹیم سے باہر ہونا ہی برازیلیوں کے زوال کا سبب بن گیا۔ جب کوئی ٹیم ایک دو کھلاڑیوں ہی پر انحصار کرے تو پھر اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔

سبھی ”سپر سٹار“ فٹ بالروں میں میسی کی کارکردگی چوٹی پر رہی۔ ارجنٹائن گروپ ایف میں شامل تھا۔ دیگر ٹیموں میں ”ناچیریا“ بوسنیا اور ایران کی ٹیمیں شامل تھیں۔ میسی نے تینوں میچوں میں گول کیے اور یہ حقیقت ہے کہ ارجنٹائن اسی کی وجہ سے ٹاک آؤٹ مرحلے میں پہنچے۔

ارجنٹائن اور ایران کا بڑا سخت کانٹے دار مقابلہ ہوا۔ لگتا تھا کہ چنٹائی ٹکس پر ہی میچ کا فیصلہ ہوگا۔ تاہم مقابلے کے ۹۰ ویں منٹ پر میسی نے گول کر کے اپنی ٹیم کا بڑا پار کر دیا۔ اگر فاسٹ میں میسی گول کر دیتا اور پھر ارجنٹائن ہی فاتح قرار پاتا تو یقیناً ماہرین اسے دنیا فٹ بال کا عظیم کھلاڑی مان لیتے۔ مگر ایک غیر مشہور جرمن کھلاڑی نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔

کے قریباً پچاس لاکھ باشندوں نے زبردست جشن منایا۔ حتیٰ کہ کوشاریکن صدر سڑکوں پر نکل آیا اور عوام کے ساتھ ناچ گانے میں مصروف ہو گیا۔

۲۹ جون کو ٹاک آؤٹ مرحلے میں یونان اور کوشاریکا کا مقابلہ ہوا۔ توقع کے مطابق دونوں ٹیموں نے جیت کی خاطر جان لڑا دی۔ تاہم فتح کا سہرا کوشاریکن ٹیم کے سر بندھا۔ یوں وہ کمزور ٹیم جسے کوئی درخور اعتنا نہیں سمجھتا تھا نامور معاصرین کو چاروں شانے چت کرتی کوارٹر فائنل میں پہنچ گئی۔ کوارٹر فائنل میں ہالینڈ جیسی مضبوط ٹیم بمشکل پنٹلیوں ہی پر اسے ہرا سکی۔

شکستہ دل کھلاڑی

۱۶ جون کو جب جرمنی اور پرتگال کا مقابلہ ہوا تو شائقین کو یقین تھا کہ زبردست میچ ہونے والا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ پرتگالی ٹیم میں مشہور فٹ بالر کرسٹانو رونالڈو بھی شامل تھا۔ یہ دنیا کے مہنگے ترین فٹ بالروں میں سے ایک ہے۔ اس کی ہفتہ وار آمدن پاکستانی کرنسی میں ایک کروڑ روپے سے زیادہ ہے۔

تاہم جرمنی اور پرتگال کا میچ کھودا پہاڑ نکلا چوہا کے مصداق بومس ثابت ہوا۔ جرمنوں نے مار مار کر پرتگالیوں کا بھر کس نکال دیا۔ انھوں نے چار گول کئے پرتگالی ایک گول بھی نہ کر سکے۔

بعد ازاں پرتگال اور امریکا کا میچ برابر رہا۔ گو پرتگالی گھانا کو ہرانے میں کامیاب رہے مگر بہتر گول ایورتی کی بنا پر امریکا ٹاک آؤٹ مرحلے میں پہنچ گیا۔ یوں رونالڈو کو لوٹ کے بدھو گھر کو آئے کے مانند بے ٹیل و سرام وطن جانا پڑا۔ اسے پچاڑا رونالڈو



لمحہ فکریہ

لاہور تباہی کے دیانے پر

درست کہ وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف
نے شہر کا چہرہ سنوارنے کی خاطر اہم اقدامات کیے
ہیں۔ مگر مسائل کا انبار ان اقدامات کو نکلے جا رہا ہے۔
اسی باعث لاہور کا حسن بتدریج گہناتے لگا ہے۔

مسائل میں سرفہرست برقی آبادی ہے جس کے
سبب شہر کا دقبہ پھیلتا جا رہا ہے۔ دیگر یہ ہیں: پینے کے
پانی میں سیوریج والے پانی کی آمیزش، زیر زمین پانی
کی تلخی سطح ہوا میں آلودگی کی کثرت اور صنعتی فضلے کا
مخالی (Treatment) کے بغیر دریائے راوی میں
گرا دیے جانا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر درج بالا مسائل حل نہ کیے
جائیں، تو اگلے دس تین برس میں لاہور بھی ہڑپہ یا ٹیکسلا
کے مانند زوال پذیر ہو کر کھنڈر بن جائے گا۔ ان مسائل
کا حل ممکن ہے اور ان پر عمل کرنا بھی آسان۔ بس
حکومت ارادہ کر کے عوام کا تعاون حاصل کر لے۔ چند

ان گھبر مسائل کا تذکرہ جو بشکل آکنو پس
باغات کے شہر کو نگل رہے ہیں

بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

زمانے میں لاہور باغات کا شہر کہلاتا تھا۔
جو بدلتی اس گھر میں آتا، دور دور تک سبزہ
پھیلا دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ شہر کی ہوا
پاک صاف اور آکسیجن سے بھرپور تھی۔ مگر اب لاہور کا
حلیہ خاصا تبدیل ہو چکا۔

ایک



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

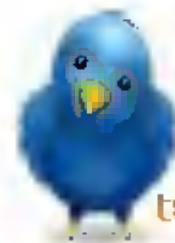
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

قانون لاگو ہونا چاہیے تاکہ وہاں عمارات اور کارخانوں کا جنگل نہ آگ آئے۔

حل درج ذیل ہیں:

کارخانے شہر سے دور ہوں

لاہور کے ارد گرد کارخانے قائم ہونے سے بھی وہی آبادی بڑی تعداد میں شہر کا رخ کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے کارخانے پس ماندہ اور غیر زرعی علاقوں مثلاً ڈیرہ غازی خان اور قنبر میں قائم کیے جائیں۔ یوں ان علاقوں میں ترقی و تعمیر جنم لے گی۔ جب کہ لاہور اور دیگر شہروں پر آبادی کا دباؤ کم ہوگا۔

بارش کا پانی

دنیا کے کئی علاقوں میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا ہے تاکہ اسے گھریلو استعمال میں لایا جاسکے۔ لاہوری بھی چھت یا برآمدے میں جمع پانی کو بذریعہ پائپ ٹینک میں بھر سکتے ہیں۔ یہ پانی پھر مختلف طریقوں سے کام میں لانا ممکن ہے۔ میری تجویز ہے، یہ قانون بنا دینا چاہیے کہ ہر گھر میں بارش جمع کرنے والا نظام نصب کیا جائے۔

کوڑے کو کھاد میں بدلے

اس وقت لاہور کا کوڑا کرکٹ محمود پوٹی میں جمع کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک مہنگا طریق کار ہے۔ ہوتا یہ چاہیے کہ کم از کم نامیاتی کوڑے کو کھاد میں بدل دیا جائے۔

ایک رپورٹ کے مطابق صرف لاہور کا نامیاتی کوڑا کھاد میں بدل دیا جائے، تو یومیہ "ایک ہزار ٹن کھاد" حاصل ہو سکتی ہے۔ یوں وطن عزیز کھاد درآمد کرنے پر جو کثیر قیمتیں زرمبادلہ خرچ کرتا ہے، اسے بچانا ممکن ہو سکے گا۔

ہاؤسنگ اسکیموں پر پابندی

پچھلے ۲۵ برس کے دوران لاہور کے قرب و جوار میں واقع کھیت نیست و نابود ہو چکے۔ اب وہاں ہاؤسنگ اسکیمیں بن رہی ہیں۔ بعض اسکیمیں قلب شہر سے ۴۰ کلومیٹر دور ہیں۔ چونکہ یہ اگلے بیس سال تک رہائشی ضروریات پوری کر سکتی ہیں، لہذا مزید ہاؤسنگ اسکیموں کے قیام پر پابندی لگا دی جائے۔ کھیتوں کی کمی سے اناج کا قحط جنم لے سکتا ہے۔

کچی آبادیوں کی جگہ فلیٹ

لاہور میں کچی جگہ کچی آبادیاں واقع ہیں۔ ضروری ہے کہ وہاں کولہو اور بنکاک کی طرح فلیٹ تعمیر کر دیے جائیں۔ یوں نہ صرف جگہ خالی ہوگی بلکہ مکینوں کو بہتر طرز زندگی میسر آئے گا۔ خالی جگہوں پر پارک بن سکیں گے۔

ٹریفک کا ہجوم

شہر میں چوراہوں اور جیٹوں پر اکثر ٹریفک جھنپ جاتی ہے۔ فلائی اوور اور انڈر پاسوں کی تعمیر سے یہ مسئلہ حل کرنا ممکن ہے۔ نیز عوام کو یہ تعلیم دینی چاہیے کہ مختصر حل کی خاطر جب وہ اشارے پر کھڑے ہوں تو اپنی گاڑیوں کے انجن بند کر دیا کریں۔

کھیت ختم نہ کیجیے

مصر اور کئی یورپی ممالک میں شہری کھیتوں کو صرف حکومتی اجازت ہی سے رہائشی یا صنعتی زمین میں بدل سکتے ہیں۔ لاہور کی مضافاتی بستیوں میں بھی اسی قسم کا



نوید مسرت

سٹسٹھ سال انتظار کے بعد

سیریم کورٹ

میں اردو کی فتح

جسٹس جواد ایس خواجہ نے قومی زبان میں
مقدمے کی روداد تحریر کر کے اپنے جذبہ
حب الوطنی کا ثبوت دے ڈالا

سجاد تھادر

امریکی اپنی زبان (انگریزی) مفتوح جاپانیوں پر تھوپ
دیے، تو رفتہ رفتہ جاپانی بدلتی تہذیب و تمدن میں رچ بس
جاتے۔ لیکن آج بھی جاپانیوں نے صدیوں پرانی اپنی
تہذیب و ثقافت کو سینے سے لگا رکھا ہے۔

تاریخ کا سبق یہی ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کا
وجود ان کی زبان ہی سے قائم دائم رہتا ہے۔ اگر قومی
زبان ہی زندہ نہ رہے تو بڑی سے بڑی تہذیب اور
شاندار قوم بھی قصہ پارینہ بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک زمانہ
تھا جب ہندوستان تا ترکی بیشتر علوم فارسی میں لکھے اور
پڑھے جاتے تھے مگر جب دیگر زبانیں اس پر حاوی
ہوئیں تو فارسی ایران تک سمٹ گئی۔

شہنشاہ جاپان کی حکمت عملی سے جاپان کی قومی
زبان زندہ رہی۔ اپنی زبان ہی میں تعلیم پا کر جاپانیوں
نے پھر اپنی مملکت کو سائنس و ٹیکنالوجی کی دور میں
سر فہرست اور بہت بڑی معاشی قوت بنا ڈالا۔ اگر اس

عظیم دہم میں جب امریکا نے ہیروشیما اور
ناگاساکی کو تباہ و برباد کر جاپان پر قبضہ کیا تو
جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیتو نے امریکیوں کے
سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے ایک شرط رکھی۔ یہ کہ اس
کے وطن کی قومی زبان جاپانی ہی رکھی جائے۔ یہ ایک
تاریخی فیصلہ تھا کیونکہ اس طرح شہنشاہ جاپان نے اپنی قوم
کو امریکی قوم کا غلام بننے سے بچالیا۔ ذرا سوچئے، اگر فارسی

جنگ



اردو ڈائجسٹ 187

کی ترقی کے لیے مل جل کر کام کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۷ء میں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی کوششوں سے وہ ہندوستان کی قومی زبان قرار پائی۔

لیکن جب مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا اور برطانوی راج شروع ہوا تو بہت سے ہندو اردو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ انگریزوں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے ہندوؤں میں مشہور ہو گیا کہ اردو ”لیچھوؤں“ کی زبان ہے۔ سو دونوں مسلمانوں کی زبان سے چھکارا پانے کی کوشش کرنے لگے۔

اردو کے خلاف پہلی باقاعدہ تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی جب ایک خالص ہندی زبان وجود میں آئی۔ اس سے عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ حذف کر دیے گئے۔ اس نئی زبان میں سنسکرت کے الفاظ بکثرت تھے۔ اسی نئی ہندی میں ایک ہندو نے ”پریم سائمر“ نامی ناول لکھ مارا، مگر ہندو اور انگریز اسے عوام میں مقبول نہ کرا سکے۔

جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انگریزوں کی شہ پر ہندو اردو کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے حکومت کو درخواست دی کہ اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان بنایا اور فارسی رسم الخط کی جگہ دیوناگری رسم الخط شروع کیا جائے۔ اسی وقت سرسید احمد خان نے یہ نکتہ اٹھایا کہ جب کسی علاقے میں ایک قوم کی زبان محفوظ نہیں رہ سکتی تو وہاں وہ خود کیسے زندہ رہے گی؟ اس کے بعد سرسید احمد خان اپنے مجلے ”سائنٹفک سوسائٹی گزٹ“ میں اردو کی اہمیت و افادیت پر مضامین لکھنے لگے۔

۱۸۷۱ء میں گورنر جی کیمبل نے تمام صوبائی اوروں، انتظامیہ، عدالتوں حتیٰ کہ اسکولوں میں بھی اردو زبان کے استعمال پر پابندی لگا دی۔ یوں ہندوؤں کے منصوبے کو تقویت ملی اور وہ سندھ، یوپی، بہار، پنجاب

وقت ہیروینو یہ شرط نہ رکھتا تو شاید آج جاپان امریکا کی کاٹونی بن چکا ہوتا۔

تاریخ گواہ ہے، جن اقوام نے اپنی زبان کی حفاظت کی وہ نہ صرف زندہ رہیں بلکہ دوسری قوموں پر بھی راج کیا۔ جنہوں نے دوسروں کی زبانوں کو اپنانا چاہا تو ”سو اچلائس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا“ کے مصداق اپنا وقار بھی کھو بیٹھیں۔

اب پاکستان کی مثال لیجیے۔ ہماری قومی زبان اردو ہے، مگر سترہ برس سے اسے سرکاری محکموں میں راج نہیں کیا جا سکا۔ اس کی بے قدری کا یہ عالم ہے کہ سترہ برس بعد حال ہی میں سپریم کورٹ کے ایک جج جناب جسٹس جوادلہس خواجہ کو یہ توفیق ہوئی کہ وہ اردو میں فیصلہ قلمبند کریں۔

جسٹس جوادلہس خواجہ یقیناً لائق تعریف ہیں کہ انہوں نے صحرا میں اذان دی اور اردو کا علم بلند کیا۔ اب روایت قائم ہو چکی۔ ان شاء اللہ رفتہ رفتہ قومی زبان کے عاشق دیگر جج صاحبان بھی اردو میں فیصلے دینے لگیں گے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ سپریم کورٹ کا ایک مقدمہ اردو میں لکھا جانا یقیناً ہماری قومی زبان کی بڑی فتح ہے۔

اردو زبان نے ہندوستان میں جنم لیا۔ یہ ملک زمین، قدرتی وسائل اور انسانی قوت کی وجہ سے سونے کی چڑیا کے طور پر مشہور تھا۔ اسی باعث کئی لوگ دور دراز علاقوں سے یہاں چلے آئے۔ ان کی تہذیب و ثقافت اور زبانیں بھی ساتھ آئیں۔ ان مہاجرین میں یونانی، افغان، ایرانی، ترک اور عرب شامل تھے۔ جب یہ لوگ ہندوستانیوں سے ملے چلے تو نتیجے میں اردو زبان وجود میں آئی۔

یہ زبان مغلیہ حکومت کے دوران پلی بڑھی۔ اسے بولنے والے زیادہ تر مسلمان تھے، اسی باعث وہ مسلمانوں کی زبان کہلانے لگی۔ تاہم رفتہ رفتہ ہندوستان بھر کے لوگ یہ زبان بولنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اس زبان

زیر تعلیم ہیں۔ حالانکہ اسے لیول، اولیول کے چکر میں ہم نے نہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت کو رد و الایا بلکہ اسلامی تعلیمات بھی پیچھے چھوڑ آئے۔

انگریزی اسکولوں کی تعلیم نے ہمارے بچوں کو دروازہ تھک، گنہش، شیلے، ہرنارڈ شا، فیکسیٹر اور ہارڈی کے نام اور ان کی تعلیمات تو سکھا پڑھا دیں۔ مگر جب ہم محمد بن قاسم، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، طارق بن زیاد یا کسی مسلمان رسول کے متعلق دریافت کریں، تو وہ جواب میں بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

پاکستان میں انگریزی کا جن بوجھ سے کچھ لیا باہر آیا کہ دفتر و اسکول میں، انٹرویو کے وقت غرض ہر جگہ وہ چھا چکا۔ صدر السنوٹس کہ اب انگریزی زبان میں داخلہ امتحان اور ملازمت کا بھی معیار بن رہا ہے۔ ہم اپنی زبان بچ کر اپنا سارا انصاف انگریزی میں تبدیل کر چکے۔ جب کہ بھارت اور چین میں دنیا بھر کا علم قومی زبانوں میں پھیل گیا جا رہا ہے۔ مدعا یہی ہے کہ نئی نسل کو قومی زبان میں تعلیم دے کر اسے دنیا میں اعلیٰ دنیا میں مقام دلایا جائے۔ ایک ہم ہیں کہ جامعات کے مقالے بھی انگریزی میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

حکومت کی بے توجہی کے باوجود اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اردو زبان پھل پھول رہی ہے اور اس کا مستقبل تاب ناک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق جنوری ۲۰۱۳ء سے اب تک پاکستان میں اردو پر جس سے زائد بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اردو زبان کی ترقی کا سفر جاری ہے۔ اگر حکومت پاکستان چاہتی ہے کہ ہماری تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور انداز زندگی تو اسے اردو کو بطور قومی زبان اپنانا ہوگا۔ خاص طور پر پرائمری، ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا نصاب اردو میں کرنا ضروری ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اپنی زبان سے جڑی رہیں اور عالمی سطح پر دوسری اقوام سے برابری کی سطح پر مقابلہ کر سکیں۔ ♦♦♦

اور اردو وغیرہ میں بھی اردو کے خلاف تحریکیں چلانے لگیں۔ ۱۸۷۲ء میں جب برطانیہ نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے اجرا کی خاطر ہنٹر کمیشن بھیجا تو ہندوؤں کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ مگر سرسید احمد خان کی زبردست مزاحمت کے سامنے وہ ناکام ہو گئے۔

۱۹۰۰ء میں انتھونی میکڈونلڈ (Anthony MacDonald) یوپی کا گورنر بنے۔ انتھونی ایک ہندو نژاد اور مسلم مخالف راہنما تھا۔ اس نے عہدہ سنبھالتے ہی ہندی زبان کو سرکاری صوبائی زبان قرار دے دیا۔ جب سرسید کے ساتھی اور عظیم راہنما نواب محسن الملک نے اس فیصلے کے خلاف تحریک چلائی۔ اس پر گورنر محسن الملک سے بہت خفا ہوا اور دھمکی دی کہ اگر وہ حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینے سے باز نہ آئے تو حکومت علی گڑھ کالج کو ملنے والے فنڈز روک دے گی۔ محسن الملک ادارے سے مستعفی ہو گئے مگر اردو کی حفاظت کرنے سے پیچھے نہ ہٹے۔ جب انتھونی یوپی سے رخصت ہوا، تو محسن الملک نے ”انجمن ترقی اردو سوسائٹی“ قائم کر لی جس کا مقصد انگریزوں اور ہندوؤں کے پروپیگنڈا کا توڑ دریافت کرنا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ادب پھلا پھولا۔ ناول، افسانہ، سفرنامہ، شاعری غرض اردو کی ہر صنف میں خوب لکھا اور پڑھا گیا۔ اس کے باوجود سرکاری سطح پر فروغ اردو کی خاطر اقدام نہیں کیے گئے۔ اسی باعث خصوصاً شہروں میں بہت سے گھرانے اپنی قومی زبان بالائے طاق رکھتے ہوئے انگریزی کی آغوش میں جا پیچھے۔ آج کئی گھروں میں بچے انگریزی میں سلام دعا کرتے اور حال چال پوچھتے ہیں۔ والدین یہ دیکھ کر ہنسنے کے بجائے الٹا خوش ہوتے ہیں۔

آج ہم رشتے داروں کو یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بچے ”انٹرنیشنل میڈیم“ اسکول میں

مزاح

موبائل کا وبال

دو جدید کی ایک بظاہر مفید ایجاد جب
مصنّف کے لیے جان کا غدا بن گئی
محبوب عالم

کی طرح عیاں ہو
گئی۔ لیکن
مہجور نے
اس کا استعمال
صرف کال سننے
اور مس کال
کرنے تک
ہی محدود رکھا۔
یعنی کسی اور کی
کال آ جائے تو دل
کھول کر منفقہ
فرماتے۔ اگر خود مجبوری
کی وجہ سے کسی سے رابطہ
کرنا ہوتا تو مس کال کرتے
تاکہ جس شخص سے کام ہے وہ
خود فون کر کے ان کی حاجت
روائی فرمائے۔

جناب کا رویہ دیکھ کر ہمیں ایک واقعہ یاد آ جاتا۔
ایک صاحب کے گھر کو آگ لگ گئی لیکن وہ اسے بچا

کال پہنچے تو قریباً ہر طالب کے ہاتھ میں موبائل
پایا۔ ہمیں سمجھ نہیں آئی کہ تعلیم و تربیت اور موبائل
کا کیا تعلق ہے؟ بہر حال طالبان علم کمراء
جماعت میں موبائل سے دور ہی رہتے۔ جب یونیورسٹی
پہنچے تو حالات یکسر مختلف پائے۔ وہاں موبائل کے استعمال
پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ہر کوئی دیدہ دلیری اور دل جمعی سے
استعمال کرتا حتیٰ کہ کتاب کو کم موبائل کو زیادہ وقت دیا جاتا۔
بعض تجربے کار لوگوں کا تجزیہ تھا کہ یونیورسٹی ہاسٹل کا
ماحول تسلی بخش نہیں ہوتا اس لیے بزرگوں نے سوچ بچار
کے بعد ہی ہمیں وہیں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔
ہاسٹل میں خان صاحب اور حافظ صاحب ہمارے ساتھی
ہے۔ خان صاحب کے پاس تو خیر پہلے ہی موبائل تھا
لیکن حافظ صاحب کچھ کچھ ہمارے ہم خیال نکلے۔ وہ
موبائل کو تمام معاشرتی برائیوں کی جزا قرار
دیتے۔ مگر جلد ہی انھوں نے بھی ہینڈ
بدلا اور ایک عدد موبائل خرید لی۔

ہوا یوں کہ ان کے گھر
کوئی تفریب تھی جس میں وہ
اطلاع نہ ملنے پر شرکت
نہیں کر سکے۔ اس پر
انھیں بڑا قلق ہوا۔ یوں
ان پر موبائل کی
اہمیت و افاریت روز
روشن

لیکن خدا کی پناہ ان کے پاس سے بھی ایک موبائل برآمد ہوا۔ اگرچہ موبائل کا ہونا اب کوئی عیب کی بات نہ تھی، حافظ صاحب نے فتوے دے کر اسے جائز قرار دے ڈالا تھا۔ بلکہ ان کے نزدیک موبائل رکھنا اب ہر شخص پر فرض ہے۔ لیکن رائے صاحب اس کی ایک ذیلی برائی میں مبتلا تھے اور وہ تھی بیچ..... وہ صاحب کسی کہانی کا بیچ لوڈ کر داتے اور سارا دن باتیں کرتے گزار دیتے۔

پہلے ہم نے اس کا خاص نوٹس نہ لیا لیکن ایک رات تو حد ہو گئی۔ انھوں نے رات کا بیچ کر دالیا تھا۔ پھر جو مصیبت ہم پر گزری وہ نہ پوچھیے۔ رائے صاحب آٹھ بجتے ہی موبائل پر گفت و شنید کرنے لگے۔ کھانے کے دوران بھی مصروفِ نظم رہے۔ ہم کھانا کھا کر پڑھنے لگے۔ قریب رات گیارہ بجے تک پڑھتے رہے۔

رائے صاحب نے مہربانی فرمائی کہ اس دوران چھت پر چلے گئے۔ ہم نے مطالعہ ختم کیا اور رائے صاحب کو آواز دی کہ نیچے آجائیے۔ ہم نے تو یہ سوچ کر نیچے بلایا تھا کہ بات ختم ہو چکی اب سویا جائے۔ لیکن افسوس، وہ خود تو کیا آرام فرماتے انھوں نے ہمارا جینا بھی حرام کر دیا۔

موصول نے آتے ہی بڑے طمطراق سے بتی جلائی اور کچھ ہی دیر بعد پکھا بھی بند کر دیا۔ پکھے کی آواز ان کے رابطے میں خلل انداز ہو رہی تھی۔ پھر شان بے نیازی سے ہمارے اور خان صاحب کے درمیان لیٹے اور با آواز بلند قہقہوں کے ساتھ گفتگو فرمانے لگے۔ رات قریب ایک بجے شور اور گرمی کی وجہ سے حافظ صاحب تگملا کر اٹھ بیٹھے۔ جوش غضب میں پھرے شیر کی طرح اٹھے اور رائے صاحب کے خوب لتے لیے۔ پہلے تو جناب کی خدمت عالیہ میں کڑا کے

نہ سکے کیونکہ ساری رات غائر بریگیڈ والوں کو مس کال مارتے رہے۔ جب ہم نے یہ واقعہ حافظ صاحب کو سنایا تو وہ کھیانے ہو کر ہنس دیے۔

لیکن جب کبھی شوئی قسمت سے چند سیکنڈ کی کال کرنا پڑتی یا مس کال پکڑی جاتی تو یہ بات ان کی طبع نازک پر نہایت گراں گزرتی، وہ وقفے وقفے سے اس بات پر نوحہ خوانی کرتے۔ جب کبھی مخاطب سے نفس نفیس ملتا ہوتا تو اسے خصوصی طور پر یاد دلاتے کہ انھوں نے فلاں وقت کال کر کے ان پر احسان عظیم فرمایا اور جس پر اتنی خطر رقم خرچ ہوئی۔

جب پہلا سمیسر گزر گیا اور حافظ صاحب نے ہمیں موبائل سے پاک دیکھا تو کچھ دوستوں کے کہنے پر اور کچھ اپنی دانست میں موبائل کے حق میں دلیلیں دینا شروع کر دیں۔ ایک ہی ہفتے میں موبائل کی شان میں یکے بعد دیگرے تین چار تقاریر کر ڈالیں۔ پھر ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس زور آزمائی کا مقصد ہمیں موبائل خریدنے پر آمادہ کرنا تھا۔

لیکن جب ہم نے خان صاحب سے مشورہ کیا تو انھوں نے موبائل نہ رکھنے کی ہمدردانہ تاکید فرمائی..... اس لیے کہ ہماری یادداشت کچھ کمزور واقع ہوئی تھی۔ ان کا موقف تھا: ”چودھری صاحب! آپ ایک جگہ چیز رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ مبادا کہیں موبائل کھو گیا تو پھر؟“

دوسری طرف حافظ صاحب تھے کہ ان کی زبان موبائل کی اہمیت و افادیت بیان کرتے نہ تھکتی۔ ہم اسی شش و پنج میں مبتلا ہو گئے کہ موبائل لیں یا نہ لیں؟ اسی دوران ہمارے نئے ہم کمراسا تھی، رائے صاحب بھی آگئے۔ دیکھنے میں انتہائی شریف چہرے ہی سے ماشاء اللہ لام مسجد معلوم ہوتے

دار خطبہ ارشاد فرمایا پھر ان کے سر کو دعائیں دیتے ہوئے پٹکھا چلایا، جی بھائی اور لیٹ گئے۔

رائے صاحب نے صورت حال سے گھبرا کر منہ ہمارے کبل میں دے دیا۔ ہم سمجھے شاید سوتے گئے ہیں، لیکن وہ تو گفتگو کا تسلسل برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اب کیا خاک سونا تھا! ہمیں ان کی اس ادائے محبوبانہ پر بے ساختہ ہنسی آئی تو وہ سمجھے شاید ہم ان کی باپردہ باتیں سن رہے ہیں۔ انھوں نے بوکھلا کر منہ نکالا اور ساتھ سوئے خان صاحب کے کبل میں دے دیا۔

خان صاحب جو پہلے ہی اس ڈرامے کی وجہ سے جاگ رہے تھے، تنک آ کر ہائے کہتے پہلو بدلتے گئے۔ سو موصوف نے وہاں سے منہ نکال ہمارے کبل میں دے ڈالا۔ جب ہم سے خطرہ محسوس ہوتا تو پھر خان صاحب کے کبل میں منہ دے دیتے اس طرح ساری رات یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔

رات دو بجے سوہاگل بند کر کے بیت الخلا گئے تو ہم نے شکر ادا کیا کہ چلو بات ختم ہوئی اور اس مصیبت سے جان چھوٹی۔ لیکن وہ تو نازہ دم ہونے لگے تھے۔ آتے ہی دوبارہ کال شروع کر دی۔ اب ہماری امت جواب دے گی۔ خان صاحب کے صبر کا پیمانہ بھی لیمریز ہو چکا تھا۔ وہ بھی سر پر دوہال ہاندھے سلسل کر رہے تھے بدلتے تنک چکے تھے۔

ہم اٹھے اور رائے صاحب کی ڈائری کو ہاتھ لگا کر منتیں کرنے لگے کہ بس اب دم کیجیے۔ حضرت فرمانے لگے کہ بس تھوڑی دیر اور! لیکن کافی دیر گزرنے کے بعد بھی نارغ نہ ہوئے تو اب کے ہم نے ٹھانی، ہماری بات نہیں مانتے تو باہر سے ہی کچھ آدمی بلا کر انھیں شرم دلائی جائے۔ لیکن افسوس، رات کے اس پہر باہر بھی کوئی موجود نہ تھا۔ خیر رات سوانہیں

بجے بجک ختم ہوا تو ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو زیادہ نہیں، گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا تو سونا نصیب ہو گا۔

لیکن رائے صاحب تو دوبارہ نمبر ملانے لگے۔ ہم نے پوچھا ”رائے صاحب خیر تو ہے؟“ فرمایا ”چودھری صاحب اور اصل میں مخاطب کو خدا حافظ نہیں کہہ سکا“ اس لیے دوبارہ نمبر ملا رہا ہوں۔“ موصوف نے دوبارہ نمبر ملا کر پورے پینتالیس منٹ صرف خدا حافظ کہنے میں صرف کیے۔ چار بجے سوہاگل بند کر کے تھوڑی ناراضی اور گرم ستیری کے ملے جلے تاثرات سے فرمانے لگے ”لو جی، اب آپ جی بھر کر سولیں۔ چند لمحے کال کیا کر لی، آپ نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔“

ہم سب پہلے ہی غم و غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔ جناب کے ارشادات نے چلتی پر تیل کا کام کیا۔ حافظ صاحب جو رائے صاحب کی حرکات سے جل کر خاکستر ہونے کے قریب تھے اچانک چمک کر اٹھے اور کمرے میں موجود کبھی انرو کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے خاصا تیز و تیز جواب دیا ”حضور! ہم آپ کے احسانا عظیم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ آپ دل کھول کر گفتگو فرمائیے، ہمارے نصیب میں ہوا تو پھر کبھی غیہ لے لیں گے۔“ جب خان صاحب نے معاملہ بڑھتے دیکھا تو مداخلت کر کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اب آپ اندازہ لگا لیجیے کہ سونے کی خاطر ہمارے پاس کتنا وقت بچا ہو گا؟ کچھ دیر بعد سورج نکلنے کے لیے سر ابھار رہا تھا۔ سو ہم حافظ صاحب کی معیت میں نماز فجر ادا کرنے مسجد کی طرف چل پڑے۔ بعد میں یونیورسٹی جانے کی تیاری کرنا تھی۔

اب آپ ہی انصاف فرمائیے اگر سوہاگل نہ ہوتا تو کیا ہمیں یہ دن دیکھنا پڑتا؟ آپ فرمائیں گے ہرگز نہیں! تو پھر بتائیے ہم سوہاگل کو وہاں نہ کیوں تو کیا کہیں؟ ♦♦♦

مضمون نگار کی تصدیق

پیش کشی

چناروں کی قطار

پڑھیے اور جانیے سیتھہ زیو برڈ کے اپنے بچوں کے ساتھ تعلقات کیسے تھے؟
اس نے دو بیویوں کی طلاق کے مقدموں میں کیا کچھ لکھوایا؟
کیا لیٹی لینگ کا سیتھہ سے ملازمت کے علاوہ کوئی اور تعلق بھی تھا؟

اگست 193 اگست 2014

گزشتہ افسانہ کی تکمیل

اکہتر سال سیٹھ بیوہ نے چنار کے ایک درخت سے لٹک کر گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیاہی مائل سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ کھنکھلاہٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چہرچہ بھی جانتا تھا۔ اس کی وہ سابق بیویاں تھیں جنہوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ سیٹھ کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے اور باپ سے بہت کم ملتے تھے۔ سیٹھ بیوہ ایک فارم پاؤس اور اس کے ارد گرد درختوں سے بڑے قطعہ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیٹھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اسے غلاں جگہ لے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیٹھ کی گاڑی کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آکر سیٹھ کی تصویریں لیں اور لاش درخت سے اتار کر ایسولینس میں رکھی۔ فورڈ کاؤنٹی کا شرف اوزی والز بھی وہاں پہنچا۔ وہ سیٹھ بیوہ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اسے باورچی خانے کے میز پر سیٹھ کے ہاتھ کاٹکھا ہوا دکھایا۔ اس نے لگتا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے اور اپنی قبیلہ و تعلقین کے ہارے میں سمجھ دیا جائے۔

فورڈ کاؤنٹی میں جیک بری گینس ایک مشہور اور نیک نام وکیل تھا۔ کارل کیسی کا مشہور مقدمہ جیتنے کے باعث وہ شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد مقدمے کے مخالف رو بہشت گردوں نے اس کے مکان کو جلا دیا۔ اب دو کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کی انشورنس کا معاملہ ابھی بقیہ طلب تھا۔ چار رو بہشت گرد اب قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کچھ کہیں اور منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے جیک ہمیشہ ہسپتال ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھتا اور تیار ہو کر دفتر چلا جاتا۔ اس کی بیوی کارل اسکول پچھرتھی۔ وہ بعد میں تیار ہو کر اپنی بیٹی حنا کو ساتھ لے کر اسکول چلی جاتی تھی۔ جب جیک گھر سے باہر نکلتا تو اس نے پولیس افسر لوئی تک کو ہیلو کہا جسے اوزی والز نے بری گینس فیملی کی حفاظت کے لیے وہاں متعین کر رکھا تھا۔ وہ جلد اپنی پرانی امریکی گاڑی میں اپنے دفتر کے قریب کلینٹن چوک میں کافی شاپ پر پہنچ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے دوستوں سے سیٹھ بیوہ کی خودکشی پر گفتگو کی۔ اس نے سیٹھ کی جائداد اور نمائندہ وصیت میں دشمنی ہی کیونکہ اس کا مطلب کسی وکیل کے لیے اچھی خاصی فیس ہوتا ہے۔ جیک حسب معمول کلینٹن چوک میں روزانہ کی چھل قدمی کے بعد اپنے شاندار دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کی سیکرٹری راکسی ٹچل منزل پر استقبالیہ کمرے میں پہنچتی اور دو خود بالائی منزل پر بیٹھتا تھا۔ اس روز کی راک میں جیک کو اپنے نام ایک لفافہ ملا جس پر لکھنے والے کا نام سیٹھ بیوہ برادر تھا۔ اس نے لفافہ احتیاط سے کھولا۔ اس میں سیٹھ بیوہ کا ایک خط برآمد ہوا جس میں اس نے اپنی خودکشی کی اطلاع دی تھی اور اپنی وصیت کے معاملے میں اس کو اپنا وکیل نامزد کیا تھا۔ خط کے ساتھ سیٹھ کی لکھی وصیت بھی تھی جس میں اس نے اپنے دونوں بچوں اور دونوں سابق بیویوں کو جائداد سے یکسر محروم کر دیا تھا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ اپنی ملازمہ اور دوست لیٹی لینگ کے نام کر دیا تھا جس نے پیادری کے زمانے میں اس کی خدمت کی تھی۔ جیک نے خط اور وصیت کی ایک نقل راکسی کو دی، دو نقل اپنے ایک میں رکھیں اور ایک نقل بینک کے لا کر میں رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹی شرف اوزی والز کو ملنے اس کے دفتر گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر سیٹھ بیوہ کی خودکشی اس کی وصیت اور سیاہ فام لیٹی لینگ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

اوزی نے بتایا کہ وہ لیٹی لینگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی آبادی مل ڈیٹا میں رہتی ہے۔ اس کی شادی سائمن لینگ

سے ہوئی ہے جو کھنڈ اور آوارہ ہے اور شراب نوشی کرتا ہے۔ ان کے چار یا پانچ بچے ہیں۔ ایک لڑکا قید خانے میں ہے۔ ایک لڑکی فوج میں ہے۔ لیٹی بینک لیس سال کی ہے۔ اس کا تعلق میمر فیملی سے ہے۔ بینک نے پوچھا کہ کیا آپ سیٹھ ہیو برڈ کو جانتے ہیں۔ اوزی نے کہا کہ اس نے مجھے استقبالات میں کامیابی کے لیے دو دفعہ کبکس کبکس ہزار ڈالر دیے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ کچھ زمین کا مالک تھا اور ملاری لکڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن ایک ناخوشگوار طلاق میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ سیٹھ کی جھینڑ بھینس کل سہ پہر چار بجے چرچا سے ملتی قبرستان میں ہوگی۔ اس نے فون کر دیا تھا اور اس کے دونوں بچے ہرشل اور ریوٹا جلد پہنچ جائیں گے۔

ہرشل ہیو برڈ ایک گھٹنے میں ٹمٹمس سے غور کا ڈونٹی سیٹھ کے گھر پہنچ گیا۔ پھر اس کی بہن ریوٹا اور اس کا شوہر آیان ڈیو بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے رسمی تعزیت کی۔ صرف ریوٹا کافی دیر روتی رہی۔ ہرشل نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی جذبات محسوس نہ کیے۔ وہاں ان کی ملاقات سیاہ فام گھریلو ملازمہ لیٹی بینک سے ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ سیٹھ اس کو پانچ ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے معاوضہ ادا کرتا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔ سیٹھ کے ہمسائے اور چرچ کے دوست خوردلوش کی اشیاء کے ساتھ تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔ لیٹی ان سے ٹیک اور تعزیت وصول کر رہی تھی کیونکہ سیٹھ کے بچوں نے کسی سے ملاقات کر کے ان سے انکار کر دیا تھا۔ جلد ہی انھوں نے سیٹھ کی وصیت اور بینک اکاؤنٹس کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ دو پولیس افسر آئے اور انھوں نے سیٹھ کی کار واپس کر دی۔ انھوں نے سیٹھ کا وہ خط بھی واپس کیا جو ان کو ڈانٹنگ لیٹل سے ملا تھا اور جس میں سیٹھ نے اپنی جھینڑ بھینس کی ہدایات دی تھیں۔

ہیری ریکس طلاق کے مقدمات کا ماہر مشہور وکیل تھا۔ وہ طلاق کے مقدمے میں سیٹھ کی دوسری بیوی سائیکل کا وکیل تھا۔ اس نے بینک کو بتایا کہ اس مقدمے میں اس نے سیٹھ کا سارا روپیہ لے لیا تھا۔ کافی رقم خوردلوش اور باقی موکلہ کو دے دی۔ بینک نے اس سے سیٹھ کی موجودہ جائیداد اور مالی حیثیت کے بارے میں استفسار کیا۔ سیٹھ کے وارث گھر کے عقبی حصے میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ لیٹی نے ان کو لٹچ پیش کیا۔ لیٹی نے سنا وہ کہہ رہے تھے جھینڑ بھینس کے اگلے دن وہ لیٹی کو ملازمت سے فارغ کر دیں گے اور گھر کو تالا لگا دیں گے۔ اب آگے پڑھیے

پوچھا تھا کہ کیا سیٹھ ہیو برڈ کی فیملی اس کا شیورٹ پک اپ ٹرک فروخت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ لیٹی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اس نے یہ سوال ان تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا، مگر پورا نہ کیا۔ اس نے گھر جاتے ہوئے تنہائی سے ٹیک کسی گڑھے میں پھینکنے پر غور کیا لیکن خود کو اسے ضائع کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ اس کی والدہ ذیابیطس سے جنگ لڑ رہی تھی اور اسے مزید چینی

ایک ٹیک کے ساتھ گھر پہنچی جو ریوٹا نے ازراہ کرم اسے دیا تھا۔ یہ وانیلی فلیور (Vanilla Flavour) اور اتھاس کی فاشن سے لدا ایک والا سادہ سا ٹیک تھا اور مسٹر ہیو برڈ کے ہاورچی خانے کے کاؤنٹر پر دھرے نصف درجن ٹیکوں میں سب سے کم متاثر کن تھا۔ یہ چرچ سے آنے والے ایک ایسے شخص نے دیا تھا جس نے لیٹی سے

شروع ہو گئے اور لگاتار بھاگ دوڑ۔ مجموعی طور پر بڑا دلچسپ دن تھا۔

واقعات بیان کرتے ہوئے لیڈر محتاط تھی کہ آنے والی پریشانی کا اشارہ منہ سے نہ نکل جائے۔ سائپرس کا بلڈ پریشر گھٹس ادویہ کے بل بوتے پر کنٹرول میں رکھا گیا تھا اور یہ پریشانی کے ذرا سے تذکرے پر بلندی کی طرف دوڑ لگا سکتا تھا۔ جلدی کسی مناسب لمحے میں لیٹی یہ خبر سنا دے گی کہ اس کی ملازمت ختم ہو رہی ہے لیکن ابھی نہیں۔ بعد میں جب بہتر وقت ملے گا۔

”اور تجیز و تھنکس؟“ سائپرس نے اپنی بیٹی کا بازو چھوتے ہوئے پوچھا۔ لیٹی نے تفصیلات بتائیں۔ اس نے بتایا کہ وہ اس ٹیما شرکت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس حقیقت سے لطف اندوز ہوئی کہ مسٹر بیو بڑ نے اصرار کیا تھا کہ سیاہ فام افراد کو چرچ میں داخلے کی اجازت دی جائے۔

”ٹائما تھنکس پچھلی قطار میں بٹھائیں گے۔“ سائپرس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

”ٹائما ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں وہاں جاؤں گی۔“

”کاش میں تمہارے ساتھ جاسکتی۔“

”میں بھی چاہتی ہوں۔“ اپنے موناپے اور نقل و حرکت میں مشکل کے باعث سائپرس شاذ و نادر ہی گھر سے نکلتی تھی۔ وہ وہاں پانچ سال سے مقیم تھی اور ہر ماہ

اس کے وزن میں اضافہ اور حرکت میں کمی ہوتی جا رہی تھی۔ سائمن مختلف وجوہات کی بنا پر گھر سے باہر ہی رہتا تھا جن میں لیٹی کی والدہ کی موجودگی ایک اہم وجہ تھی۔

لیٹی نے کہا ”مسز ڈیفو نے ہمارے لیے ایک ایک بھیجا ہے۔ کیا آپ اس کا چھوٹا سا ٹکڑا لیں گی؟“

کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ اگر وہ حقیقت میں اس کو تھکے پیش کرنا چاہتی۔

لیٹی نے کچی جگہ پر گاڑی کھڑی کر دی اور دیکھا کہ سائمن کا پرانا ٹرک وہاں نہیں تھا۔ اسے اس کے آنے کی توقع بھی نہ تھی کیونکہ وہ کئی روز سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ اس کا دور رہنا ہی پسند کرتی تھی لیکن وہ آنے والے کل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اچھے بچوں میں بھی یہ ایک خوش و خرم گھر نہیں تھا اور اس کا شوہر اس کو بہتر بنانے کی شاذ ہی کوشش کرتا تھا۔

بچے ابھی اسکول بس میں گھر کی طرف رواں دواں تھے۔ لیٹی ہاورچی خانے کے راستے گھر میں داخل ہوئی۔ ایک میز پر رکھا اور ہمیشہ کی طرح اس نے سائپرس کو نشست گاہ میں سسل ٹی وی دیکھتے ہوئے پایا۔

سائپرس مسکرائی اور اس نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا ”میری بچی تمہارا دن کیسا گزرا؟“

لیٹی نیچے جھکی اور اس نے شائستہ انداز میں معافہ کیا ”کافی مصروف۔ آپ کا کیسا رہا؟“

”بس میں اور ٹی وی شو۔“ سائپرس نے جواب دیا۔ ”لیٹی بیو بڑ فیمل اپنے نقصان کو کیسے برداشت کر رہی ہے؟ میرے پاس بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ باتیں کرو۔“

لیٹی نے ٹی وی بند کر دیا اور اپنی والدہ کی پیہوں والی کرسی کے پاس اسٹول پر بیٹھ گئی اور دن بھر کی سرگرمیوں کے بارے میں بتانا شروع کیا۔ کوئی ذوریت نہیں ہوئی کیونکہ ہر شل اور ڈیفو فیملی آئے اپنے بچپن کے گھر میں گھومے جبکہ ان کے ابو فوت ہو چکے تھے۔

پھر ہمسایوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور کھانے آنے

”کس قسم کا؟“ اگرچہ اس کا وزن بہت زیادہ تھا پھر بھی سائپرس کھانے پینے میں نفاست پسند تھی۔
”جی یہ انناس والا ایک ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ میں نے پہلے اسے دیکھا ہے۔ لیکن اس کو چکھا جاسکتا ہے۔ کیا اس کے ساتھ کچھ کافی پسند کریں گی؟“
”ہاں اور بس مچھوٹا سا کٹڑا۔“

”امی آؤ ہم باہر بیٹھیں اور تھوڑی سی تازہ ہوا لیں۔“

”میں اسے پسند کروں گی۔“ لیٹی اس کی پہیوں والی کرسی آرام سے دھکیلتے ہوئے باورچی خانے کے دروازے سے باہر لکڑی کے کھلے فرش پر لے گئی جو سائمن نے کئی سال پہلے بنایا تھا۔ جب موسم خوشگوار ہوتا لیٹی پر ہجوم گھر کے شور اور جس زدہ ماحول سے دور سہ پہر کی کافی یا ٹھنڈی چائے وہاں پینا پسند کرتی تھی۔ تین چھوٹی خواب گاہوں والے اس چھوٹے گھر میں بہت زیادہ افراد رہتے تھے۔ ایک خواب گاہ سائپرس کے پاس تھی۔ لیٹی اور سائمن جب وہ گھر ہوتا ایک دو نواسے نواسیوں کے ساتھ دوسری خواب گاہ استعمال کرتے تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں تیسری خواب گاہ میں گزارا کرتی تھیں۔ سولہ سالہ کلیرس ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھی اور اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ اکیس سالہ فیڈرا کے دو بچے تھے اور شوہر نہیں تھا۔ ان کا سب سے چھوٹا چودہ سالہ بیٹا کرک نشست گاہ میں صوفے پر سوتا تھا۔ چند ماہ کیلئے بھتیجیوں اور بھتیجیوں کا قیام بھی عام تھا۔ جب ان کے والدین اپنے معاملات کو سلجھا رہے ہوتے تھے۔

سائپرس نے کافی کا ٹھونٹ لیا اور کانٹے سے کیلک کا کٹڑا اٹھایا۔ اس نے آہستہ سے اسے منہ میں ڈالا چپایا اور تیوری چڑھائی۔ لیٹی کو بھی یہ پسند نہیں آیا اس لیے

انھوں نے کافی پی اور ہیو برڈ فیملی کے بارے میں بات چیت کی کہ وہ کتنے پرانندہ خیال لوگ تھے۔ انھوں نے سفید فام لوگوں اور ان کی تجہیز و تکفین کا مذاق اڑایا کہ کس طرح وہ اپنے مردوں کو بگلت میں اکثر دو تین دن کے اندر ہی دفن کر دیتے تھے۔ سیاہ فام لوگ اس میں مناسب وقت لیتے تھے۔

”پیاری تم کھوئی کھوئی سی لگتی ہو کیا سوچ رہی ہو؟“ سائپرس نے نرمی سے پوچھا۔

بچے جلد ہی اسکول سے گھر پہنچ جائیں گے اور پھر فیڈرا کام سے واپس آ جائے گی۔ رات کو سونے سے پہلے یہی سکون کا لمحہ ہوگا۔ لیٹی نے گہرا سانس لیا اور کہا ”مکی میں نے ان کو ہاتھیں کرتے ہوئے سنا کہ وہ مجھے کام سے فارغ کر رہے ہیں۔ شاید اسی ہفتے“ کفن دفن کے فوراً بعد۔

سائپرس نے اپنا بڑا سا گول سرالکار میں بلایا۔ چہرے سے لگتا تھا وہ رونے کے لیے تیار ہے۔ ”لیکن کیوں؟“

”میرا خیال ہے ان کو گھر کی دیکھ بھال کے لیے خادمہ کی ضرورت نہیں۔ وہ گھر فروخت کر دیں گے کیونکہ کوئی بھی اس کو رکھنا نہیں چاہتا۔“
”اوہ میرے خدا“

وہ اس کی دولت کو ہاتھ میں آنے تک انتظار نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس اس کو ملنے کے لیے آنے کا وقت نہیں تھا لیکن اب وہ شکاری پرندوں کی طرح پر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔

”سفید فام ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔“
”وہ سمجھتے ہیں کہ سیتھ مجھے بہت زیادہ معاوضہ ادا کر رہا تھا اس لیے وہ مجھے جلدی سے فارغ کرنا چاہتے

تھی جب اوزی کی مقابلہ عام سی کار سنگل کی سہ پہر چار بجنے سے پانچ منٹ پہلے اندر داخل ہوئی۔ کار پر کوئی بڑے الفاظ یا اعداد لکھے ہوئے نہیں تھے۔ اوزی چنچلی سطح پر رہنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن اس کو ایک نظر دیکھنے سے پتا چل جاتا تھا کہ وہ سینئر شریف یعنی پولیس کا افسر اعلیٰ ہے۔ اس نے اپنی بڑی فورڈ گاڑی صاب (Saab) کے ساتھ کھڑی کر دی جو دوسری گاڑیوں سے الگ کھڑی تھی۔ اوزی اور جیک ایک ساتھ اپنی گاڑیوں سے باہر نکلے اور اگستے پارکنگ سے باہر آ گئے۔

”تمہارے پاس کوئی خبر ہے؟“
”نہیں۔ میرا خیال ہے کل خبریں اڑیں گی۔“
اوزی نے ہنستے ہوئے کہا ”میں انتظار نہیں کر سکتا۔“

چرچ آغاز میں ایک سرخ اینٹوں سے بنا عبادت خانہ تھا جس کے سامنے کے ڈبل دروازوں کے اوپر چوڑا سا مخروطی منارہ تھا۔ وقت کے ساتھ اس میں اضافے کیے گئے۔ ایک دھاتی عمارت عبادت خانے کے ساتھ اور ایک عقب میں جہاں نوجوان باسکٹ بال کھیلتے تھے۔ چھوٹے سے قریبی نیلے پر سائبہ دار درختوں میں گھرا قبرستان ہے جو دفن ہونے کے لیے خوبصورت اور پرسکون جگہ ہے۔

چند دیہاتی تباہ کولوش آخری وقت پر کش لگا رہے تھے جو بادل غواستہ پرانے سوٹ پہن کر آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً شریف سے بات چیت کی۔ انھوں نے جیک کو دیکھ کر شائستگی سے سر ہلا کر سلام کیا۔ اندر بلوط کی نشستوں پر براجمان معقول ہجوم موجود تھا۔ روشنیاں مہم تھیں۔ آرگن بجانے والا مہم ماتمی دھن سے ہجوم کو اس غمناک موقع کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اس

ہیں۔“

”وہ تمہیں کتنی رقم ادا کرتا تھا؟“

”مھی اس بات کو چھوڑیے۔“ لیٹی نے اپنے کہنے میں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ مسٹر ہیورڈ اس کو پانچ ڈالر فی گھنٹہ ادا کر رہے تھے اور وہ بھی نقد۔ اتنا معاوضہ مسس جی کے دیہات میں گھریلو کام کے لیے واقعی زیادہ تھا اور لیٹی کوئی پریشانی مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا کہنا اس سے کچھ زیادہ رقم کا تقاضا کر سکتا تھا۔ اس کی سہیلیاں اس قسم کی گفتگو کر سکتی تھیں۔ ”لیٹی رازوں کی حفاظت کرو۔“ مسٹر ہیورڈ نے اس کو بتایا ”اپنی تنخواہ کے بارے میں کسی سے بات نہ کرو۔“ سائنس کو کام کرنے کی تحریک ختم ہو جائے گی۔

لیٹی نے کہا ”میں نے سنا وہ میرا حوالہ ایک ملازمہ کے طور پر دے رہے تھے۔“

”ایک ملازمہ؟ میں نے عرصے سے یہ لفظ نہیں سنا۔“

”مھی وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ مجھے شک ہے کہ مسٹر ہیورڈ ایک اچھے باپ تھے لیکن ان کے بچوں کو اس پر افسوس ہے۔“
”اور اب اس کی ساری دولت الٹا کولن جائے گی۔“

”میرا یہی خیال ہے۔ وہ اسی پر ٹکھیر کر رہے ہیں۔“

”اس کے پاس کتنی دولت ہے؟“

لیٹی نے انکار میں سر ہلایا اور ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ پیا۔ ”مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ کسی کو بھی اندازہ ہے۔“

آئرش روڈ کرچین چرچ کی پارکنگ آدمی بھر چکی

کا تابوت اٹھانے والے سنجیدہ چہروں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر پیانو کے قریب بائیں جانب بیٹھے تھے۔

جیک اور اوڑی کھلی قطار میں بیٹھ گئے اور ارد گرد دیکھنے لگے۔ نزدیک ہی پانچ سیاہ قاسموں کا ایک گروپ موجود تھا۔

اوڑی نے انھیں دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور سرگوشی کی "وہ سبز لباس میں لیٹی لیگ ہے۔" جیک نے اثبات میں سر ہلایا اور سرگوشی کی "دوسرے کون ہیں؟"

جیک نے لیٹی کو غور سے دیکھا اور تصور کیا کہ وہ کون مشترک مہمات میں شامل ہوں گے۔ ابھی اس نے اس عورت سے ملنا تھا۔ اس نے اس کا نام کل سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا لیکن اب ان کی گہری شناسائی ہونے والی تھی۔

لیٹی اپنے ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ اس صبح اس نے تین گھنٹے کام کیا تھا۔ پھر ہرشل نے اس کو بتایا کہ اگلے دن تین بجے سہ پہر اس کی ملازمت ختم ہو جائے گی۔ اس وقت عدالت کے احکامات تک اس کو منتقل کر دیا جائے گا۔ لیٹی کے پاس چار سو ڈالرا کاؤنٹ میں اور تین سو نقد تھے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور اچھا کام ملنے کے امکانات بھی کم تھے۔ اس کا شوہر کبھی کبھار گھر آتا تھا اور تھوڑی بہت رقم لاتا تھا۔ اکثر فٹے میں دھت ہوتا تھا اور سو کر نشہ دور کرتا تھا۔

جلد بیروزگار ہونے والی لیٹی آرگن کو سنتے ہوئے اپنے مستقبل کے بارے پریشانی کا شکار ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ نہیں تھی۔ مسٹر ہیو برڈ نے اس کو کئی مرتبہ بتایا تھا کہ وہ اپنی موت پر جودہ جانتا تھا یعنی ہے اس کے لیے

کچھ چھوڑ کر جائے گا۔ لیکن کیا کچھ؟ لیٹی صرف تصور ہی کر سکتی تھی۔ اس سے چار قطاریں پیچھے جیک نے سوچا کہ اگر وہ صرف جانتی ہوتی۔ اس کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ جیک وہاں موجود تھا اور کیوں موجود تھا۔ لیکن اس نے حقیقت میں مسٹر بریگنس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

تابوت کے بالکل سامنے والی قطار میں ریونا ڈیفو آیان اور ہرشل بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے دور کے رشتہ داروں کی قطار تھی۔ سیٹھ کے والدین عسروں پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اس کا واحد بھائی طویل عرصہ پہلے کہیں جا چکا تھا۔ فیملی کے عقب میں کئی درجن نذرہ افراد... سیٹھ کے دوست چرچ کے ساتھی اور اس کے ملازمین تھے۔ جب پادری ڈان میک ایلون ٹھیک چار بجے منبر پر نمودار ہوئے تو وہ اور دوسرے سب افراد جانتے تھے کہ یہ رسم بہت مختصر ہو گی۔ اس نے جلدی سے دعا کردہائی اور متونی کی زندگی کے بارے میں مختصر اُبتایا۔

جیک نے چند قطاریں آگے ایک شناسا شخصیت کو دیکھا اور اس کے ہائیں طرف عمدہ سوٹ میں لمبوس ایک آدمی۔ ایک عیسائی عمر اور ایک جیسا یعنی قانون کا پیشہ۔ شل میں رش اتارنی ایٹ لا۔ شاہی مسس ہسی میں سب سے بڑی فرم جس کے مرکزی دفاتر ٹوئیٹلو میں تھے۔ سیٹھ ہیو برڈ نے جیک کے نام اپنے خط میں رش فرم کا ذکر کیا تھا اور اپنی ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت میں بھی۔ اس لیے کوئی شک نہیں تھا کہ شل میں رش اور دوسرے دو خوش پوش حضرات اپنی سرمایہ کاری کی جانچ پڑتال کے لیے آئے تھے۔ عموماً انشورنس والے دو دو کے جوڑوں میں کام کرتے تھے۔ بڑی قانونی فرمیں

وانست زیادہ وقت صرف کرتی تھیں کیونکہ اس کا مطلب ہوتا تھا زیادہ فیس۔

لیٹی نے اپنے آنسو صاف کیے اور محسوس کیا کہ غالباً وہ اکیلی ہی رو رہی تھی۔ مسز نور امینز نے حمد کے تین بند پڑھے جنہیں سن کر کسی بھی جنازے کے شرکا کی آنکھیں نم ناک ہو جاتی تھیں لیکن سیتھ کے جنازے پر وہ جذبات ابھارنے میں ناکام رہے۔ پادری میک ایلون نے ایک حمد پڑھی اور سلیمان علیہ السلام کی دانائی کو بیان کیا۔ آخر کار رمونا سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ رونے لگی۔ آیان نے اسے دلاسا دیا۔ ہر شل سارا وقت آنکھیں جھپکے بغیر فرش کو گھورتا رہا۔ ایک اور عورت نے جواب میں زور زور سے سسکیاں لیں۔

سیتھ کا ظالمانہ منصوبہ یہ تھا کہ اس کی آخری وصیت کو تجبیز و تکفین کے بعد ظاہر کیا جائے۔ جیک کے نام خط میں اس کے الفاظ تھے ”میری آخری وصیت کو میری تجبیز و تکفین کے بعد ظاہر کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے خاندان کے افراد تمام مانتی رسومات میں شامل ہوں اس سے پہلے کہ ان کو پتا چلے کہ ان کو کچھ نہیں ملے گا۔ ان کو مصنوعی طور پر غم کا اظہار کرتے ہوئے دیکھو..... وہ اسی کام میں بڑے ماہر ہیں۔ انھیں مجھ سے کوئی محبت نہیں۔“ جب دعائیہ تقریب کی کارروائی آگے بڑھی تو یہ ظاہر ہو گیا کہ کوئی بھی نقلی طور پر غم کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اس کے خاندان کے افراد نے دکھاوے کے طور پر بھی غمزہ نظر آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ رخصت ہونے کا کتنا المناک انداز ہے جیک نے سوچا۔

سیتھ کی ہدایات کے مطابق کسی نے اس کی

تعزین نہیں کیں۔ صرف پادری نے تقریر کی۔ اور اس کو ایک لمبی دعا پڑھتم کیا۔ پچیس منٹ بعد اس نے تقریب کا اختتام کر دیا اور سب کو دعوت دی کہ وہ تدفین کے لیے قریبی قبرستان تک چلیں۔ باہر نکل کر جیک شل میں رش اور اس کے دکا کی نظروں سے بچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے کسی سے رسل ایمرگ کا پوچھا۔ رسل ایمرگ قریب ہی سگریٹ سلگا رہا تھا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کر دیا۔ جیک نے کہا ”کیا میں تھوڑی دیر آپ سے تنہائی میں بات کر سکتا ہوں؟“

مسز ایمرگ نے کندھے اچکاتے ہوئے نرمی سے کہا ”یقیناً“ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ جیک نے کہا ”میں کلینٹن میں وکیل ہوں۔ مسز ہیو برڈ سے کبھی نہیں ملا لیکن کل مجھے اس کی طرف سے ایک خط اور آخری وصیت ملی جس میں اس نے آپ کو وصیت پر عمل کنندہ نامزد کیا ہے۔ بہت ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد بات چیت کریں۔“

ایمرگ رک گیا اور سگریٹ کو منہ کے ایک کونے میں دبایا۔ اس نے جیک کو غور سے دیکھا اور ارد گرد نظر دوڑائی کہ کوئی قریب تو نہیں۔ ”کس قسم کی وصیت؟“ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”گزشتہ ہفتے ہاتھ کی لکھی ہوئی۔ وہ واضح طور پر اپنی موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”پھر وہ غالباً مخلوط الحواس ہو گا۔“ ایمرگ نے طنزاً متوقع قانونی جنگ میں پہلا تیر چلایا۔

جیک کو اس کی توقع نہ تھی۔ ”ہم اس کو دیکھ لیں گے۔ میرا خیال ہے اس کا فیصلہ بعد میں ہو گا۔“

”مسز بریکنس“ کافی عرصہ پہلے میں بھی وکیل تھا

دیا تدارانہ اچھا کام ملنے سے پہلے۔ میں اس کھیل کو جانتا ہوں۔“

جیک نے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری اور ارد گرد دیکھا۔ عزاداران قبرستان کے دروازے کے قریب پہنچ رہے تھے۔ ”کیا ہم گنگو کر سکتے ہیں؟“

”وصیت میں کیا لکھا ہے؟“

”میں اس وقت تمہیں نہیں بتا سکتا لیکن کل بتا سکوں گا۔“

ایمرگ نے سر کو پیچھے کی طرف موڑا اور اپنی ناک کی سیدھ میں غور سے دیکھا۔

”تم سیتھ کے کاروبار کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”سمجھ لو کچھ نہیں جانتا۔ اپنی وصیت میں وہ لکھتا ہے کہ تم اس کے اثاثہ جات اور ذمہ داریوں کے بارے میں کافی علم رکھتے ہو۔“

”اس کی کوئی ذمہ داریاں نہیں میسٹر بریکنگس۔ صرف اثاثہ جات اور وہ بھی کافی۔“

”آئیے ہم ملاقات کریں اور گپ شپ کریں۔ تمام راز طشت ازہام ہونے والے ہیں میسٹر ایمرگ۔“

میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ کہاں تک جا رہا ہے۔ وصیت کے مطابق آپ قبیل گنگو ہیں اور میں وکیل ہوں۔“

”یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ سیتھ کلکتہ کے وکیلوں سے نفرت کرتا تھا۔“

”ہاں۔ اس نے یہ بات واضح کر دی تھی۔ اگر ہم صبح کو مل سکتے ہیں تو میں آپ کو اس کی وصیت کی ایک نقل بھی دکھاؤں گا اور اس پر کچھ روشنی بھی ڈالوں گا۔“

ایمرگ نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا اور جیک چند

قدم اس کے ساتھ چلا۔ جب وہ قبرستان پہنچے اوزی دروازے کے قریب انتظار کر رہا تھا۔ ایمرگ بھرک گیا اور کہنے لگا ”میں ٹھیل میں رہتا ہوں۔ قصبے کے مغرب میں ہائی وے۔ ۵۲ پر ایک کینے ہے۔ مجھے صبح ساڑھے سات بجے وہاں ملو۔“

”ٹھیک ہے۔ کینے کا نام کیا ہے؟“

”دی کینے۔“

”سمجھ گیا۔“

ایمرگ مزید ایک لفظ کہے بغیر غائب ہو گیا۔ جیک نے اوزی کی طرف دیکھا، ٹک سے اپنے سر کوٹلی میں ہلایا اور پھر پارکنگ کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ قبرستان سے دور ہی رہے۔ انھوں نے ایک دن کے لیے سیتھ ہیوورڈ کے بارے میں کافی کچھ دیکھ من لیا تھا۔ ان کی الوداعی ملاقات مکمل ہو چکی تھی۔

میں منٹ بعد لھیک چارنچ کر پچپن منٹ پر جیک چائرسری کورٹ کلرک کے کمرے میں تیز تیز قدم اٹھا کر داخل ہوا اور سارہ کی طرف دیکھ کر سسکرایا۔

”آپ کہاں رہے؟“ اس نے انتظار کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی پانچ نہیں بجے۔“ اس نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں لیکن منگل کے دن ہم چار بجے کام کرنا بند کر دیتے ہیں بدھ جمعرات کو تین بجے۔ بعد کے دن آپ خوش قسمت ہیں اگر ہم نظر آ جائیں۔“

عورت لگا تار بول رہی تھی اور اس کی زبان بڑی تیز تھی۔ میں سال تک روزانہ اگلا سے لین دین کرنے سے یہ ٹک جوابات اس کی لوک زبان پر تھے۔ جیک نے کاغذات اس کے سامنے کاؤنٹر پر

رکھے اور کہا "مجھے مسٹر سیٹھ ہیو برڈ کی زمینی جائداد کا جائزہ لینا ہے۔"

"وصیت دہلی یا بغیر وصیت والی؟"

"اوہ! اس کی ایک سے زیادہ وصیتیں ہیں۔ اسی لیے یہ دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔"

"کیا اس نے صرف اپنی جان نہیں لی؟"

"تم بہت اچھی طرح جانتی ہو کہ اس نے صرف اپنی جان لی کیونکہ تم اس عدالت میں کام کرتی ہو جہاں انوکھ ہیں انڑتی ہیں اور گھٹیں ہانگی جاتی ہیں اور کوئی چیز بھی راز نہیں۔"

"مجھے غصہ آ رہا ہے۔" اس نے درخواست پر مہر لگاتے ہوئے کہا۔ اس نے چند منٹے پلٹے مسکرائی اور کہا "اوہ! عمدہ ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت۔ وکیلوں کے لیے نعمت۔"

"تم سمجھ گئی ہو۔"

"ساری دولت کس کو ملے گی؟"

"میرے ہونٹ سلے ہوئے ہیں۔" جیک نے کچھ مزید کاغذات اپنے بریف کس سے نکالے۔ "ٹھیک ہے مسٹر بریکنس۔ آپ کے ہونٹ سلے ہوئے ہو سکتے ہیں لیکن یہ عدالتی فائل یقیناً نہیں۔ اب یہ سرکاری ریکارڈ بن چکی ہے سوائے اس کے کہ آپ تحریری درخواست دیں کہ اس فائل پر مہر لگا دی جائے۔"

"میں ایسا نہیں کرتا۔"

"ٹھیک ہے۔ اس لیے ہم تمام گھنیا حرکتوں کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس میں کچھ گھنیا حرکتیں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں ابھی تک تحقیق کر رہا ہوں۔ دیکھو سارا مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"یہ عدالت تک پہنچنے کی دوڑ ہے اور میں اسے جیت چکا ہوں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ شاید کل کسی وقت دو یا تین اکڑوں دکھانے والے سیاہ پوش دکھائیں یہاں آئیں اور مسٹر ہیو برڈ کی زمینی جائداد کی فائل دیکھنے کے لیے اپنی درخواست دیں۔ زیادہ امکان ہے کہ وہ نو بیلو سے آئیں گے۔ تم جانتی ہو ایک اور وصیت بھی ہے۔"

"میں یہ پسند کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ان کو عدالتی فائل دکھا دو پھر مجھے فون پر سازی رپورٹ دے دیں۔ لیکن پلیز کل تک اسے محفوظ کر لو۔"

"ایسا ہی ہو گا جیک۔ یہ معاملہ بہت دلچسپ ہو سکتا ہے۔"

"اگر میری توقع کے مطابق واقعات کی حقیقت کھلتی چلی تو یہ مقدمہ ہمیں اگلے سال تک مصروف اور محظوظ رکھے گا۔"

جونہی جیک رخصت ہوا سارا نے ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت پڑھی جو جیک کی درخواست کے ساتھ منسلک تھی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ فائل کو اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا تھا بھادی گئیں اور کلرک اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

سائنس لیگ شراب نوشی کرتا تھا لیکن وہ نشے میں دھت نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اہل خانہ ان دونوں میں فرق کو سمجھتے تھے۔ شراب نوشی کا مطلب تھا ایسا رویہ جو قابو میں رہے اور دھمکی آمیز نہ ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ چمکدار آنکھوں اور موٹی زبان کے ساتھ آہستہ آہستہ بستر پتہ پتا تھا۔ دھت ہونے کا مطلب تھا دوسروں کو پریشان کرنا گھر سے بھاگ جانا اور درختوں میں

تھپ تھپ جانا۔ سائمن کی خوبی یہ تھی کہ وہ اکثر مقتدل اور مہذب رویہ رکھتا تھا۔

تین ہفتے سڑک پر رہنے اور جنوب میں سکرپ لوہے کی نقل و حمل کرنے کے بعد وہ تنخواہ کے چیک کے ساتھ تھکا ہوا لیکن صاف آنکھوں کے ساتھ گھر واپس آیا تھا۔ اس نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ وہ کہاں تھا کیونکہ وہ کبھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے سٹیشن اور اطاعت شعار نظر آنے کی کوشش کی لیکن چند گھنٹے دوسرے لوگوں کے ساتھ قلمی ترشی سائبرس کی گفتگو اور اپنی بیوی کی توہین آمیز باتیں سن کر اس نے ایک سینڈویچ کھایا اور بیڑ کی بوتل کے ساتھ گھر سے باہر چلا گیا جہاں وہ قریبی درخت کے نیچے سکون کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھار وہاں سے گزرتی کاروں کو دیکھ سکتا تھا۔

اُس کے لیے گھر واپس آنا ہمیشہ مشکل ہوتا تھا۔ سڑک پر ٹرک چلاتے وہ کسی جگہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے بارے میں گھٹنوں خواب دیکھتا تھا۔ ہمیشہ ایک بہتر سماں زندگی کسی پریشانی کے بغیر۔ ہزاروں مرتبہ اس کو ترغیب ہوتی کہ وہ ڈرائیونگ جاری رکھے۔ ایک منزل پر سامان اتارنے کے بعد دوسری منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ وہ ابھی بچہ تھا جب اُس کے باپ نے اپنی حاملہ بیوی اور چار بچوں کو چھوڑ دیا اور پھر اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ سائمن اور اس کا بڑا بھائی کئی دن تک پور بیچ میں بیٹھے ننناک آنکھوں کے ساتھ باپ کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ بڑا ہو گیا تو اس کو اپنے باپ سے نفرت ہو گئی۔ وہ ابھی تک نفرت کرتا تھا، لیکن اب وہ بھی گھر سے بھاگ جانے کی شدید

اور اپنے طور پر زندگی گزار سکتے تھے۔

سڑک پر وہ اکثر اپنے آپ سے پوچھتا کہ وہ گھر کی کشش کیوں محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ پرہجوم کرائے کے گھر میں رہنے سے نفرت کرتا تھا جہاں اس کی خوش دامن بین بلائے دو لوگ تھے اور ایک بیوی جو ہمیشہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی رہتی تھی موجود ہوں۔ پچھلے بیس سالوں میں لیٹی اسے سوولہ طلاق کی دھمکی دے چکی تھی اور اس کے لیے یہ معجزے سے کم نہیں تھا کہ وہ ابھی تک اٹھتے تھے۔ تم علیحدہ ہونا چاہتی ہو تو آؤ علیحدگی کر لیتے ہیں۔ وہ بیڑ کا گھونٹ لیتے ہوئے کہتا۔ لیکن وہ بھی یہ بات سو مرتبہ کہہ چکا تھا۔

تقریباً اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکلی اور قلمی بیڑے پر اس درخت کے پاس گئی جہاں وہ بیٹھا تھا۔

”تم کتنی دیر سے گھر آئے ہوئے ہو؟“ اس نے سڑک کو دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”میں ابھی ابھی گھر پہنچا ہوں اور تم چاہتی ہو میں چلا جاؤں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا سائمن۔ بس مجھے تجھس

تھا۔“ وہ جواب دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے ایک اور گھونٹ لیا۔ وہ شاید وار ہی اکیلے ہوتے تھے اور جب ہوتے تھے تو نہیں جانتے تھے کہ بات کیسے کریں۔ ایک کار پاس سے گزری اور وہ مبہوت ہو کر اس کو دیکھنے لگے۔ آخر کار لیٹی نے کہا ”میں غالباً کل اپنی ملازمت سے فارغ ہو جاؤں گی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مسٹر جیو برائے اپنے آپ کو مار ڈالا اور اس

چاہتے۔"

ایک کاروان کے قریب آ کر رکی اور اس میں سے

ایک نوجوان سفید فام آدمی باہر نکلا۔ اس نے سفید قمیص اور ڈھلی مائی پہن رکھی تھی۔

"ہم یہاں ہیں۔" سائمن نے پکار کر کہا۔ اس نے ان کو درخت کے نیچے نہیں دیکھا تھا۔ وہ محتاط انداز میں ان کی طرف بڑھا۔ "میں مسہاتہ لیش لینک کو تلاش کر رہا ہوں۔"

"میں یہاں ہوں۔" لیش نے کہا۔ "ہیلو میرا نام جیک بریگنس ہے۔ میں کلینٹن میں وکیل ہوں اور لیش لینک سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ آج جنازے میں شامل تھے؟" اس نے کہا۔

"جی ہاں میں تھا۔"

سائمن ہادیل خواستہ شدہ کھڑا ہوا۔ تینوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ سائمن نے اس کو بیڑ کی پیش کش کی۔ جیک نے انکار کیا کیونکہ وہ وہاں کام سے آیا تھا۔

سائمن نے بیڑ کی چسکی لیتے ہوئے کہا "بریگنس، کیا آپ نے کارل لی ہیلی کا مقدمہ لڑا تھا؟"

یہ مقدمہ سیاہ فاموں کے ساتھ بے تکلفی کا باعث بن جاتا تھا۔ "میں نے لڑا تھا۔" جیک نے انکساری سے کہا۔

"میرا یہی خیال تھا۔ اچھا کام۔ زبردست کام۔" "شکریہ۔ دیکھو میں یہاں کام سے آیا ہوں اور مجھے لیش سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔"

"کیا بات کرنی ہے؟" لیش نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

سائمن کے جذبات طے چلے تھے۔ اس نے کچھ احساس برتری محسوس کیا کیونکہ ایک دفعہ پھر وہی گھر کا سربراہ اور آمدنی کا بڑا ذریعہ ہو گا۔ وہ لیش کے اس انداز فخر سے نفرت کرتا تھا جب وہ سائمن سے زیادہ پیسے کما رہی تھی۔ جب وہ بیرونگار تھا تو وہ اس کے طعنوں پر ہاراض ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ صرف ایک گھریلو خادمہ تھی لیکن اس کے روپے سے تھدی اور سرکشی جھلکتی تھی کیونکہ ایک سفید فام آدمی اس پر اتنا بھروسہ کرتا تھا۔ لیکن ان کے کنبے کو پیسوں کی ضرورت تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی تنخواہ سے محرومی ناگزیر مشکلات پیدا کرے گی۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا "مجھے افسوس ہے۔" ان کی گفتگو میں طویل خاموشی کا وقفہ آ گیا۔ وہ گھر کے اندر سے آنے والی آوازوں اور شور کو سن سکتے تھے۔ "کیا ماروس کا کوئی خط ملا؟" اس نے پوچھا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کہا "نہیں" دو ہفتے گزر چکے ہیں اور کوئی خط نہیں ملا۔

"کیا تم نے اسے خط لکھا؟"

"تم جانتے ہو سائمن میں اس کو ہر ہفتے خط لکھتی ہوں۔ آخری مرتبہ تم نے کب خط لکھا تھا؟"

سائمن چڑ گیا لیکن اس نے اپنا لب و لہجہ اور اخلاقی برقرار رکھا۔ اس کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ہوش و حواس میں گھر آیا ہے اور وہ اس فضا کو بیوی سے لڑائی کر کے تباہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ۲۸ سالہ ماروس لینک کو قید خانے میں دو سال گزر چکے تھے اور کم از کم دس سال باقی تھے۔ سب منشیات کی تجارت، مہلک ہتھیار سے

"ہم وہاں پہنچ جائیں گے" مسٹر بریکمیں۔ اور
آپ کا یہاں آنے کا شکریہ۔"
شب بخیر۔"

جیک اور کارلا رات کے کھانے کے بعد نشست
گاہ میں بیٹھ گئے۔ گھر کے کام کاج میں دن ابھی ماں کی
کافی مدد کرتی تھی۔ جب تک والدین بچے سے پیار
کرتے رہیں بچے ان مادی چیزوں کی بہت کم پروا
کرتے ہیں جو بڑوں کو متاثر کرتی ہیں۔ کارلا ہوم ورک
میں اس کی مدد کرتی اور جبکہ اس کو کہنا پیاں سناتا۔
ساتھ ساتھ وہ شام کی خبریں بھی سنتے۔ آٹھ بجے کارلا
اس کو غسل دیتی اور تیس منٹ بعد دونوں صبح کو گرم بستر
میں ملنا دیتے تھے۔

صوفے کے اوپر کھل اوڑھے ہوئے کارلا نے کہا
"اچھا تو کیا خبر ہے؟"

جبکہ نے اسپورٹس میگزین کے ورق پلٹتے ہوئے
جواب دیا "تمہارا کیا مطلب ہے خبر سے؟"

"گوگلے مت بنو۔ کوئی خبر ہے۔ کوئی نیا مقدمہ۔"

کوئی بڑی قیس جو ہمیں غربت سے نجات دلا سکے؟"

جبکہ نے ہرٹف کیس سے ایک فائل نکالی اور اس
کو کچھ کاغذات پکڑائے۔ "یہ خودکشی کا مقدمہ ہے۔"

"اچھا یہ وہ ہے۔"

"بالکل وہی۔ کل رات میں نے تمہیں مسٹر سیٹھ
بیو بڑ کی انیسویں ناک موت کے بارے میں بتایا تھا۔

لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ مرنے سے پیشتر
اُس نے ایک وصیت لکھی اور میرے دفتر بھیج دی۔
اس نے مجھے اس مقدمے میں اپنا وکیل نامزد کیا ہے۔
کل شام میں نے وہ وصیت عدالت میں پیش کر دی

"کیونکہ یہ قانون کا تقاضا ہے۔"

سائنس نے غصے سے میز کا ابا درخت پر دے
مارا۔ "لٹیک ہے۔" اس نے خالی کریٹ کو ٹھوکر ماری

اور بڑا اتنا ایک طرف چل دیا۔
لینی نے قریباً سرگوشی کے انداز میں کہا "مجھے اس

پر بہت افسوس ہے مسٹر بریکمیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ دیکھو مسماۃ لینگ ہمارا جلد از
جلد ایک اہم معاملے پر بات کرنا ضروری ہے۔ غالباً

کل میرے دفتر میں۔ یہ مسٹر بیو بڑ اور اس کی آخری
وصیت کی تصدیق کے بارے میں ہے۔"

لینی ٹپکا ہوتے چہاتے ہوئے حیرت سے جیک کو
دیکھ رہی تھی "کیا میں وصیت میں شامل ہوں؟"

"تم یقیناً ہو۔ درحقیقت اس نے اپنی زندگی جائیداد
کا ایک بڑا حصہ تمہارے لیے چھوڑا ہے۔"

"وہ میرے خدا۔"

"جی ہاں۔ وہ مجھے اپنی جائیداد کا وکیل بنانا چاہتا
ہے اور مجھے یقین ہے اس پر قانونی جنگ لڑی جائے

گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بات کرنے کی ضرورت
ہے۔"

"کیا میں اپنے شوہر کو بتا دوں؟"

"تمہاری مرضی ہے۔ میں اس کو اس معاملے میں
شریک کر لیتا لیکن میں نے اس کی شراب نوشی کی

کہانیاں سن رکھی ہیں۔ لیکن مسماۃ لینگ وہ تمہارا شوہر
ہے اور اسے کل تمہارے ساتھ آنا چاہیے اگر وہ اچھی
حالت میں ہو۔"

"وہ اچھی حالت میں ہوگا میں وعدہ کرتی ہوں۔"

جبکہ نے اس کو اپنا بزنس کارڈ دیا اور کہا "کل سر

لیے میں اس کے بارے میں بات کر سکتا ہوں۔ یہ لو وصیت پڑھ لو۔“

جب وہ دو صلیب کی وصیت پڑھ رہی تھی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے بے یقینی سے جیک کی طرف دیکھا اور کہا ”لیٹی لینگ کون ہے؟“

”مرحوم کی سیاہ فام گھریلو ملازمہ۔“

”اوہ میرے خدا! جیک! یہ شرمناک کہانی ہے۔“

”مجھے یقین ہے کہ ایسی ہی ہے۔“

”کیا اس کے پاس روپیہ ہے؟“

”کیا تم نے وصیت کا وہ حصہ پڑھا جس میں وہ کہتا ہے ”میری زمینی جائیداد کافی زیادہ ہے اوزی اس کو جانتا ہے اور وہ اس سے اتفاق کرتا ہے۔ میں صبح سویرے قبیل کنندہ رسل ایمرگ سے ملنے جا رہا ہوں۔ دوپہر تک میں کافی معلومات حاصل کروں گا۔“

اس نے کانٹہ کے دونوں ورق لہرائے اور پوچھا ”کیا یہ وصیت مستند ہے؟ کیا تم اس قسم کی وصیت بنا سکتے ہو؟“

”اوہ ہاں۔ پروفیسر رابرٹ ویئر نے لا اسکول میں Wills and Estates پچاس سال پڑھائی۔ اس نے مجھے اے گریڈ دیا۔ جب تک ہر لفظ متونی کا تحریر کردہ ہے اس پر دستخط اور تاریخ ثبت ہیں یہ ایک حقیقی وصیت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے دونوں بچے اس پر قانونی کارروائی کریں گے لیکن اس کا سارا لطف اسی میں ہے۔“

”اس نے غلطی طور پر ہر چیز اپنی سیاہ فام ملازمہ کے نام کیوں کر دی؟“

”میرا خیال ہے وہ گھر کی صفائی کو پسند کرتا تھا۔“

تھی۔ ظاہراً وہ اس کو پسند کرتا تھا۔ اس کے دونوں بچے وکیل کے ذریعے مقدمہ لڑیں گے اور اس کے نامناسب اثر و رسوخ کا الزام لگائیں گے۔ وہ دھوکا کریں گے کہ اس کی اس کے ساتھ بہت قربت تھی اور وہ بوڑھے کو ایسی باتیں بھائی رہتی تھی۔ فیصلہ جیوری کے ہاتھ میں ہوگا۔“

”جیوری مقدمہ؟“

”جیک تصور کرتے ہوئے سکرابا تھا۔“ اوہ ہاں۔“

”اس کے بارے میں اور کون جانتا ہے؟“

”میں نے آج سہ پہر پانچ بجے درخواست جمع کروائی اس لیے ابھی تک شپ شروع نہیں ہوئی۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ صبح نو بجے تک عدالت خانہ اس سے گونج رہا ہوگا۔“

”جیک! یہ تو عدالت کی چھت آزادینے والا دھماکا ثابت ہوگا۔ ایک دولت مند سفید فام شخص اپنے اہل خانہ کو وصیت سے بے دخل کرتا ہے اور سب کچھ سیاہ فام گھریلو ملازمہ کے نام کر دیتا ہے پھر پچاسی لے لیتا ہے۔ کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“

وہ مذاق نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنی بھاری ٹیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

کارلا نے پوچھا ”کیا تم لیٹی لینگ کو ملنے گئے تھے؟“

”میں ملا تھا۔ وہ لعل علیا میں رہتی ہے جہاں سفید فام نہیں رہتے۔ اس کا شوہر شرابی ہے۔ میں گھر کے اندر نہیں گیا لیکن مجھے وہ پرہجوم محسوس ہوا۔ یہ ان کا اپنا گھر نہیں ایک چھوٹا سا سستا کرائے کا گھر ہے۔“

”کیا وہ ابھی عورت ہے؟“

میرا تاثر ہے کہ وہ ایک مخصوص سیاہ فام عورت ہے جس کا گھر بچوں سے بھرا ہوا ہے۔ جزوقتی شوہر کم از کم مزدوری..... مشکل زندگی۔“

”یہ بہت سخت زندگی ہے۔“

”ہاں لیکن یہ بالکل درست ہے۔“

”کیا وہ پرکشش ہے؟“

”میں واقعی بتا نہیں سکتا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ قریباً پینتالیس سال کی ہے اور کافی اچھی حالت میں ہے۔ یقیناً بے کشش نہیں۔ تم کیوں پوچھتی ہو؟ تم سمجھتی ہو مسٹر ہیو برڈ کی آخری وصیت کے پیچھے محبت کا کھیل ہو سکتا ہے۔“

”یقیناً..... میں یہی سوچ رہی ہوں اور کل دوپہر سارے قصبے میں یہ خبر گرم ہوگی۔ اس کے اوپر یہ چیز ہر جگہ لکھی ہوئی ہے۔ وہ قریب المرگ شخص تھا اور وہ اس کی دیکھ بھال پر مامور تھی۔ کون جانتا ہے انہوں نے کیا کچھ کیا۔“

”تم ایک گندی سوچ رکھتی ہو لیکن میں اس سے پیار کرتا ہوں۔“

اچانک فون کی کھنٹی بجی۔ جیک نے کچن میں جا کر فون سنا ”باہر بیسٹ آیا ہے۔“ اس نے ایک سگارا اور ماچس کی ڈبیالی اور باہر چلا گیا۔ لیزر بکس کے قریب اس نے سگارا سلگایا اور صبح کی ٹھنڈی ہوا میں دھواں مچھوڑا۔ ایک کار اس کے قریب آ کر رکی۔ ڈپٹی شیرف مائیک میسٹ نے اپنا بھاری بھر کم جسم گاڑی سے باہر نکالا۔ اس نے جیک کو سلام کیا اور مگر میٹ سلگایا۔ بیسٹ نے کہا ”اوڑی کو ہیو برڈ کی جائداد کے بارے میں مزید کوئی معلومات نہیں ملی۔ لگتا ہے بوڑھے نے اپنے کھلونے کہیں اور

رکھے ہوئے ہیں۔ اس ریاست میں کوئی ریکارڈ نہیں ملا سوائے اس کے گھر، زمین اور لکڑیوں کے گودام کے۔ اس کے کوئی بینک اکاؤنٹس نہیں، کوئی شراکت داری نہیں۔ افواہیں ہیں کہ وہ دوسری ریاستوں میں کاروبار کرتا تھا۔ لیکن ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔“

جیک نے سر ہلایا اور کہا ”اور ایمرگ۔“

”رسل ایمرگ کا تعلق فاسے۔ الاہاما سے ہے۔ وہاں وہ ایک وکیل تھا لیکن پندرہ سال قبل موکلین کی رقوم کے غلط استعمال کے سبب بار سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کے خلاف فرد جرم عائد نہیں ہوئی اور اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں۔ قانون کے پٹے سے فارغ ہونے کے بعد وہ عملاتی لکڑی کے کاروبار میں چلا گیا اور فرض کیا جاسکتا ہے کہ وہیں اس کی سیتھ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کاروبار میں کافی ترقی کی۔ معلوم نہیں وہ لیپل جیسی بیکار جگہ پر منتقل کیوں ہوا؟“

”کل صبح میں لیپل جا رہا ہوں۔ میں اس سے استفسار کروں گا۔“

”اچھی بات ہے۔“

”یہاں رکنے کا شکریہ۔ میں کل اوڑی سے بھی بات کروں گا۔“

”ضرور کرنا..... پھر ملیں گے۔“

اس نے کارلا کو خالی خوابگاہ میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ کمر روشن تھا۔ جیک خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ کارلا نے کہا ”جیک میں اپنے گھر کے سامنے پولیس کاریں دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئی ہوں۔“

”میں بھی تنگ آیا ہوا ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔



غذائیات

غذائی مغالطوں کا تیر بدف توڑ

مضید غذائیں

جنہیں مضر صحت سمجھا گیا

بہتر ہیں۔ جب یہ ہے کہ سفید چاول کھانے سے ہمارے جسم میں ناٹروجن زیادہ دیر تک موجود رہتی ہے۔ یہ گیس پھر ہمارے عضلات کو مضبوط بناتی ہے۔ سفید چاولوں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان میں شامل پوٹاشیم اور کالسیئم ہمارے جسم میں بخوبی جذب ہوتا ہے۔ جبکہ بھورے چاولوں میں موجود زائد ریشہ (فائبر) انہیں ہمارے بدن میں زیادہ مقدار میں جذب نہیں ہونے دیتا۔

سرخ گوشت

سفید چاول کی طرح سرخ گوشت کے متعلق بھی کئی منفی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ حالانکہ جدید تحقیق نے انکشاف کیا ہے کہ مچھلی، سرخ اور گائے بھینس کے گوشت میں لمحاظ غذائیت زیادہ فرق نہیں اور نہ ہی سرخ گوشت انسان کو کسی دوسرے گوشت کی نسبت نقصان پہنچاتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ سرخ گوشت کھانے والے دیگر غیر صحت بخش عادات مثلاً سگریٹ نوشی، شراب نوشی، پھل و سبزیاں نہ کھانے وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لہذا سرخ گوشت نہیں بلکہ یہی غیر صحت مند طرز

جدید طبی تحقیق نے روزمرہ استعمال میں آنے والی غذاؤں کے راز فاش کر دیے

ڈاکٹر شامستہ خان

دن قبل ایک رسالے میں پڑھا کہ سفید چاول نہ کھائیے کیوں کہ اس میں غذائیت بخش اجزاء کم ہوتے ہیں۔ جبکہ بھورے چاولوں میں معدنیات اور وٹامن زیادہ ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سفید چاولوں کی حیثیت متنازع ہے۔ کئی امریکی ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ سفید اور بھورے چاولوں کے درمیان لمحاظ غذائیت زیادہ فرق نہیں۔

بعض ماہرین غذائیت کے نزدیک تو سفید چاول

کافی



یہ مشروب بھی اسی وقت انسان کو فائدہ پہنچاتا ہے جب اسے معتدل مقدار میں نوش کیا جائے۔ مثلاً جدید تحقیق نے افشا کیا ہے کہ مردوں میں روزانہ دو پیالی کافی پینے سے اس کا دل چھٹنے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ نیز زیاہٹس قسم ۲ سے بھی بچاؤ ممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص روزانہ کافی کی چار پانچ پیالیاں پڑھانے لگے، تو اس کا نقصان ہوتا ہے۔ وہ پھر مختلف بیماریوں کا شکار بن جاتا ہے۔

سبز و سرخ مرچ



پچھلے ماہ ہانگ کانگ یونیورسٹی کے محققوں نے ایک انوکھا تجربہ کیا۔ انھوں نے مسلسل چار ہفتے تک دس چوبیس کو ایسی غذا کھلائی جس میں کاپسایسینائڈز (Capsaicinoids) کیمیکل موجود تھے۔ یہی کیمیکل سرخ و سبز مرچ کو تیز ذائقہ عطا کرتے ہیں۔

جب چار ہفتے بعد چوبیس کا طبی معائنہ ہوا، تو ماہرین کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان میں بڑے کولیسٹرول (LDL) کی سطح کم ہو گئی۔ جب وجہ جاننے کی سعی ہوئی، تو پتا چلا کہ مرچوں کے کیمیکل کاپسایسینائڈز ان جینز کو کھل کر کام نہیں کرنے دیتے جو شریالوں کو سکیز دیتے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے عضلات پرسکون رہتے ہیں اور قلب کی طرف خون کا بہاؤ عمدہ رہتا ہے۔ چنانچہ اپنی روزمرہ غذا میں ایک دو مرچیں شامل کیجیے اور ہارٹ اٹیک سے بچے رہیے۔

زندگی انھیں متفرق بیماریوں میں مبتلا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سرخ گوشت انسانی بدن میں اچھے (ایچ ڈی ایل) کولیسٹرول کی مقدار بڑھاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ گوشت میں سٹیئرک (Stearic) ایسڈ (سچو ریٹنٹی ایسڈ کی ایک قسم) اور اولیک (Oleic) ایسڈ (قلب دوست مونوسچو ریٹنٹی) ملتے ہیں۔ یہ دونوں ہمارے جسم میں اچھے کولیسٹرول کی سطح بڑھاتے ہیں۔ ڈاکٹر کیرول رویت مشہور امریکی ڈاکٹر ہے۔ وہ کہتی ہے:

”سرخ گوشت قلب و بدن کے لیے مفید ایسی چکنائیوں (Fats) کا مرکب ہے جو کسی اور غذا میں نہیں ملتیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ چربی سے پاک گوشت کھایا جائے۔“

کھٹی کریم (Sour Cream)



مغربی کھانوں کی تیاری میں کھٹی کریم عام استعمال ہوتی ہے۔ یہ عام کریم کا خمیر اٹھا کر بنائی جاتی ہے۔ اس میں چکنائی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اسی لیے ڈاکٹر کھٹی کریم سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ اتنی مضر صحت نہیں۔

وجہ یہ ہے کہ کھٹی کریم دیگر کریموں کی نسبت کم حرارے رکھتی ہے۔ مثلاً ایک بڑے چمچ مایونیز کی نسبت کھٹی کریم کی اتنی ہی مقدار نصف حرارے رکھتی ہے۔ نیز یہ ایک گلاس دودھ سے بھی کم سچو ریٹنٹی چکنائی کی حامل ہے۔ لہذا معتدل مقدار میں کھٹی کریم کا استعمال مضر صحت نہیں۔

کہ اس میں حیاتین اور معدنیات وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔

(۲) شاخ گوبھی صحیح

طرح ذخیرہ کیجیے

اب اکثر پاکستانی دکانوں میں شاخ گوبھی (Broccoli) بھی دکھائی

دینے لگی ہے۔ یہ سبزی انسانی جسم میں وٹامن ڈی کی کمی دور کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ نیز جدید طبی تحقیق نے دریافت کیا ہے کہ شاخ گوبھی ہمیں سرطان (کیلسر) سے بھی بچاتی ہے۔

شاخ گوبھی کو محفوظ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے پلاسٹک بیگ میں رکھیے۔ پھر بیگ میں کانٹے سے مناسب فاصلے پر چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیجیے۔ پھر یہ بیگ فریج میں رکھیے۔ یوں شاخ گوبھی نہ صرف تازہ رہے گی بلکہ اس کی غذائیت بھی بڑھ جائے گی۔

پروٹین محض گوشت سے نہ لیں

انسان کو زندہ رہنے کے لیے پروٹین کی بھی ضرورت ہے۔ یہی ہفتوں (ٹشوز) کی تعمیر کرتے اور بطور ایندھن کام دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ غلط نظر یہ پھیل چکا کہ پروٹین صرف گوشت اور دودھ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ خصوصاً سرخ گوشت کا حد سے زیادہ استعمال نقصان دہ ہے۔

انسانی جسم میں سرخ گوشت کی زیادتی سے نہ صرف وٹائی متاثر ہوتی ہے بلکہ عمر بھی گھٹ جاتی ہے۔ نیز انسان مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف دالوں اور سبزیوں سے حاصل کردہ پروٹین وزن

غذائوں کو زیادہ غذائیت بخش بنائیے
ذیل میں ایسی آسان ترکیب پیش ہیں جن کے ذریعے آپ بعض غذائوں کو زیادہ مفید بنا سکتے ہیں۔

(۱) گریپ فروٹ کو

اچھی طرح چھائیے

وٹامن سی سے بھرپور گریپ فروٹ اپنے اندر کارآمد ضد عکسیدی مادے رکھتا ہے۔ اب ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ یہ پھل اچھی طرح چھایا جائے، تو زیادہ ضد عکسیدی مادے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ پھل موٹاپا کم کرنے میں بھی مفید پایا گیا ہے۔



(۲) سلاد ایک دن

پہلے بنائیے

وجہ یہ ہے کہ یوں سلاد میں زیادہ ضد عکسیدی مادے جتم لیتے ہیں۔ طریق کار یہ ہے کہ سلاد کاٹ کر پلاسٹک بیگ میں رکھیے اور فریج میں رکھ دیجیے۔ ممکن ہو، تو بیگ میں ٹشو پیپر رکھ دیجیے تاکہ زیادہ سے زیادہ نمی جذب ہو۔ اگلے دن سلاد استعمال کر لیجیے۔



(۳) زرد دانوں والی

مکئی کھائیے

تقریباً سارا سال دستیاب رہنے والا اناج، مکئی بہت مفید غذا ہے۔ یہ معدنیات اور حیاتین کی کثیر مقدار رکھتا ہے۔ ان میں وٹامن بی، سیکنیشیم، میگنیشیم، فاسفورس، زنک، تانبا اور فولاد نمایاں ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ گہرے رنگ کے دانوں والی مکئی زیادہ مفید ہوتی ہے کیوں



عام سبزیوں میں پتے والی سبزیاں مثلاً پالک اور
شکاخ گو بھی بھی پروٹین کی حامل ہیں۔ تاہم ان سے فی
پیالی چار پانچ گرام پروٹین ہی ملتی ہے۔

آنکھوں کے لیے مفید غذائیں
آپ نے سنا ہوگا کہ گاجر، نارنگی
رنگ کے پھل اور پتے والی
سبزیاں بینائی کے لیے مفید ہیں۔

یہ بات سچ ہے۔ گاجر وٹامن اے کی ایک قسم بیٹا
کروٹین سے مالا مال ہے۔ یہ حیاتین آنکھ کے پردے
(Retina) اور دیگر حصوں کی حفاظت کرتا اور انھیں
تندرست رکھتا ہے۔ اسی طرح پتے والی سبزیوں میں
دواہم ضد عکسیدی مادے... یونین اور زینکسٹین ملتے
ہیں۔ یہ مادے آنکھوں کو ایک خطرناک بیماری "میکو
ڈی جرنیشن" (Macular Degeneration)
سے محفوظ رکھتے ہیں۔

انڈا بھی بصارت کے لیے مفید غذا ہے۔ یہ بھی
درج بالا دو ضد عکسیدی مادے رکھتا ہے۔ نیز وٹامن بی
کے حامل پھل (مانجا، کٹو، اشہری وغیرہ) اور چریل
مچھلیاں بھی بینائی کو تقویت دینے والے غذائی مادے
رکھتی ہیں۔

دو سنہرے غذائی اصول

پہلا اصول یہ ہے کہ کبھی تنہا پھل نہ کھائیے۔ وجہ
یہ ہے کہ پھل کاربوہائیڈریٹ سے پر ہوتے ہیں۔ لہذا
محض پھل کھانے سے خون کی شکر پہلے بڑھتی اور پھر
گھٹ جاتی ہے۔ اسی لیے صرف پھل کھانے کے ایک
گھنٹے بعد عموماً بھوک لگتی اور تھکن محسوس ہوتی ہے۔ اس
حالت سے بچنے کے لیے پھل کو پروٹین یا صحت مند

گھٹائی نیز دیگر فوائد پہنچاتی ہے۔ واضح رہے کہ انسان کو
اپنے وزن کے حساب سے فی کلو گرام پروٹین کی
ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا وہ درج ذیل پودوں سے
آسانی پروٹین پاسکتا ہے:

سویا پھلی

دنیا کے نہایت میں بھی
پھلی (سویا بین) سب سے زیادہ
پروٹین کی حامل ہے۔ ایک پیالی
(۱۷۵ گرام) پکی سویا پھلی کھانے سے ہمیں
۲۸ گرام پروٹین ملتی ہے۔ نیز یہ پھلی وٹامن کے علاوہ
بروفلاوین، فولاد، فاسفورس، میگنیز جیسے اہم مادوں کا بھی
خزانہ ہے۔ یاد رہے، ۸۵ گرام (ڈیڑھ چھٹانک)
گوشت کھانے سے ہمیں ۲۸ گرام پروٹین حاصل
ہوتی ہے۔

سویا پھلی کے علاوہ دیگر اقسام کی پھلیاں مثلاً سیاہ
پھلی، چنا، دالیں، اور سبز بھی پروٹین کے حامل ہوتے
ہیں۔ ان میں فی پیالی ۱۹ تا ۱۴ گرام پروٹین پائی
جاتی ہے۔ لہذا بہتر ہے کہ انھیں کھا کر پروٹین پائیے،
نہ کہ سرخ گوشت کھا کر اپنی صحت بہاؤ کر لیں۔

موگ پھلی

پھلوں اور دالوں کے بعد مغزیات
زیادہ پروٹین رکھتے ہیں اور ان میں
پہلا نمبر موگ پھلی کا ہے۔ اگر آپ
صرف دو چمچ موگ پھلی کھالیں، تو آپ کو ۸ گرام
پروٹین حاصل ہوگی۔ لہذا سردیوں میں آدھی پیالی
موگ پھلی کھائیے اور اتنی پروٹین حاصل کیجیے جتنی پھلی
کھانے سے ملتی ہے۔

بھی ہوتا رہا۔ چھ ماہ بعد انکشاف ہوا کہ ان لوگوں میں انسولین مزاحمت (Insulin resistance) جنم لے چکی۔

جب ہم کھانا کھائیں، تو ہمارے خون میں شکر جنم لیتی ہے۔ تب ایک ہارمون، جسم کی ہاتھوں (ٹشوز) کو حکم دیتا ہے کہ وہ شکر جذب کر لیں تاکہ اسے بطور ایندھن استعمال کیا جاسکے۔ جو شکر جذب نہ ہو سکے، وہ چربی (Fat) بن جاتی ہے۔ لیکن جب کسی بھی وجہ سے ہاتھیں انسولین کے حکم پر عمل نہ کریں اور شکر کو انسانی جسم میں دھنسا دیا جائے، تو یہی حالت انسولین مزاحمت کہلاتی ہے۔ اسی حالت کے باعث انسان پھر ذیابیطس اور امراض قلب میں مبتلا ہوتا ہے کیونکہ زائد چربی وہاں جان بن جاتی ہے۔

ماہرین کے نزدیک انسانوں میں جب یومیائی گھڑی (Circadian Clock) خراب ہو جائے، تو انسولین مزاحمت پیدا ہوتی ہے۔ یومیائی گھڑی ہی انسان کو سونے یا جاگنے کا ٹگل دیتی اور دیگر جسمانی افعال انجام دیتی ہے۔ نتیجتاً انسان پر چربی چڑھنے لگتی ہے۔ ماہرین اب یومیائی گھڑی خراب ہونے کا معما سمجھنے کی سعی کر رہے ہیں۔

بہر حال تجربے سے ثابت ہو گیا کہ اب محض یہ نہ دیکھیے کہ کیا شے کھانی ہے بلکہ اس امر کو بھی مد نظر رکھیے کہ کب کھانی ہے۔ جو انسان نیند لینے کے وقت کھانا کھانے لگے، وہ فرہ ہوئے کے لیے تیار رہے۔ جبکہ دن میں کھانا کھانے سے بیشتر غذا توانائی میں بدل جاتی ہے۔

چکنائی رکھنے والی غذا کے ساتھ کھائیے۔ یہ دونوں غذائی عناصر ہاضمے کا عمل سست کرتے اور خون کی شکر کو بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ کئی پھلوں کے ساتھ دہی کا استعمال مفید پایا گیا ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ کھانوں کے ساتھ کیچ اپ اور اسی قسم کی رنگ برنگ چٹنیاں کبھی کبھی استعمال کیجیے۔ اس کے بجائے مرچ، ادک اور لہسن سے بنی چٹنی کھائیے۔ نیز سالن میں ہلدی، دار چینی، کالی مرچ استعمال کیجیے۔

دراصل سالوں اور جڑی بوٹیوں کے شامل کرنے سے نہ صرف کھانا چٹ پٹا ہوتا ہے بلکہ وہ صحت بخش بھی بن جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ غذائی اشیاء کئی مفید مادے رکھتی ہیں، جو ہمیں مختلف امراض مثلاً بلند فشار خون سے بچاتے اور ہمارے مایوس نظام کو مضبوط بناتے ہیں۔

رات نہیں شام کو کھانا کھانیے

میرے دادا شام ۶ بجے ہی کھانا کھا لیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یوں انسان صحت مند رہتا ہے۔ مگر ہم بچوں کو ان کی منطق سمجھ نہ آئی۔ اب سائنس نے دریافت کر لیا ہے کہ رات کے بجائے شام کو طعام کر لینا کیوں مفید ہے۔

امریکا کی وینڈر بلٹ یونیورسٹی کے محققوں نے انوکھا تجربہ کیا۔ انھوں نے دس مرد وزن کو چھ ماہ تک رات ۹ بجے کھانا کھلایا۔ ساتھ ساتھ ان کا طبی معائنہ

انجان پن سے جان کاری تک کا سفر

نگار من شگفتہ



مثل غیر مشہور (مگر ہر مرد کے دل کی آواز ہے) کہ بندے کی جب شامت آئے، تو وہ شادی کر لیتا ہے۔ یہ ایسا عجیب ہے کہ جسے کم ہی مرد بولنا گوارا کرتے ہیں۔ ہر بیابا کی طرح ہمیں بھی اس صدقت کا علم پلوں کے نیچے سے پانی گزرنے کے بعد ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے پیدا کرتے ہی حضرت آدمؑ کی شادی کر دی تھی۔ جنال چاہم جیسے ہی تعلیم پا کر نوکر ہوئے، ہمارے ابا یہ سنت النبی پوری کرنے کو سرگرم ہو گئے۔ نام ہمارا عبدالباری ہے۔ ابا، عبداللہائی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ بیچاس سال ملازمت میں انھوں نے ہزار ہا طالب علموں کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ مگر اپنا بیٹا ان کی ہر کوشش کو "بوائے" دینے میں کامیاب رہا کیونکہ مجھے زیور و زیور پہننے کا کوئی شوق نہ تھا۔

کتاب، بیگم اور میں

مطالبے سے دور بھاگنے والے خاوند کی چٹ پٹی آپ بیتی کتابوں نے بھی اچھوتے انداز میں اُسے اپنا کرویدہ بنالیا

عجم اسحر



چار کوششوں میں میسر نہ ہو سکیں، تین کوششوں میں ایف۔ اے اور دو میں بی۔ اے کر لیا۔ جس طرح مجھے نقل مارنے کی مہارت ہو گئی تھی، اگر ایم۔ اے کرنے کی کوشش کرتا تو ایک ہی بار بیڑا پار ہو جاتا۔ خیر اس زمانے میں ڈگری حاصل کرنے کا جنون اور مرض عام نہ تھا۔ بی۔ اے کو اچھی خاصی تعلیم گروانا جاتا۔ چنانچہ ڈگری لینے کے بعد نوکری کرنے کی ٹھانی۔ سادہ زمانہ تھا، ایک سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی اور زندگی ڈھب پر رواں دواں ہوئی۔ سہ پہر چھٹی ہو جاتی تو پھر پوری شام اور رات یاروں سے گفتگو رہتی۔ بڑی بے فکر تھی کہ بیٹھے بٹھائے ابا کو ہمارے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر لگ گئی۔

میری شامت کے آثار بقول میرے دوست، میرے بھی ہویدا ہو گئے جب ابا کو میری شادی کا خیال آیا۔ مجھے اچھی طرح وہ دوپہر یاد ہے جب آسمانوں پر فرشتے مجھ پر انگلیاں اٹھا اٹھا کر ہنستے رہے کہ دیکھو، اب اس بندہ خاکی کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ میں دفتر سے آکر آرام میں مشغول تھا کہ اچانک گھر کا دروازہ کھلا ابا ہنستے مسکراتے بلکہ کھلکھلاتے کسی کو ساتھ لیے تشریف لائے، وہ بھی گرم گرم جلیسیوں کا لٹافہ لیے۔ برآمدے میں آتے ہی آواز دی "ارے میاں عبدالباری! بھی پر خوردار.... جلدی آؤ، دیکھو کون آیا ہے؟"

میں بستر سے اٹھ کر باہر آیا۔ ایک بزرگ بلکہ پیر فرات کو ابا کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھ کر اچھل گیا۔ "ہیں مولانا رومی!" دوستو یقین کیجئے، ان کی صورت ہو یہو کتابوں والے مولانا

رومی جیسی لگی۔ دونوں بزرگ باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے تو مجھے اپنی لفظی کا احساس ہوا کہ نہ سلام نہ دعا اور لگا آئیں بائیں شاکیں مارنے۔ خیر گھبرا کر آداب کہا۔

انہوں نے سابقہ گستاخی معاف کرتے ہوئے مسکرا کر میرے سر پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے خریدار خریدنے سے پہلے بکرے پر پھیر کر اطمینان کرتا ہے۔ ابا بولے "ارے میاں! یہ ہمارے بچپن کے دیرینہ یار غار جوہر مرزا ہیں.... ارے ابھی تم جانتے تو ہو ہی تا.... اتنا ذکر تو کر رہا ہوں میں۔"

ابا پر جوش تھے۔ میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ "اچھا تو یہ ہیں جو ہر چچا.... جی جی مجھے معلوم ہے کیسے ہیں آپ بچا جان؟" میں نے سنبھل کر سوہانہ عرض کی تو وہ بھی سابقہ خطا کو بھول گئے۔

"بھئی ماشا اللہ عبدالباقی، صاحبزادے نے تو خوب قد نکالا ہے۔ خوب اکیا کرتے ہو میاں؟" ان کی آواز میں قشقی شکر انداز وہی تو لگے ولا تھا۔ میں نے مدد طلب انداز میں ابا کو دیکھا۔ وہ میری تعلیم و ملازمت کی تفصیل بتانے لگے، میں کھڑا شرما تا رہا۔ خیر جو ہر چچا چند گھنٹے قیام کے بعد رخصت ہوئے۔

طے یہ پایا کہ ہم دونوں اگلے اتوار ان کے گھر حاضری دیں گے۔ جو ہر چچا کا ذکر خیر ابا سے اکثر سنا تھا اور یہ بھی کہ ان کی مجھ سے تین سال چھوٹی ایک بیٹی تھی جس کا رشتہ مجھ سے طے تھا۔ مگر ابا کا رابطہ منقطع ہو جانے سے رشتہ بھی گم شدہ ہو گیا۔ آج وہ دوبارہ دریافت کا سبب بنا جب اچانک سر راہ جو ہر چچا سے ملاقات ہوئی۔

چچا جو ہر کا گھر پتلی مٹی کے آخری کونے پر واقع تھا

وہ مسکرا دیے۔ بھائی گوہر مرزا بولے ”ادب کے مطالعے میں نثر کو ترجیح دیتے ہو یا شعر کو۔“
سنجیل کر کہا ”دونوں کو نہیں۔۔۔ بلکہ نظم کو ترجیح دیتا ہوں۔“

ابن خیرالمنان نے پوچھا ”فلسفہ کتنا سمجھ میں آتا ہے؟“

مسکرا کر کہا ”بس گھاس کھود ہی لیتا ہوں۔“
ان کے دار جاری سننے مگر میں بھی اچھا کھلاڑی ٹھہرا، یونہی بیڑھے ترجمے جواب دے کر انھیں متاثر کر دیا۔ واپسی پر خبر ملی کہ اگلے ماہ ہماری شادی ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

اپنے دوست میر کو یہ خبر دی، تو جذب کے عالم میں اٹھا لڑ پڑھنے لگے۔ میں نے کہا ”بھائی جلتے کیوں ہوں خوش؟ ایسی ہے میری کہ ملازمت بھی خود بخود دل گئی اور دیوی بھی۔“ چند لمحے دیکھتے رہے پھر ٹھنڈی آہ بھر کے بولے ”امیر ربی ہے امیر ربی۔“

جب دولہا بنے دھڑکتے دل سے اپنے محلہ عروسی کا دروازہ کھولا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ دھن غرارہ اپنے بستر پر گھونگٹ اٹھائے، نیم دراز کتاب پڑھ رہی تھیں۔ کتاب بھی اتنی موٹی کہ جسے دیکھ کر مجھے چکر سا آ گیا۔ ابن خلدون کی تاریخ عالم کا ترجمہ تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ دراصل بچپن سے کتابوں سے دور بھاگتا آیا ہوں۔ کتاب کا نام لے کر یار لوگ ڈرایا کرتے۔ جتنی موٹی کتاب اتنا ہی زیادہ اختلاج!

مجھے آتا دیکھ اٹھ بیٹھیں اور کتاب بند کر کے گھونگٹ گرا لیا۔ مگر کتاب گود میں دھری تھی اور پورا وجود رنگین سرورق لگ رہا تھا۔ خود کو سنبھالا، کتاب

اور مرزا غالب کی یاد دلانا۔ ان کے گھر جاتی کلیاں پیچیدہ دلیلوں جیسی تھیں اور ہمارا مستقبل بھی کچھ اتنا ہی پرچہ تھا۔ ہم بیشک میں ابھی اٹھک بیشک کے مراحل سے گزر رہے تھے یعنی پہلے بیٹھے پھر چچا جان کی آمد پر کھڑے ہو گئے۔ پھر بٹھائے گئے پھر چچی جان کی آمد پر پڑاٹھے پھر بیٹھے تو بڑی سالی (ہونے والی) اور ان کے شوہر کی آمد پر کھڑے ہوئے۔ پھر تقریباً مگر گئے، تو ہمارے ساسے (ہونے والے) اور ان کی نیگم کی آمد پر کھڑے ہوئے۔ یہ مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے تو اگلے مرحلہ انٹرویو نکلتا تھا۔

ساس (ہونے والی) نے پوچھا ”میاں صاحب زادے کتنا پڑھا؟ کیا کرتے ہو؟ آگے کا کیا ارادہ ہے؟“

میں نے آئندہ کالائیکٹ عمل پوشیدہ رکھتے ہوئے تمام جوابات دیے۔ میرے دوست میر کا کہنا تھا کہ یہ ملاقات اک بہانہ ہے کیونکہ یہ سلسلہ پراٹا ہے اور تمھارا برد کھوا ہوگا۔ یہ کرنا کہ ہر جواب پورے اعتماد سے دینا، چاہے جھوٹ بولو یا سچ! ابھی بچی پھلکی گھنگو اور بھاری بھر کم لوازمات سے تواضع ہو رہی تھی کہ چچا جوہر نے بینک کا زادیہ درست کیا اور بولے ”بیٹا عبدالباری! تاریخ میں کچھ دلچسپی ہے؟“

جلدی سے پُر اعتماد انداز میں کہا ”جی..... جی..... کیوں نہیں۔ تاریخ تو میرا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔“
چچا خوش ہو کر بولے ”واہ میاں! خوب جیسے گی بھئی..... اچھا تاریخ پڑھ کر کیا محسوس کرتے ہو؟“

جی چاہا کہ کہہ دوں کہ کتاب تھامتے ہی نیند خوب اچھی آتی ہے، مگر مختصر جواب دینا مناسب سمجھا۔ ”چچا جان! سب سے حد عبرت حاصل ہوتی ہے۔“

میں نے اب کے بے پروائی دکھائی۔ "فلسفہ سمجھنے کی چیز ہی نہیں کیونکہ فلسفہ نام ہی اچھی سی چیز کا ہے۔" اس گفتگو کے بعد وہ کمرے سے نکل گئیں اور ساتھ ہی بیگم کے دل سے میں بھی رخصت ہوا۔ میں ان پر اتنا نہ کھلا اگر میر نے مجھے یہ نہ کہا ہوتا "میاں! گر بہ گشتن روز اول..... روز روز کے مرنے سے ایک دن کا مرنا اچھا۔"

اس واقعے کے بعد ہمارے تعلقات میں ان دیکھی کتاب..... معاف کیجیے گا خلیج آگلی۔ بیگم از حد سلیقہ شعرا با اخلاق، مہذب و تمیز دار، امور خانہ داری کی ماہر اور ہارر جی خانے کی رونق ثابت ہوئیں۔ گھر میں ایک مدت بعد محورت کے سلیقے نے رنگ دکھایا اور گھر جنت ارضی کا نمونہ بن گیا۔ ابا جنھیں کئی بیماریاں لاحق تھیں، ان کی محبت اور توجہ سے تندرستی کی طرف آئے گئے۔ میں خود گھر کے علاوہ باہر کھانا نہ کھاتا۔ وہ کھانا پکانا جانتی تھیں اور کھانا بھی۔ ہم تینوں ایک تیسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔

مگر صاحب! اس ساری تفصیل سے یہ نہ سوچیے گا کہ ان کے مطالعہ کا شوق بلکہ جنون جوں کا توں نہ رہا، بلکہ اس میں اضافہ ہو گیا۔ انھیں اپنے ہی جیسا ایک عاشق مطالعہ یعنی ابا جو مل گئے۔ دونوں کتابیں پڑھتے اور آپس میں تبادلہ خیالات بھی کرتے۔ اکثر دو چار روز میں چٹا چان یعنی میرے سر بھی آ جاتے تو محفل اور چمک جاتی۔ ایسے میں، میں بھد حسرت و یاس منہ مٹا کرتا۔

میں اگر ان کے درمیان ہوتا تو سموسے، کچوڑے اور چائے سے آؤ بھگت کے بعد گویا مجھے جانے کا گھنٹل مل جاتا۔ میں نے کئی بار دکھا دے کی خاطر کتاب تھامی

اٹھائی اور تیزی سے الماری میں رکھ دی۔ صورت کی خاصی اچھی تھیں۔ گھونگٹ اٹھاتے ہی اپنی اپنی سی نکلیں۔ نام مہر النساء تھا، باقی تعارف دھیرے دھیرے ہوا۔ مطالعہ کا شوق اب اسے لیا اور گھر سے بے شمار کتب جہیز میں لائیں۔ دو چار روز میں وہ مجھ پر اور میں ان پر کھلنے لگا۔

جب ذرا رومانی گفتگو کا وقت ملتا تو پہرے پر کتاب کھڑی ہوتی۔ انھیں جونہی فرصت ملتی تو پڑھنے لگتیں۔ غالب، اقبال، میر کے اشعار، رومی، غزالی اور جامی کا فلسفہ و تصوف اور ابن سینا، شیرازی کی حکمت چلتے پھرتے ہوتیں۔ ایک بار کہنے لگیں "آپ بھی بازوق لگے تھے جب ہمارے گھر آئے۔ آپ کا انٹرویو چھپ کر سنا تھا، اچھا یہ بتائیے! آپ نے یہ کیوں کہا کہ تاریخ پڑھ کر آپ کو عبرت ہوتی ہے؟"

میں نے کہا "دیکھیں نا! مقام عبرت ہی ہے کہ جتنے لوگوں کے متعلق تاریخ میں درج ہے، وہ بچاڑے زندگی بھر عام آدمی والی پراسیویسی کو ترستے رہے۔ ظالم تاریخ دان ان کی ہر بات پر نظر رکھتا ہوگا۔" ان کی آواز میں بے یقینی تھی "جی" میں نے بھی ہٹ دھرمی دکھائی "جی"۔

"اور نظم کس کی پڑھتے رہے ہیں آپ؟" اب کے ان کا انداز محتاط تھا۔

"کسی کی بھی نہیں....." یوں بھی نظم پڑھنے نہیں رکھنے کی چیز ہے، وہ بھی زندگی کے معمولات میں۔" میں نے فخریہ انھیں دیکھا جو ضبط کے مرحلے طے کر رہی تھیں۔

"اور فلسفہ کے بارے؟" ان کا ادھورا سوال فیصلہ کن تھا۔

لطف اندوز ہونے کی خاطر کتابیں پڑھو۔ لکھنے والے تو دلوں کی نبض تھام لیتے اور روح کو منور اور جان معطر کر دیتے ہیں۔ دانش و حکمت بانٹتے ہیں۔ درد کا درماں کرتے ہیں۔ تم اس دنیا میں جھانکو تو سہی۔“

میر کے کچھ میں اتنا اثر تھا کہ میں بے اختیار کہہ اٹھا ”واہ کیا خوبصورت بات کہی، کہاں سے سیکھی ہیں ایسی باتیں؟“

وہ مسکرائے اور ہرچہ پا دا یاد کا سا انداز اپنا کر بولے ”نورا اپنے ذاتی طرف دیکھو۔“

میں نے ذاتی طرف سلام پھیرنے کے انداز میں سر تھمایا تو وہ پورا سر تھک گیا۔ کتابوں سے لبالب بھرا ہوا۔ وہاں میں نے پہلے کبھی غور نہ کیا تھا۔ بولے ”یہ سب کتابیں میری پڑھی ہوئی ہیں۔ ان کتابوں نے ہی مجھے یہ باتیں سکھائیں۔“

میں پھر کیا تھا، میں نے بھی ٹھان لی کہ اپنا خوف دور کر کے رہوں گا۔ کتابوں کی دکان پر گیا، چند کتب خرید لایا اور کمرے میں چھپا کر رکھ دیں، اس لیے کہ وہ سب بچوں کی کہانیاں تھیں۔ اب بیگم اپنی محفل میں مصروف ہوتیں تو ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگتا۔ روتہ مجھے بہت مزا آنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہوتیں، جلد ختم ہو جاتیں۔ گھر کے قریب ہی چھوٹی سی لائبریری تھی، وہاں سے بچوں کے ناول لانے لگا۔ گرمیوں کی طویل دوپہر جب بیگم تھک ہار کر سو رہی ہوتیں، تو کمرے کی بجلی روشنی میں ناول پڑھنے لگتا۔ پھر چھوٹے چھوٹے انگریزی ناول جو نسبتاً آسان تھے، لانے لگا۔

کچھ ہفتوں میں یہ سلسلہ منجیدہ ادب کی کتابوں میں بدل گیا۔ میر کے ساتھ لمبی نشستیں ہونے لگیں۔ وہ

تو بیگم جھٹ ہاتھ سے لے کر اپنا کو تھما دیتی اور کہتیں ”اجی آپ یہ کیا کرنے لگے۔“ اور اپنا، چچا جان سے کہتے ”ارے مرزا ابھی اس کتاب کو پڑھا۔ بھی کیا پر لطف کتاب ہے۔“ گویا جیسے میں وہاں تھا ہی نہیں۔ ایسے میں اکثر دل گرفتہ ہو کر محفل سے اٹھ جاتا اور کمرے میں جا بستر کے بجائے انگاروں پر لوٹتا۔

ایک دن اپنے دوست میر سے تذکرہ کیا تو بولے ”عبدالباری! تم اتنے خود پسند کیوں ہو کہ صرف اپنا ہی تذکرہ پسند ہے۔“

میں نے غصے سے کہا ”کیا بک رہے ہو۔ یہ منطقی کیسے نکالی؟“

وہ مسکرائے اور کہا ”ظاہر ہے، جب تمہیں ادب و علم کی محفل میں کچھ حصہ نہیں ملتا تو تم کہاں ہو جاتے ہو جمل کر..... تب تمہیں کوئی نہیں پوچھتا، ہے نا“

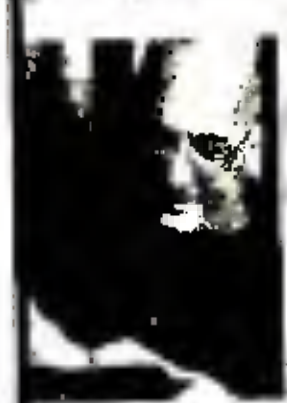
میں نے سر جھٹک کر کہا ”بھئی تینوں کو مزے ملتے اور دلچسپ تبصرے کرتے سن کر بڑی بے مائیگی محسوس ہوتی ہے۔“

میر بولے ”اے لوا یہ کیا مشکل ہے؟ بھی تم بھی کتابیں پڑھو اور ان میں شامل ہو جاؤ۔“

ان کا چٹکی بجا کر مسئلہ حل کر دینا مجھے نہ بھایا ”میرا تم جانتے ہو، مر کر لی۔ اے کیا ہے۔ کتابوں سے بغض رہا ہے۔ صفحہ کھول کر دیکھو تو چکر آنے لگتے ہیں کہ پورا کا پورا الفاظ سے لت پت ہوتا ہے۔ ظالم ایک سطر بھی تو سادہ نہیں چھوڑتے کہ سانس لیا جاسکے۔“

میر سنبھلے اور بولے ”دیکھو دوست! اسکول کالج کی پڑھائی تو اکثر غیر دلچسپ ہوتی ہے۔ پھر امتحان کا خوف کتاب تھامنے والے کے سر پر سوار ہوتا ہے۔ مگر تم ماشا اللہ اس دور سے نکل آئے ہو۔ اب تو علم و ادب سے

اردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے خاص



ارضِ وطن کے لیے ایک نظم

اے ارضِ وطن! ہم تیرے لیے اک
نظم لکھیں

تخلی کے پردوں سے رنگِ جنیں

اُن ساراں سے آہنگِ جنیں

نورِ وجہ میں بجتے رہتے ہیں

اور خواب نہیں اُن ہولوں کے

جو تیری ہلک سے وابستہ

ہر آنکھ میں بجتے رہتے ہیں

ہر آنکھ میں لاپلائی

ہم ایسا اک اور رنگ نہیں

اور نظم لکھیں

وہ نظم کہ جس کے حرف جیسے حرف کی ابجد میں نہیں

وہ رنگِ اجڑیں لفظوں میں جو قوسِ قزح کی زد میں نہیں

اور جس کی ہر اک سطر میں خوشبو ایسے لہریں لگتی ہو

جو وہم و گماں کی حد میں نہیں

اور جب یہ سب انہونی باتیں اُن دکھی اُن بھوئی چیزیں

اک دوسرے میں مل جائیں تو نظم پہن

اے ارضِ وطن! وہ نظم بنے جو اپنی امت میں کامل ہو

جو تیرے رُخ کے شایاں ہو اور میرے مُر کا حاصل ہو

اے ارضِ وطن! اے ارضِ وطن

خوشاد رہے آباد رہے

میں تیرا تھا میں تیرا ہوں

یسی باتا تجھ کو یاد رہے

اس کشتِ ہجر میں جو کچھ ہے

کب میرا ہے

سب تجھ سے ہے سب تیرا ہے

یہ حرفِ وطن یہ لوحِ قلم

سب اُڑتی دھولِ مسافت کی

سب جو کی والا پھیرا ہے

سب تجھ سے ہے سب تیرا ہے سب تیرا ہے

کچھ نیا پڑھتے تو مجھے کتاب دے دیتے۔ میں پڑھ کر

ان کے پاس جاتا، پھر تادیر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ مجھے

جو لذت اس دشت کی سیاحی سے ملی، پہلے کبھی نہ ملی

تھی۔ ایک دن بیگم دوپہر کو پڑھتے پڑھتے سو گئی تو میں

نے وہ کتاب اٹھالی جو ان کے پاس دھری تھی۔ اشفاق

احمد کی نژاد یہ تھی۔ اُسے بعد شوق پڑھنے لگا۔

پڑھتے پڑھتے مطالعہ میں گم ہو گیا۔ اثرِ آخرین

باتیں لکھی تھیں، پڑھ کر روح کو بالیدگی ملی۔ اس

شام جب خسر صاحب آئے اور بعد از چائے ان

تینوں کا من پسند مشغلہ شروع ہوا تو میں وہیں بیٹھا

رہا۔ اب اسی کتاب کا ذکر کرنے لگے۔ بیگم بھی بڑی

پر جوش تھیں، بولیں ”اشفاق احمد میں خود وہ

پیر موجود تھا جسے انھوں نے بار بار پیش کیا۔ بزرگ

خود وہی تھے۔“

میں بے اختیار بول اٹھا ”نہیں..... نہیں ایسا

نہیں..... اشفاق نے ہر انسان کے اندر اس صوتی کو

محسوس کیا اور پہچان لیا جو ذرا سی محنت و کوشش سے ترقی

پاکر اعلیٰ مدارج طے کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اشفاق

احمد کا صوتی تو ہر انسان ہے۔“ میں رو میں بولنے

بولتے چپ ہوا تو تینوں خاموش ہو گئے۔ بکا ہو کر مجھے گھور

رہے تھے..... میں مسکرا کر اٹھ آیا۔

☆☆

یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ اب وہ تین کی محفل

قصہ چہار درویش بن چکی اور یہ بھی کہ اب کوئی کتاب

میری دسترس سے دور نہیں۔ ہاں یہ بتانا ضروری ہے

کہ الفاظ سے دور بھاگتے والے کو کتابوں اور لفظوں

نے آج اس قابل بنادیا کہ آپ مجھ خاکسار کا یہ لکھا

پڑھ رہے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ 218

اگست 2014ء

سچا واقعہ

انسان کی بے وقوفی کا شاخصانہ

ایسا جانور ہے جس کے تعلق ہمارے
ریچھ میں کئی دقانیوسی باتیں اور
روایات پھیلی ہوئی ہیں۔ پاک بھارت
میں اکثر بڑے بڑے نوجوان لڑکیوں کو ریچھ کا تماشا
دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ ریچھ
لڑکیوں پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ خواب میں مارنے یا
کسی طویل بیماری میں مبتلا ہوتے واسے بچوں کو ریچھ
سے گلے ملوایا جاتا تھا۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ ریچھ
سے گلے ملنے پر بچوں کے دل میں چھپا خوف فوراً مٹ
ہو جاتا ہے اور انہیں کس طویل بیماری میں مبتلا ہوں،
تو اب کیمرہ دور ہو جاتی ہے۔

میرے والد کا بچپن المیرا بن سندھ میں گزرا ہے۔
اوتھاتے ہیں کہ بچپن میں اکثر خواب میں مار جایا کرتے

ریچھنی کا حملہ

تو ہم پرست والدین کا ایسے
جنہوں نے چہیتے بیٹے کو اپنی جہالت
کی بھیئت چڑھا دیا۔

فرحان داہتہ



219 اردو ناٹک

انگھیلیاں کرتے دیکھ کر خوشی سے تالیاں بھانے لگتے تھے۔ البتہ سب سے زیادہ خوش بلاشبہ ننھے ریچھ کی ماں ہی دکھائی دیتی جسے طویل انتظار کے بعد یہ ننھا منا ننھا ملا تھا۔ ”چلو بچو، اب میس کھڑے رہنے کا ارادہ ہے یا چڑیا گھر کی سیر کی جائے۔“ ہم بچوں کو وہیں چنبرے سے چپکا دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”ماموں بس تھوڑی دیر اور، دیکھیے تو ریچھ کا بچہ کیسے مستیاں کر رہا ہے۔“ ہم بچوں کی توجہ اور انہماک دیکھ کر مسکرائے۔

حمیدہ مچھن میں دھوپ سینکتے ہوئے ننھے مے سونیر بننے میں مصروف تھی۔ اسی دوران اسے پیٹ میں درد محسوس ہوا۔ وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔ ”تیرے اما سے رات کہا بھی تھا کہ دکان سے واپسی پر ڈاکٹر سے دوا لیتے آنا، پر ہال ہے جو کبھی میرا کہا کوئی کام انہیں یاد رہے۔“

حمیدہ کی ماں نے ہاورچی خانے سے آواز لگائی۔ ”کوئی بات نہیں اماں، ابھی دو دن کی خوراک باقی ہے۔ تم نے خواجواہ انہیں دوبارہ بھیج دیا۔ دوا تو کل بھی آسکتی تھی۔“ حمیدہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے ہماری اکلوتی بیٹی کی پہلی پہلی خوشی ہے۔ ان کاموں میں احتیاط برتنا تو ضروری ہے نا۔ بس اللہ کرے، یہ تمام اہمیت خیریت سے گزرے۔ تیرا بچہ پیدا ہونے کے بعد میں داتا دربار جا کر زردے کی دیکس چڑھاؤں گی۔“ زینت بی بی نے پیار سے حمیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

حمیدہ، زینت بی بی اور اللہ رکھا کی اکلوتی اولاد تھی۔ دو سال قبل اس کی شادی برادری ہی کے ایک لڑکے اجمل سے ہوئی۔ یہ گھرانے خاص خوشحال تو نہ

تھے۔ ایک دن ان کے علاقے میں مداری ریچھ کا تماشہ دکھارہا تھا۔ دادا جان نے انہیں ساتھ لیا اور مداری سے کہہ کر کو ریچھ سے گلے ملوایا۔ اس دن کے بعد واقعی انہیں کبھی خواب میں ڈرنے کی شکایت نہ ہوئی۔

خیر تھے کہانیاں خواہ کتنا ہی طویل عرصہ زندہ رہیں، یہ بات مسلم ہے کہ ان تمام باتوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ حیرت اسی بات پہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی ایسی بے تکی باتوں پر من و عن یقین رکھتے ہیں۔ میں آج جو واقعہ سنانے جا رہا ہوں، وہ بھی چنبرے میں قید ریچھنی کی کہانی ہے جسے ہم نے کئی بار بہت قریب سے دیکھا۔

یہ سن ۱۹۹۸ء کے اواخر کی بات ہے، ہم تمام رشتے دار بچوں کو لاہور چلے پا گھر کی سیر کرانے نکلے۔ ابھی بچے ہرن کو کٹی کھانے ہی میں مصروف تھے کہ ننھا ننھا بولا ”ماموں، وہ دیکھیے ریچھ کے چنبرے کے باہر کتنی بھیڑ لگی ہے۔“ اگلے ہی لمحے ننھی اقرا چلائی، ماموں وہ دیکھیں چنبرے میں ریچھ کا چھوٹا سا بچہ۔ واقعی سیاہ ریچھنی کے چنبرے کے باہر بچوں کی خوب بھیڑ تھی۔ وجہ یہ کہ چند ہی دن قبل ریچھنی کا ایک ننھا منا بچہ دنیا میں آیا تھا۔ تمام بچوں نے ہرن کے چنبرے سے توجہ ہٹائی اور ریچھنی کے چنبرے کی جانب دوڑ لگا دی۔ ہم بھی بچوں کے پیچھے پیچھے چل دیے۔

ننھا ریچھ ڈھیر سارے بچوں کو آس پاس دیکھ کر خوب مستی سے ادھر ادھر اچھل رہا تھا۔ چنبرے کے باہر جمع بچوں کی بھیڑ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ بچے ریچھنی اور اس کے بچے کو کھیلتے اور

تھے البتہ سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ اجمل عام تحواریہ پر ایک کارخانے میں ملازم تھا جس میں کھینچ تان کر عزت سے گزارہ ہوئی جاتا۔ شادی کے دو سال بعد قدرت نے ان دونوں کو خوشی کی یہ نوید سنائی تھی۔ حمیدہ اب آخری ایام اپنے والدین کے گھر گزار رہی تھی جو سننے آنے والے مہمان کے شدت سے منتظر تھے۔

.....☆.....

یوں لگتا تھا کہ آج رچھنی کا جی بہت اداس ہے۔ اس کا بچہ چند ہفتوں پہلے خوب اچھل کود میں مصروف رہتا تھا لیکن چند دنوں سے اس نے شرارتیں خاصی کم کر دی تھیں۔ رچھنی اپنا کھانا ادھورا چھوڑ بچے کے پاس چلی آئی جو ایک کونے میں دیوار کے ساتھ لگا سوراٹا تھا۔ پنجرے کے باہر بچوں کا جھوم لگنا بند ہو چکا تھا۔ رچھنی نے پیار سے بیمار بچے کو سونگھا اور پھر اس کے جسم پر رہبان پھیرتے ہوئے پیار کا اظہار کرنے لگی۔ چڑیا گھر کی انتظامیہ ڈاکٹر سے رابطہ کر چکی تھی۔ آج یہ پہرہ ڈاکٹر کی آمد متوقع تھی۔

.....☆.....

”مبارک ہو افضل صاحب، اللہ نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔“ لیڈی ڈاکٹر نے رچہ خانے سے نکل کر پریشانی میں جھپٹے افضل کو خوشخبری سنائی۔ ”خالہ جان سنا آپ نے، ماشا اللہ بیٹا ہوا ہے۔“ افضل خوشی سے دوڑ بچ پر تھیں زینت بی بی کے پاس لپکا۔ ”یا اللہ تیرا شکر ہے، تو نے ہماری دعائیں سن لیں۔“ زینت بی بی نے دونوں ہاتھ چہرے پہ پھیرتے ہوئے رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ”مبارک ہو بیٹا، جاؤ اب فون کر کے حمیدہ کے اہل کو بھی اطلاع دے دو۔ ان سے کہنا دکان بند کر کے سیدھا اسپتال

آجائیں۔“ اس کا چہرہ خوشی سے جھگڑا رہا تھا۔ ”جی اچھا خالہ۔“ افضل کے قدم تیزی سے پی سی او کی جانب بڑھنے لگے۔ ”پورے پانچ کلو کا ٹوکرا لا کر سوتی چورلڈ تقسیم کروں گا اسپتال میں۔“ افضل سرسرت اور خوشی کا احساس لیے آنے والے حسین دنوں کے خواب دیکھنے لگا۔

.....☆.....

”ابو ابو یہ دیکھیے، رچھنی کے بچے کو کیا ہوا ہے۔“ ایک ننھا بچہ پنجرے کے قریب کھڑے ہو کر چلایا۔ ”بیٹا! رچھنی کا بچہ کچھ دن سے بیمار ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہ اسے جلدی اچھا کر دے۔“ باپ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ابو وہ بچہ تو شاید مر چکا۔ آپ میرے ساتھ چل کر دیکھیے۔“ بچہ اپنے باپ کا ہاتھ تھامے پنجرے کے قریب چلا آیا۔ ”وہ دیکھیے۔“ رچھنی بچے کو مسلسل ہلانے جلانے کی کوششوں میں مصروف تھی لیکن بچہ ساکت اور بے جان حالت میں زمین پر ڈبیر تھا۔ ”بچہ تو واقعی مر چکا۔“ اس کے ہونٹوں سے فقط چند الفاظ ادا ہوئے اور پھر قدم چڑیا گھر کے دفتر کی جانب بڑھنے لگے۔ ”سنبھلے، رچھنی کا بچہ مر چکا ہے۔“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے مدعا بیان کیا۔ ”کیا کہا آپ نے؟ لیکن ابھی صبح تک تو وہ زندہ تھا۔ کل سہ پہر ڈاکٹر اسے ٹیکا بھی لگا گیا تھا۔ میں آپ کے ساتھ چل کے معائنہ کرتا ہوں۔“ منتظم حیرت سے بولا۔ اب ان دونوں کا رخ رچھنی کے پنجرے کی جانب تھا جہاں بے تحاشا کھیاں بچے کے مردہ وجود پر مسلسل جھنجھٹا رہی تھیں۔

.....☆.....

بھی علیم ہانٹ آنا۔" زینت بی بی نے احتیاط سے رقم دوپٹے کے پلو سے باندھ لی اور بولی "ان شاء اللہ، پروردگار بہتری کرے گا۔"

.....

ایک ہفتے کی مسلسل کوششوں کے بعد منتظمین چڑیا گھر ریچھنی کے مردہ بچے کو بنجرے سے نکلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ ریچھنی کسی کو بھی مردہ بچے کے قریب آنے نہ دیتی۔ بعض لوگ یہ مناظر محض تفریح کی خاطر دیکھنے چلے آتے، جبکہ حساس طبیعت والے یہ دلگداز منظر دیکھ کر السوس کا اظہار کرتے تھے۔ رب تعالیٰ نے ماں کا رشتہ کس قدر پیارا، محبت اور بے حساب چاہت میں گندھی بولی مٹی سے بنایا ہے، چاہے وہ ایک انسان ہو، یا جانور۔

منتظمین بذات خود پریشان تھے کیونکہ گرمی کے باعث مردہ بچے کے جسم سے تعفن اٹھنے لگا تھا اور اسے بنجرے سے نکالنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ آخر کوئی سہیل نظر نہ آنے پر انہیں ریچھنی کو خوراک میں نشہ آور دوا ملا کر دینا پڑی، جس کے بعد مردہ بچے کو بنجرے سے نکالنا ممکن ہو گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد ریچھنی بنجرے میں دیر تک ادھر ادھر شلتی رہی۔ کبھی زمین کو جگہ جگہ سونگھنے لگتی، تو کبھی بنجرے کی سلاخوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی۔

اسی دوران ہم ایک بار چڑیا گھر گئے تو ریچھنی کے بنجرے کے قریب سے گزر ہوا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک بے چینی اور اضطراب میں مبتلا تھی۔ اس نے سلاخوں سے نکلنے کی بے سود کوششوں میں اپنا سر بھی ڈبھی کر لیا تھا۔ ریچھنی کی طبیعت میں بے چینی بڑھنے کے باعث اکثر اسے کھانے میں نشہ آور دوا

"اماں دیکھو تو، منے کی آنکھ سے ابھی تک پانی بہ رہا ہے۔ ڈاکٹر کی دوا کتنے ہی دنوں سے استعمال کر رہی ہوں مگر آنکھ کی خرابی ہے کہ دور ہی نہیں ہوتی۔" حمیدہ نے رومال سے اپنے بچے کی آنکھ سے پانی پونچھتے ہوئے ماں کو آگاہ کیا۔

"تجھے کہا تو تھا، ڈاکٹر کی دوائیاں چھوڑ اور حکیم جی سے سرمہ لے کر بچے کی آنکھ میں ڈال۔ مگر تجھے تو اس ڈاکٹر نے جانے کیا پٹی پڑھائی ہے کہ سرمے کا نام سن کر ہی بدک جاتی ہے۔" زینت بی بی باورچی خانے کا کام چھوڑ کر بچے کے قریب چلی آئی۔

"اماں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اتنی کم عمری میں بچوں کی آنکھ میں سرمہ ڈالنا ٹھیک نہیں، مگر اب سوچتی ہوں کہ دوا کے ساتھ ساتھ سرمہ بھی لگا دیا کروں۔ انگریزی دوائیوں کی وجہ سے تو منے کا پیٹ بھی مسلسل خراب رہنے لگا ہے۔" حمیدہ نے بے چارگی سے کہا تو زینت بی بی کو کچھ یاد سا آنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ منے کی صحت کی خاطر منت مانگ لی جائے۔ تجھے یاد ہے میں نے منت مانگی تھی کہ منے کی پیدائش کے بعد داتا داد بار پر زردے کی دیکیں چڑھاؤں گی مگر تیرے اماں کو وقت ملتا جب نا۔ کتنی دیر ہو گئی مجھے منت پوری کرنے میں۔ میرا دل تو اب انجانے دوسوں سے ڈول رہا ہے۔ میں کل ہی داتا دربار پر پلاؤ کی دیک چڑھاؤں گی۔"

زینت بی بی کی بات سن کر حمیدہ کے دل کو حوصلہ ملا مل گیا۔ "اماں تم ضرور جانتا، بلکہ یہ لو۔ یہ رقم میں نے فضل کے دیے ہوئے پیسوں میں سے بچا کر رکھی تھی۔ حضرت میاں میر کا عرس شروع ہونے کو ہے۔ تم ایسا کرنا، ان پیسوں سے میاں میر کے مزار پر

ملا کر دی جانے لگی مگر اس کے باوجود بھی اس کی طبیعت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی۔

..... ❦

چند ہی مہینوں میں حمیدہ کا بچہ سوکھ کر کاٹا ہو گیا۔ ڈاکٹر کی دوائیاں، حکیم کے سرے، مزاروں پر حاضر یاں..... سبھی سلسلے جاری تھے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مرنے کی صحت میں بہتری نہیں آئی۔ ایک آنکھ غائب خراب ہو چکی تھی۔ ”بی بی آپ میری بات مانیں بچے کو کسی بڑے اسپتال میں داخل کرو دیجیے۔ ہسپتال میں مناسب دیکھ بھال اور مکمل علاج کے بعد ہی کسی قسم کی بہتری کی توقع ہے۔ اب ان چھوٹی موٹی ادویہ کا سہارا لینا ٹھیک نہیں۔“

ڈاکٹر کی تفصیل بن کر حمیدہ کا دماغ چکرانے لگا۔ مہینوں علاج کرانے کے بعد اب اسپتال میں علاج کے لیے کوئی رقم بچی ہی کہاں تھی؟ سب کچھ تو بچے کے علاج پر لگ چکا تھا۔ اب تو روزانہ کی دوا دارو کا بندوبست کرنے کے لیے بھی اسے اپنے ہاں باپ کے آگے ہاتھ پھیلاتا پڑتا۔ افضل کی لگی بندھی تنخواہ تو علاج کے لیے یوں بھی ناکافی تھی۔ کیا کروں؟ کہاں نہ کروں؟ حمیدہ اسی شش و پنج میں مبتلا گھر چلی آئی۔ مہنگی دوائیاں خریدتے خریدتے تو کانوں کی ہالیاں تک بک چکی ہیں۔ مرنے کے دودھ کا خرچہ بھی بمشکل پورا ہوتا ہے۔ اسپتال کا مہنگا علاج کہاں سے پورا ہو گا؟ ”ہائے میرے دے، ایسی قسمت لیے ہم کہاں جائیں؟“

شام کو افضل واپس گھر آیا تو اسے حمیدہ اسی طرح پریشان ملی۔ ”ڈاکٹر کہتے ہیں اب چھوٹے موٹے علاج سے کچھ نہیں ہو گا۔ بچے کی جان بچانی ہے تو کسی بڑے اسپتال میں داخل کرانا ہو گا۔“ افضل نے یہ سنا تو سر

تھام کے رہ گیا۔

”مگر ساری تنخواہ تو دس دن میں ہی خرچ ہو چکی ہے۔ اب تو گھر کے خرچے کے لیے بھی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ مرنے کو اسپتال کیسے داخل کرائیں گے؟“ افضل کو اپنی ہانگوں میں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

حمیدہ اس کی حالت دیکھتے ہوئے فوراً ایک گلاس پانی لائی اور اس کی ذل چوٹی میں مصروف ہو گئی۔ ”تم فکر کیوں کرتے ہو؟ جس پروردگار نے اس بچے کو دنیا میں بھیجا ہے، وہی علاج کی کوئی نہ کوئی سہیل پیدا کر دے گا۔“ مرنے کو چٹکھوڑے میں ڈال کر وہ افضل کو تسلیاں دینے لگی، جبکہ امدادی انداز میں کالپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

..... ❦

”حمیدہ! ایک بات کہوں۔“ افضل نے کچھ سوچتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

”ہاں کہو، سن رہی ہوں۔“ حمیدہ نے مرنے کو سنانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”حمیدہ! کیا تو نے اپنے اماں پادا سے ریچھ کی بابت کہانیاں سن رکھی ہیں؟“

حمیدہ کو یہ سوال کچھ عجیب سا لگا۔ ہاں سن تو رکھی ہیں، مگر تجھے یہ ریچھ کا خیال کہاں سے آ گیا؟“ حمیدہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

”حمیدہ وہ میں کہنا چاہ رہا تھا..... افضل شاید مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔“

”اب بول بھی دو کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ میرے پاس کوئی لمبی چوڑی کہانی سننے کا وقت نہیں ہے۔“ بچے کی طویل بیماری اور پریشانیوں نے ہر وقت خوش رہنے والی حمیدہ کو قدرے چڑا بنا دیا تھا۔

”وہ دراصل مجھے کارخانے میں غلور مشورہ دے رہا ہے کہ بچوں پر بد اثرات ریچھ کے ذریعے دور کیے جا سکتے ہیں۔ تو نے سن تو رکھا ہوگا ہڑے پوزھوں سے کہ بچوں کا خوف اور بیماریاں ریچھ سے گلے ملنے پر دور ہو جاتی ہیں۔“ افضل نے اصل مدعا بیان کیا۔

حمیدہ کچھ دیر حیران لگا ہوں سے افضل کو گھورتی رہی۔ اور پھر بولی ”افضل کیا تو پڑھ لکھ کر بھی ایسی باتوں پر یقین رکھتا ہے؟ میں اتنی پڑھی لکھی تو نہیں، پر اتنا تو سمجھتی ہوں کہ ان پرانے قصے کہانیوں میں کوئی سچائی نہیں۔ مگر تو تو پھر آنکھیں پاس ہے.....“ حمیدہ کا گلہ رندہ گیا۔

”دیکھ حمیدہ، اپنے بچے کی صحت یا بلی کی خاطر ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ڈاکٹر کی دوائیاں، حکیموں کی پڑیاں، مزاروں پر حاضر یاں، منیں اور چڑھاوے سب کچھ ہی تو کر کے دیکھ چکے۔ دوا دارو سے لے کر دم درد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب یہ ایک آخری سہیل نظر آتی ہے۔ ورنہ اسپتال کے بستے علاج کے لیے پیسا کہاں ہے ہمارے پاس؟“ افضل نے مایوسی سے سر تھام لیا۔

”جو کچھ بھی ہو، مگر ایک معصوم بچے کو ریچھ سے گلے ملوانا..... اگر ریچھ نے منے کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو؟ تو کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا افضل۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟“ حمیدہ چلائی۔

”ہاں پاگل ہو چکا ہوں میں، اس کا علاج کراتے کراتے پاگل ہو گیا ہوں۔ ڈاکٹر، حکیم، مزار..... ہر جگہ کے چکر کاٹ کاٹ کر سب جمع پونجی لٹا چکا ہوں، مگر اس کی بیماری ہے کہ شتم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ پانی پانی کو محتاج ہو چکے ہیں ہم۔ اور اب تو ٹھیکیدار مزید تنخواہ پیشگی

دینے سے بھی انکار کر چکا۔ اب ہمارے پاس دوا ہی راستے ہیں۔ یا تو اس بچے کو بیماری سے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھتے رہیں یا پھر یہ آخری راستہ اختیار کریں۔“ افضل غصے کے عالم میں کمرے سے نکل چھت پر جا بیٹھا اور پھر خود ہی اپنی بے چارگی پر آنسو بہاتے ہوئے گھٹنوں میں سر دے روئے لگا۔

اچانک اسے اپنے کندھے پر کسی ہاتھ کے لطیف لمس کا احساس ہوا۔ مڑ کے دیکھا تو حمیدہ کھڑی تھی۔ منے کی صحت یا بلی کی خاطر ہم یہ آخری راستہ بھی ضرور اپنائیں گے افضل۔ کیا معلوم اسی وسیلے سے ہمارے منے کو صحت مل جائے۔“ افضل ایک تک حمیدہ کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر دونوں ہی ایک دوسرے کے گلے لگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

☆.....

آج ۲۱ نومبر ۱۹۹۹ء کا دن تھا۔ حمیدہ صبح اپنے بچے کو تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ”جلدی کر، ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے۔ اتوار کا دن ہے، کہیں لوگوں کا زیادہ رش نہ لگ جائے۔“ حمیدہ اور افضل جلدی سے تیار ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ نو بجے کا وقت تھا۔ چڑیا گھر میں لوگ خال خال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں ریچھ کے پتھرے کے قریب چلے آئے۔

”اچھی طرح دیکھ لے نیک بخت، کوئی اس پاس دکھائی تو نہیں دے رہا۔“ افضل نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے یوں سے سوال کیا۔

”اس طرف تو کوئی بھی نہیں۔“ حمیدہ کا جی بری طرح گھبرا رہا تھا۔

”لاٹنا میری گود میں دے۔“ افضل نے بچے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ حمیدہ نے ایک نظر

چڑیا گھر کی پاگل ریچھنی نے ایک معصوم بچے کی جان لے لی۔ لی وی رپورٹروں کا افضل کے گھر تاشا بندھ گیا۔ حمیدہ روتے روتے میڈیا والوں کو واقعات کی تفصیل بتاتی اور کبھی پچائیس کھاتے کھاتے بے ہوش ہو جاتی۔

”آخر چڑیا گھر والوں نے کیوں پال رکھا ہے اس ریچھنی کو؟ مار ڈالیے اس ریچھنی کو جس نے میری گود اجاڑ دی۔ گولی مار دیجیے اسے جس نے میرے بچے کو ہلاک کر دیا۔ کٹڑے کٹڑے کر دیں اس ریچھنی کے جس نے میرے لال کے کٹڑے کر دیے۔“ لوگ یہ سوگوار واقعہ سن کر المیوں کا اظہار کرتے نکلے۔

اس دوران میں ایک دن تجتس کے مارے چڑیا گھر پہنچا۔ ریچھنی کے پنجرے پر ملاخوں کے ساتھ ہارک جالیاں لگا دی گئی تھیں۔ ایک تختی پر یہ عبارت کندہ تھی: ”جانور خطرناک ہے، براہ مہربانی قاصد نہ بھیجئے۔“ ریچھنی کا سر ابھی تک ذخی تھا۔ وہ پنجرے میں ادھر ادھر بے چینی سے منڈلا رہی تھی۔ میں واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ قریب ہی ایک فربہ اندام خاتون کو چڑیا گھر کے ایک ملازم سے بحث و مباحثہ کرتے دیکھا۔

خاتون اپنی وضع قطع سے کسی این جی او کی سرگرم رکن دکھائی دیتی تھی۔ میں تجتس کے عالم میں کچھ قریب چلا آیا۔ ”میں نے پچھلے ہفتے بھی درخواست جمع کرائی تھی کہ اس پاگل ریچھنی کا جلد سے جلد کوئی بندوبست کرایا جائے۔ آخر ایک پاگل ریچھنی کو مارنے میں آپ کی انتظامیہ کو کیا تباہت ہے؟“ خاتون کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کافی عرصے سے اسی سلسلے میں مگن ہے۔

”دیکھیے بی بی میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا کہ یہ ریچھنی دماغی طور پر تندرست ہے۔ پھر حکام کے آرڈر کے بغیر ہم کوئی کارروائی کرنے سے معذور ہیں۔ آپ

افضل کے پراعتماد چہرے کی جانب دیکھا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ بچہ اس کے حوالے کر دیا۔

پنجرے میں بند ریچھنی کی نظر انھی دونوں پر لگی تھی۔ افضل بچے کو کندھوں سے اٹھا کر پنجرے کے قریب لانے لگا۔ ریچھنی کی تمام تر توجہ اب افضل کے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے بچے پر مرکوز تھی۔ اس کے بچے کو مرے کئی ماہ بیت چکے تھے۔ آج خاصے ماہ بعد وہ پہلی بار اتنے کم عمر بچے کو پنجرے کی سلاخوں کے قریب دیکھ رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سلاخوں کے قریب چلی آئی۔

ریچھنی کو سلاخوں کے اس قدر نزدیک دیکھ کر لمحہ بھر کو افضل کا دل بھی گھبرانے لگا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ دل کڑا کر بچے کو سلاخوں کے بالکل ساتھ لگائے کھڑا ہو گیا۔

بچے کا جسم اب تھوڑا تھوڑا ریچھنی کے جسم سے مس ہونے لگا تھا۔ ریچھنی چند لمحے بچے کو سوتھیتی رہی اور پھر اگلے ہی لمحے لٹھا میں حمیدہ کی جنہیں بلند ہونے لگی۔ ریچھنی نے اگلے دونوں پنچوں سے بچے کو دبوچ لیا تھا۔ چیخ پکار مگر انتظامیہ کے کئی لوگ وہاں دوڑے چلے آئے۔

اس دوران افضل بچے کو ریچھنی کے پنچوں سے چھڑانے کے لیے اپنی جانب کھینچنے لگا۔ حمیدہ نے ریچھنی کے پنجے اپنے بیٹے کے جسم میں گڑے دیکھے، تو شش کھا کر گر پڑی۔ اگلے ہی لمحے معصوم بچے کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ بچے کا اوپری جسم افضل کے ہاتھوں میں تھا، جبکہ دھڑ ریچھنی نے پنجرے کے اندر لٹھچ لیا۔ فرش پر جگہ جگہ بچے کا خون پھیل گیا۔

.....

اخبارات اور ٹی وی چینلوں نے اس خبر کو خوب اچھالا۔ ہر اخبار کی سرخیاں یہی خبر لیے ہوئے تھیں کہ

براہ مہربانی ہماری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“

ملازم کے اس جواب پر وہ مطمئن نہ ہوئی۔ مجھے دیکھتے میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر آپ لوگ جان بوجھ کر مجھے مال رہے ہیں تو پھر مجھے اوپر تک ہات کرنا ہوگی۔“ میں اس دوران خاتون کے قریب چلا آیا اور بولا ”محترمہ! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کچھ عرض کروں؟“ خاتون نے پلٹ کر میری جانب انجمن نظروں سے دیکھا۔ ”جی فرمائیے۔“

دیکھتے محترمہ، آپ کی طرح مجھے بھی مرنے والے بچے کی موت کا افسوس ہے اور اس کے والدین سے بھرپور بھی۔ لیکن جہاں تک اس ریچھنی کا تعلق ہے، تو بلاشبہ وہ بے قصور ہے۔ آپ اس کیس میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کیجئے۔

خاتون نے حیرت سے میرا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ میں اس دوران جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ خاتون کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ ”ایک منٹ مسٹر، کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ ہیں کون؟ اور کس سلسلے میں ایک پانگل اور خونخوار جانور کو بے قصور ثابت کر رہے ہیں۔ آپ نے شاید پہچانا نہیں میں ”چلڈرن ویلفیئر“ اور ”ویمین رائٹس“ کی تنظیموں سے وابستہ ہوں۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ ایک معصوم بچے کی موت اور اس کی غمزہ ماں کے سلسلے میں ہماری این جی او کیا کچھ کر سکتی ہے۔“

خاتون کی وضاحت سے میں مطلق متاثر نہ ہوا۔ ”خاتون، اگر آپ کی این جی او کو کچھ کرنے کا شوق ہے تو سب سے پہلے ہمارے پسماندہ طبقے کو تعلیم پانے بنائیے جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جہالت اور فرسودہ توہمات پر یقین رکھتا ہے۔ اگر آپ لوگ کچھ کرنا

ہی چاہتے ہیں تو ان غریب اور نادار لوگوں کے واسطے زکوٰۃ فنڈز قائم کریں جو اپنے بیمار بچوں کے علاج کے لیے مہنگے اسپتالوں کے خرچے اٹھانے کے قابل نہیں۔ اگر آپ کی خود ساختہ تنظیمیں مستقبل میں ایسے واقعات کو روکنا چاہتی ہیں تو سب سے پہلے ناخواندہ اور غریب طبقے کو غربت اور جہالت کے اندھیروں سے نکالیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ پھر کبھی ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوگا۔ پھر بھی آپ کی تنظیم اپنے ملوث اقدام سے باز نہ آئی تو پھر مجھے بھی خیالات کی تنظیموں سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ ہم بھی اس ہنجرے کے باہر دھرنا مار کے بیٹھ جائیں گے لیکن ایک بے قصور جانور کو آپ لوگوں کی پبلسٹی کا ذریعہ بننے نہیں دیں گے۔“

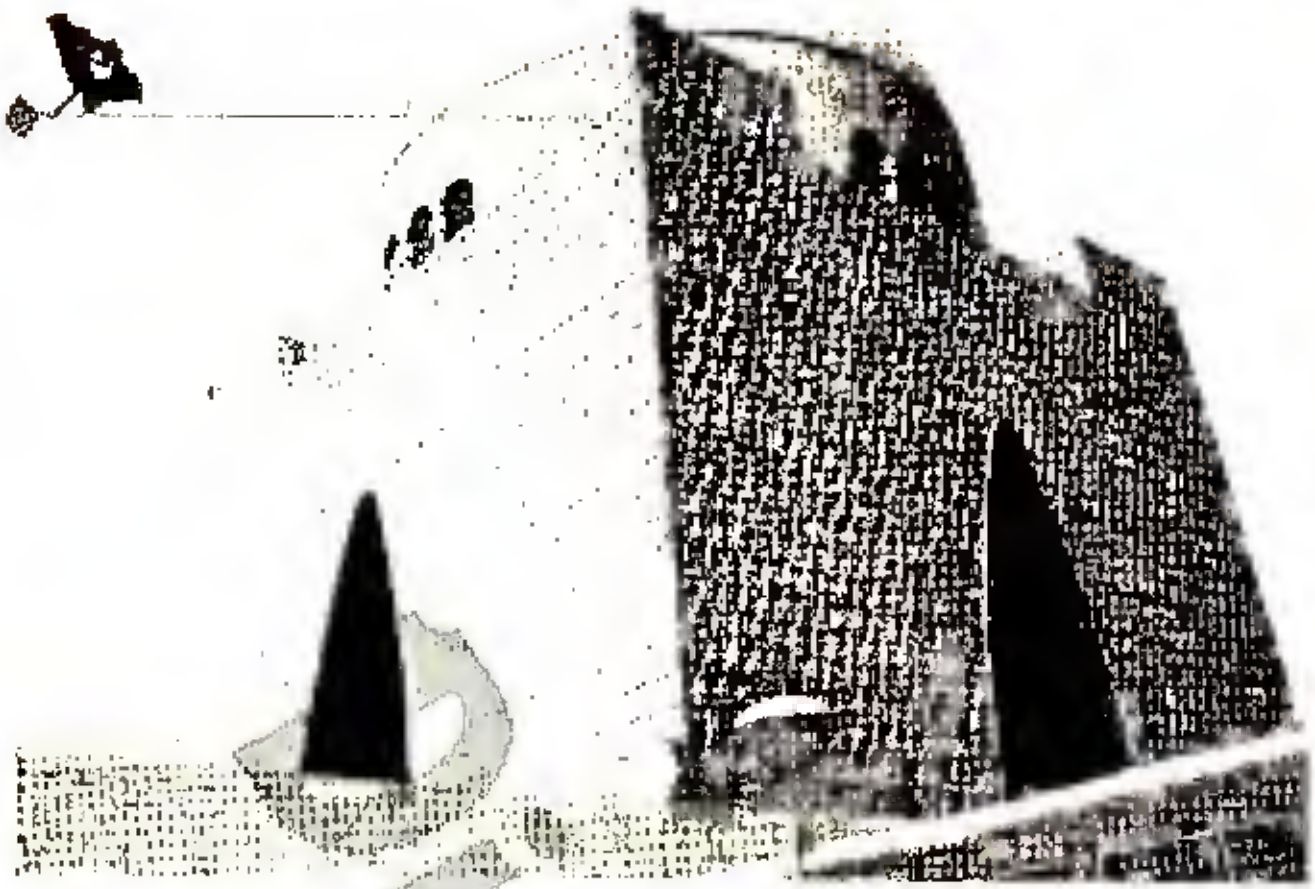
خاتون کے پاس میری کسی بھی بات کا کوئی جواب نہ تھا، چناں چہ وہ پاؤں تلخے دہاں سے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس واقعہ کو کئی ماہ بیت چکے تھے۔ اس دوران بچوں کی گریبوں کی چھٹیوں میں انہیں چڑیا گھر گھمانے کا پروگرام بنا۔ ننھی اقراب خاصی سمجھدار ہو چکی تھی۔ ریچھنی والے ہنجرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے قدم وہیں ختم ہوئے۔ ”ماموں، کچھ عرصہ پہلے تک کتنی ہی تنظیمیں اخباروں میں بیان دیتی تھیں کہ معصوم بچے کی قاتل ریچھنی کو گولی مار دی جائے گی۔ لیکن پھر انہیں کامیابی کیوں نہ ملی؟“

میں نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا شپٹھایا اور اور کہا ”اس لیے بیٹا کیونکہ یہ ریچھنی بے قصور تھی۔“ بچوں نے ہنسنے بھری نظر ہنجرے میں بند ریچھنی پر ڈالی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اُسے الوداعہ کہتے کرتے آگے بڑھ گئے۔





دعا بر مزار قائد

مرے راہنما میرے قائد وہ ہم تھے

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

قلمی کی راہوں میں اک دن

صد پر تری خواب غفلت سے بیدار ہو کر

نئے جوش و جذبہ سے سرشار ہو کر

تری خوش بختیں راہنمائی میں تازہ سفر

حوادث سے پر رگد پر

سروں سے کفن ہاندھ کر چل پڑے تھے

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

مرے راہنما میرے قائد وہ ہم تھے کہ جن کو

زوال شب مغلیہ سلطنت پر

نئی صبح کے حکمرانوں نے

چریک لمحوں کی خندق میں دفن دیا تھا

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

مرے راہنما میرے قائد وہ ہم تھے

جو اغیار کی سازشوں کے تسلسل میں اپنی

جہاں گیر تارن سے کٹ گئے تھے

ہمارا عقیدہ ہماری کتاب مقدس

ہماری زبانیں ایک تھی اور خانوں میں ہم بٹ گئے تھے

مرے راہنما میرے قائد

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

جنہیں تو نے قوت دی اور بھیں بھی

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

جنہیں متحد اور صف بستہ کر کے

مقابل کیا دشمنان وفا کے

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

جنہیں تو نے حکمت سے اپنی

سکستے ہوئے سرد لمحوں کے زلداں سے باہر نکالا

نئی اک بساط سیاست بچائی

بدلتے ہوئے سلسلوں میں مقاصد کی مشعل جلائی

نجات کے اندھے کنویں سے نکالا

وہ ہم تھے وہ ہم تھے

جنہیں تو نے رمز قیادت سکھائے

بھائے ہوئے سبق یاد پھر سے دلانے

عقیدے کی بنیاد پر ملک و ملت کا ہم کو تصور دیا
اور ایسی لڑی میں پرویا

جسے قوم کہتے ہیں سب صاحبان سیاست
میرے راہنما میرے قائد

پھر اس قوم کو اک علیحدہ وطن کی حدیث مبارک سنا کر
نئی ایک حد و جہد پر لگایا

تکلم کی سرحد پہ تعبیر کے بختر خواب اقبال کو
اک حقیقت میں تہدیل کر کے

بظاہر جو ممکن نہیں تھا اسے عین ممکن بنایا
ہمارے دلوں میں ترقی کا بے مثل ایقان پیدا کیا

اور منزل کی جانب بڑھایا
فرقی خداؤں کے دل پر تہہ کا سکہ جمایا

مسلل تکالیف سے کروطن اک بنایا
پس خاتمہ جبر کی سلطنت پر نئی فاتحانہ نصا میں

روایات اسلاف کا پھر سے ولادت بنایا
وہ ہم تھے وہ ہم تھے

مرے راہنما میرے قائد وہ ہم تھے
جنہیں تو نے تازہ تناظر میں

دائم حکومت چلانے کے طور پر لیتے سکھائے
تماشائے بیم ورجا میں

تصادم کے خدشات نا آشنا میں
کلید محبت سے قفل کدورت کو کھولا

وہ ہم تھے کہ جن کے دلوں میں
خمن سے نیا سب قومی جگایا

تدبیر و تفکر و تعقل کے افلاک روشن کیے
اور اتوہم عالم میں ہم کو تفرز کی مسند دلائی

ہماری زیاں دیدہ آنکھوں کو اک فجر نور سے سجایا
وہ ہم تھے وہ ہم تھے

مرے راہنما میرے قائد وہ ہم تھے

جنہیں تو نے آزاد شہری بنایا
مگر میرے قائد وہ ہم ہیں

وہ ہم ہیں کہ اک پار پھر سے
سبق سب بھلا کر

تصور یک قومیت ترک کر کے
اخوت کے معنی فراموش کر کے

تذبذب تعصب تشدد و تسال
کے پاتال میں گمراہ گئے ہیں

وہ ہم ہیں اور ہم ہیں
وہ ہم ہیں کہ ماضی سے منہ موڑ کر

آج فرلا کے خدشات میں گھر گئے ہیں
مرے راہنما میرے قائد

مرا جو خدا ہے
جو ہم سب کا واحد خدا ہے

اُسی ایک دائم خدا سے
رسول دو عالم کے صدقے

مزار مشور پہ تیرے
میں اب دعا ہے

کہ بس..... کرو گارا
ہماری خطاؤں سے اب درگزر کر

بدل دے ہمارے ہزیمت سے لبریز دن رات اور پھر
ہمیں گمشدہ حرف تہ پیر و حکمت عطا کر

نئے دلوں اور تازہ شعور و رفاقت عطا کر
کہ ہم آج ظلمات کے تہ نشیں ہیں

بہت بے یقین ہیں
بظاہر تو زندہ ہیں لیکن

حقیقت میں زندہ نہیں ہیں
ہمارے دلوں کو سب قومی سے بھر دے

ہمیں پھر سے اک پار تو زندہ کر دے

جوانی کے کاغذ : مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

تصویر کوثر 2۔ (الف) 10 مارچ 1873ء، رام پور (ب) 28 نومبر 1914ء، نور علی میں حرکت عقب بندہ ہو جانے کی وجہ سے

قصہ کوثر 3۔ (الف) 1920، مکتب (ب) 24 جولائی 1986ء، شباب نامہ، سرخسیت

باب قبہ محمود (راد پندی)، محبوب شاہ (ملتان)، اعلیٰ قریشی (راد پندی)، سرین جیش (پکوال)، ڈاکٹر دوست عرفان (کراچی)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، محمد جمیل چودھری (جنیم)، منیر احمد (حیدر آباد)، ولی حسین (حیدر آباد)، آصف عزیز (حیدر آباد)، عبدالستار (حیدر آباد)، محمد احمد (کراچی)، مظہر حسین (حیدر آباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدر آباد)، عبدالغفور (حیدر آباد)، منظر احمد بھٹی (لواب شاہ)، مصباح الرحمن خاں رشید (گوجرانوالہ)، محمد یوسف قاضی (ملتان)، محمد عبدالرحمن خان (ملتان)، پرویز خان (پشاور)، عزیز الرحمن قاری (شیخوپورہ)، طاہر عنایت (پشاور)، بشارت جودون (راد پندی)، حسام ظفر (راد پندی)، سعد سلیم (راد پندی)، ایفان اکرم (میرپور)، محمد تقی عباس (شیخوپورہ)، محمود منور خان (سرگودھا)، یونس دود (مری پور)، جرمیہ فیوم (پشاور)۔

یہی ہے اس کو نیک کا واسطہ مقصد

انجام کوئے
علاء مہربان

پیر ۱۰

قصہ گو

دور مت جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

آپ کو G مادیک فورملا آئے
کے بارے میں سوچیں گے

- شایقہ محمود (راولپنڈی)
- جویریہ قیوم (پشاور)

قرعہ الخازی میں
جنتوں والوں کی نام

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام، پتہ اور سواکس پانی کی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔

اس کے بغیر کوریج بروی کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچے گا۔ (ایڈیٹر)

اردو انجمن 229

قصہ کوئٹا

احمد فراز کو شاعری وراثت میں ملی۔ آپ کے والد سید محمد شاہ برقی اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ اردو اور فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ابھی ایڈورڈز کالج پشاور میں زیر تعلیم تھے کہ یو پاکستان کے لیے فوج لکھنا شروع کیا۔ لی۔ اے میں تھے کہ پہلا مجموعہ کلام تجاہل شائع ہوا۔ تکمیل تعلیم کے بعد ریڈیو سے عہدہ منقطع کر کے یونیورسٹی میں لکچرار مامور ہوئے۔ ملازمت کے دوران میں دوسرا مجموعہ "دور آشوب" چھپا جس پر آدم جی لدنی ایڈورڈ ملا۔ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد پاکستان نیشنل سنٹر پشاور کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ 1976ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کے پہلے سربراہ مامور ہوئے۔ پھر جب جنرل ضیا الحق کا مارشل لا لگا تو سیاسی وجوہ سے جلا وطنی اختیار کرنا پڑی۔ احمد فراز نے فریل اور نظم دونوں اصناف میں پرانے استعاروں اور تشبیہوں میں جدید رنگ پیدا کیا۔

(1) احمد فراز کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(2) ان کے کوئی سے دو شعری مجموعوں کا نام بتائیں؟

قصہ کوئٹا 2

اختر شیرانی نامور محقق، پروفیسر محمود خان شیرانی کے فرزند تھے۔ 1905ء میں لونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ بیشتر زندگی لاہور میں بسر ہوئی۔ اختر کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ نثری کلام کا امتحان پاس کیا، لیکن والد کی کوشش کے باوجود کوئی اور امتحان پاس نہ کر سکے۔ رسالہ "نہالوں" اور سیکل کی ادارت کے بعد اپنا رسالہ انتخاب، پھر بہارستان، پھر خیالستان اور پھر رومان جاری کیا۔ کچھ عرصہ ماہنامہ "شاہکار" کی بھی ادارت کی۔ 1937ء میں اردو کی معروف لغت "جامع اللغات" کے ادارتی امور انجام دیے۔ اردو شاعری میں اختر پہلا رومانی شاعر ہے جس نے اپنی

شاعری میں عورت سے خطاب کیا۔ آپ کا کلام عشق مجازی کے لطیف جذبات اور جد انگیز فنائیت سے معمور ہے۔ قزلب نے موسیقی کے ساتھ مل کر غزلوں، نظمیں اور گیتوں میں ایک انفرادی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ پسند ذرا سے بھی لکھے ہیں جن میں "نمناک" زیادہ مشہور ہے۔ شاعری کے مجموعے یہ ہیں: صبح بہار، اخترستان، لال طور، طیر آوارہ، نغمہ حرم اور پھولوں کے گیت۔ آپ کا انتقال عین اس روز ہوا جب لوگ قائد اعظم کی وفات کے سوگ میں تھے یعنی 11 ستمبر 1948ء۔

(1) اختر شیرانی کا اصل نام کیا تھا؟

(2) ان کے کوئی سے دو شعری مجموعوں کا نام بتائیں؟

قصہ کوئٹا 3

امجد اسلام امجد شاعر، ادیب، ڈراما نویس، معلم۔ والد کا نام محمد اسلام، 1967ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فہرست ادبیات میں ایم۔ اے (اردو) کی ڈگری ملی۔ آپ شعر و ادب کی تخلیق سے وابستہ رہنے کے باوجود مجلسی آدمی ہیں۔ آپ کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اب تک سب سے شمار انعامات و اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں۔ 1987ء میں صدر پاکستان کی جانب سے "حسن کارکردگی" کا اعزاز ملا۔ مجموعہ کلام "نثار" پر نیشنل بھری ایوارڈ 1403ھ دیا گیا۔ لی وی میریج "وارث" پر خصوصی صدارتی ایوارڈ ملا۔ علاوہ ان میں نگار ایوارڈ، ایکٹا ایوارڈ اور مختلف انجمنوں اور اداروں کی جانب سے پچاس سے زائد ایوارڈ مل چکے ہیں۔ آپ پنجاب کونسل آف آرٹس، فلم سنٹر بورڈ، انکوار آرٹس کونسل، کینیڈا رائٹر فنڈ حکومت پنجاب میں مجلس ترقی ادب کے رکن ہیں۔

(1) امجد اسلام امجد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(2) ان کے کوئی سے دو شعری مجموعوں کا نام بتائیں؟

خوبصورت اور معیاری کتب کم قیمت اعلیٰ معیار

042-35434909

042-35425356

منصورہ، ملتان، راولپنڈی، لاہور

منشورات

اطلاعات کے لیے تعاون

اگست 2014ء

اردو ڈائجسٹ 230

زندگی کی سب سے قیمتی چیز
اچھی کتاب ہے
زیادہ پڑھو اور نہیں

آئیے.....! کتابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریں

کتابوں کی کہکشاں

غلام سجاد

کتابوں پر تبصرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

پاکستان میں جن اصناف نے بطور خاص ترقی کی اور
ہنے لیے قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کر لیا ان میں مفرات
بھی شامل ہے اور یہاں نہ ہو کہ یوں گھر بیٹھے اچھی
ممالک کی سیر ہو جاتی ہے اور بدلتی تہذیبوں سے
تعارف بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی انداز کا
مفرات قرار دیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب: سیر جہاں، مصنف: فقیر اللہ خاں
صفحات: 256، قیمت: 500 روپے، ملے کا چم
بک ہوم، سٹریٹ 46، مرگ روڈ لاہور
فون: 042-37231518

جسوت سنگھ کو جوابات

فادق غلوں کی زیر تہجد تصنیف کی کتاب "جناح"
کے جواب میں ایسا ہی مکالمے جو لیاقت علی خاں نے
پاکستان کے مسلمانوں میں جوش و جذبہ پیدا کرنے کی
خاطر لہرایا تھا۔ فادق غلوں نے اسے آزاد وطن کے
شہریوں کو اپنے قلم پر نکلنے والے ناجائز اور غلط الزام کا
دفاع کرنے کی خاطر ہر وقت اور ہر موقع لہرایا۔

ہندوؤں کا شروع سے ویرہ رہا ہے کہ جو گندگی ان
کے اندر سمائی ہوئی ہے اس کا تمام تر الزام مسلمانوں پر

سیر جہاں

خوب صورت سرورق اکاذب اور پھپھائی کے ساتھ
ساتھ تحریر کی روانی سن کو ذوق بخاتی۔ کتاب ہاتھوں میں
لیتے وقت ارادہ ورق گرائی کا تھا، مگر کتاب نے تاشقند
پہنچا دیا۔ بس پھر کیا تھا تاشقند سے بخارا، خجرا، اشبول
کو الہپور، خیلا، ٹوکیو اور ہالی سے ہوتے ہوئے دنیا جہاں
کے سول شہروں کا جغرافیہ گھر بیٹھے ذہن میں نقش ہو گیا۔
مصنف نے سولہ شہروں کے نہ صرف دلکش مشاہدات
بلکہ تاریخ، ثقافت، سیاست، جغرافیہ غرض سب کچھ قاری
کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ مفرات اردو کی مقبول صنف
ہے۔ اردو سرنامے کی عمر قریباً 163 برس بنتی ہے۔



اردو ناٹک 231 اگست 2014ء

مضبوط کرنے کے لیے مختلف ادوار میں لوگوں نے مختلف ذرائع استعمال کیے۔ کبھی کھجور کے پتوں تو کبھی جانوروں کی کھالوں پر لکھ کر اپنے علم کو محفوظ کرنے کے تجربے کیے اور بہتر سے بہتر طریقے ایجاد کرنے میں لگا رہا۔ مگر ان ذرائع میں انقلاب تب آیا جب چین میں پہلے کاغذ اور بعد میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد ہوئی اور عیسائیوں سے صحافت کا باقاعدہ سفر شروع ہوا۔

ایسے یہ کہنا ہے جانہ ہو گا کہ جب حضرت آدم پہ پہلا صحیفہ نازل ہوا تو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا کیونکہ بہت سے دانشور و مفکرین و مورخین صحافت کو صحیفہ سے اخذ کرتے ہیں۔ (اکثر سلیم الرحمن خاں ندوی نے اس کتاب میں صحافت کی تاریخ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ انھوں نے صحیفہ سے شروع کیا اور صحافت کی موجودہ شکل و صورت تک آ کر اختتام کیا۔ کتاب میں مختلف محالک، قوموں اور سلسلوں کے علم کو آگے پھیلانے کے طریقوں سے لے کر کاغذ اور چھپائی کے احوال کے بعد برصغیر میں اسلامی صحافت سے متعلق مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے۔

برصغیر میں پہلے مجلہ سے لے کر تحریک آزادی اور پھر بھارت اور پاکستان میں صحافت کی موجودہ صورت حال اور اس دوران شائع ہونے والے تمام رسائل و اخبارات کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ یہ کتاب نہ صرف قدیم اور موجودہ دور کی صحافت سے متعلق بتاتی



تھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں اپنے ناجائز مقاصد پورے کرنے ہوں یا اپنی قوم کی ہمدردی بنورنی ہو، تو ان کے پاس نام نہاد لکھاریوں کی کمی نہیں۔

جسوت سنگھ نے جو بھارت کے وزیر خارجہ رہے ہیں، ”جناح“ لکھ کے ایک مرتبہ پھر پاکستان اور پاکستانیوں پر بے بنیاد اور من گھڑت الزامات کی بھرمار کر دی۔ مگر فاروق علوی نے جسوت سنگھ کو جوہات دے کر ان کی من گھڑت اور بے بنیاد باتوں کو ایسا باطل قرار دیا کہ ان کا بھرکس نکال دیا۔ صحیح معنوں میں اگر کہا جائے تو فاروق علوی نے ہندوؤں کو ”برہمن“ کر دیا۔ فاروق علوی نے ایک سچا اور محب وطن پاکستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر ہر مروجہ کے بہت سارے درواہوتے ہیں اور قاری ہندوؤں کی اصلیت سے روشناس ہوتا ہے۔

نام کتاب: جسوت سنگھ کو جوہات، مصنف: فاروق علوی، صفحات: 300، قیمت: 500 روپے
لکھنے کا پتہ: رولس پہلی کیشنرز ڈیفنس لاہور۔

فون: 4002564-0306

برصغیر میں اسلامی صحافت کی تاریخ اور ارتقا

صحافت آزادی رائے کا بہترین ذریعہ ہے۔ شروع ہی سے آدم زاد اپنے علم اور تجربے کو محفوظ رکھنے اور دوسروں تک پہنچانے کا متمنی رہا ہے۔ اپنے علم کو



اگست 2014ء

اردو ڈائجسٹ 232

ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ ریت بن چکی کہ بچوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے بات منوائی جائے، کام کرایا جائے اور ان کی خواہشات اور ضروریات کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ مگر جس خوف کو بچوں پہ مسلط کر کے ہم وقتی طور پر بچوں کو بہلانا پھسلانا چاہتے ہیں وہ ایسے زہر کے مانند بچوں کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ اکثر بچے ہر حیات اس فوبیا سے جان نہیں چھڑا پاتے۔ فوزیہ عباس نے اپنی کتاب میں خوف، اس کے اسباب، نتائج، اس سے بچاؤ کے ممکن طریقے اور سدباب خوب صورت انداز میں تحریر کیے ہیں۔

نام کتاب: بچوں میں خوف، مصنفہ فوزیہ عباس، صفحات: 96، قیمت: 150/-، ملنے کا پتہ: اکیڈمی بک سنٹر، ڈی-35، بلاک 5، فیڈرل بی ایریا کراچی۔
فون: 021-36809201

☆☆

مکالمات اقبال

زیر تبصرہ کتاب علامہ اقبالؒ کی زندگی کے سنہرے واقعات کا مجموعہ ہے۔ انھیں پروفیسر راشد سعید مرحوم نے بڑی عرق ریزی سے یہاں وہاں بکھرے ہوئے ملفوظات، خطوط تقاریری اور مقالات سے اکٹھا کیا ہے۔ ان سب جوہر پاروں کا مطالعہ کرنا اور پھر انھیں جن کر مرتب کرنا ایسا کام تھا جو بڑی ہمت اور دیدہ زیری کا طالب ہوتا ہے۔

مصنف نے ایک ہی جلد میں علامہ کے سوانح حیات بھی جمع کر دیے ہیں اور ان کے خیالات و احساسات کے علاوہ دینی اور سیاسی عقائد اور انکار بھی حضرت علامہ پر لکھی جانے والی کسی کتاب میں ہمیں اتنی معلومات سیکھا نہیں ملتی۔ کتاب کے ذیل عنوانات

بلکہ علم کے پھلنے پھولنے اور اس وقت اور موجود وقت کے رسم و رواج، تہذیب و ثقافت اور اسلام کے نظریاتی حقائق سے بھی روشناس کراتی ہے۔

نام کتاب: برصغیر میں اسلامی صحافت کی تاریخ مصنف: ڈاکٹر سلیم الرحمن خان ندوی، صفحات: 420، قیمت: 600 روپے۔ ملنے کا پتہ: اکیڈمی بک سنٹر، ڈی-35، بلاک 5، فیڈرل بی ایریا کراچی۔

فون: 021-36809201

بچوں میں خوف کے اسباب

بچپن میں جس خوف کا تھخہ ہم اپنے بچوں کو اپنا وقت بچانے بے جا شور سے جان چھڑانے یا کسی اور مقصد کے پیش نظر دیتے ہیں ان کی وجہ سے کئی بچوں کا مستقبل اکثر تاریک ہو جاتا ہے۔ یہ تھخہ اس وقت کام آتا ہے جب وہ بڑوں کی بات نہیں مانتے۔ ڈرا دھمکا کر منانے اور کام نکلوانے کے لیے اسے ہمیشہ اکسیر



سمجھا گیا ہے۔ اس لیے ہم نسل در نسل یہ سیکھا سمجھا سنا آزماتے اور دہراتے رہتے ہیں۔ چھوٹے سے ذہن کو ڈرا اور خوف کا تھخہ دے کر اکثر بڑے تو اگلے ہی لمحہ اسے بھول جاتے ہیں۔ بچوں میں خوف سے متعلق کتاب لکھ کر فوزیہ عباس نے جس اہم مسئلے پر قلم زنی کی ہے یہ ہمارے معاشرے کا ایک اہم اور نازک مسئلہ

reconstruction of Religious thought

in Islam کے نام سے شائع ہوئے۔ علمی حلقوں میں اس کتاب کا خاصا چرچا ہوا۔ یوں ۱۹۳۲ء میں (انگلستان میں آپ نے اس سلسلے کا آخری خطبہ ارشاد فرمایا۔

خطبات اقبال

کے مطالعے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنف نے حیات اقبال کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ آبا و اجداد کا تذکرہ ہو یا پھر دوستوں مداحوں سے ملاقات غرض دنیا جہاں کے موضوعات پر علامہ اقبال کا اظہار خیال ہمارے سامنے کھلی کتاب کی طرح آ جاتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ عام قارئین اور اہل علم و فن دونوں کے لیے یکساں مفید ہو گا اور وہ حیات اقبال سے بصیرت کے موتی چستہ رہیں گے۔

نام کتاب: مکالمات اقبال، مصنف: پروفیسر معین راشد (خلیف)، صفحات: ۴۳۷، قیمت: ۶۰۰ روپے ناشر: بک کارنر شوروم، جہلم

خطبات اقبال

زیر نظر کتاب علامہ اقبالؒ کے مختلف اسلامی اور فلسفی امور پر دیے گئے سات خطبات کا مجموعہ ہے۔ ان خطبات میں سے تین مدراس کے ایک مسلم تاجر سینھ جمال محمد کی قائم کردہ مسلم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام پڑھے گئے۔ ان کی شہرت سن گر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں یہی تینوں خطبات اپنے ہاں آ کر پڑھنے کی دعوت دی تب علامہ نے مزید تین خطبات پڑھنے کی ہامی بھری۔ یوں علی گڑھ میں چھ مقالات پڑھے گئے جو بعد میں ۱۹۳۰ء میں Six Lectures on

فکر اقبال ان خطبات میں پوری طرح آشکار ہوتی ہے اور یہ خطبات بلاشبہ اقبالؒ کی فکر کو سمجھنے میں اساسی حیثیت کے حامل ہیں۔

حلیفہ عبدالکیم جنھوں نے ان خطبات کی تلخیص اور ترجمہ کیا ہے، خود بھی بڑی صاحب علم و فضل شخصیت تھے۔ فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حامل اور فلسفہ و کلام کی پیچیدگیوں سے پوری طرح آگاہ اور آشنا تھے۔ وہ ۱۹۱۳ء میں علامہ اقبالؒ سے متعارف ہوئے اور آخر وقت تک دونوں علمی ہستیوں کی رفاقت رہی۔

کتاب کو نہایت اہتمام سے سفید آفسٹ کاغذ پر شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی جلد مضبوط اور جاذب نظر ہے۔ یہ کتاب آپ کی لائبریری کے لیے ایک اچھا اضافہ ہوگی۔

ترجمہ و تلخیص: ڈاکٹر خلیفہ عبدالکیم
صفحات: ۱۸۵، قیمت: ۶۰۰ روپے
ناشر: بک کارنر شوروم، جہلم

چمن خیال



قلمربن کے تبصروں، مشوروں
اور بانوں سے سجا کالم

جواپی تاریخ بھلا چکے!

ہوئے کہا "ہمیں سودا منظور ہے۔"

گولڈامیئر نے اگلے روز معاہدے کی تفصیلات
کابینہ کے سامنے رکھیں تو سب وزیرانے سودا مسترد
کر دیا۔ کابینہ کا موقف تھا کہ ان کا ملک اس دلت
بحران کا شکار ہے۔ اس خریداری کے بعد اسرائیلی قوم کو
برسوں تک دن میں صرف ایک بار کھانے پر اکتفا کرنا
پڑے گا۔ گولڈامیئر نے اپنی کابینہ کے فیصلے سے اتفاق
کیا لیکن بحث سپیٹ ہوئے کہا "ہم جنگ جیت گئے
تو تاریخ ہمیں فاتح قرار دے گی۔ تب تاریخ بھول
جاتی ہے کہ جنگ کے دوران فاتح قوم نے کتنی دلف
خاکہ کشی کی دن میں کتنی بار کھانا کھایا اس کے جوتوں
میں کتنے سوراخ تھے پاتلواریوں کے نیام پھٹے ہوئے
تھے۔۔۔ فاتح صرف فاتح ہوتا ہے۔"

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے سائنے جب
گہرے ہو چکے تو ایک دن امریکی اسلحہ کمپنی کا سربراہ
اسرائیل آیا۔ دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لیڈر وزیراعظم
گولڈامیئر کے گھر پر ملاقات کا اہتمام ہوا۔ وزیراعظم
مہمان کو اپنے باورچی خانے میں لے گئیں۔ انھیں کرسی
پر بٹھایا اور خود چائے بنانے لگیں۔ اس دوران طیاروں
میرانکوں اور توپوں کے سودے کی بات چیت ہوتی رہی
چائے تیار ہوئی تو ایک پہیلی مہمان کو پیش کی دوسری اپنے
سامنے رکھی اور تیسری دروازے پر کھڑے امریکی گھوڑے کو
نہما آئیں۔ چائے پینے کے دوران ہی اسلحے کی خریداری
کی شرائط طے پا گئیں۔ گولڈامیئر نے مہمان سے ہاتھ
ملانے سے قبل بیالیاں سمیٹیں اور دھو کر الماری میں رکھتے

درود دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورثہ.....

پچھلے دنوں ایک ایسی تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں یتیم بچوں کی کفالت کے لیے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ تقریب بہت بڑی رونق تھی۔ شہر کے سب معززین جمع تھے۔ قیمتی لباس، زیورات، خوشبوؤں اور صحت مند چھروں سے بھری محفل مجھے بھی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ کچھ سیلیوں کے درمیان بیٹھی میں بھی ”لان“ کی نئی ورائٹی کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ کچھ کیمرو میں تصاویر کھینچ رہے تھے۔ اچانک ان غریب بچوں کو مدعو کیا گیا جنہیں رقم دی جانی تھی۔ اچانک مائٹل کچھ بد مزہ ہو گیا۔ گول گول منوں بچے اپنی تمام تر معصومیت کے باوجود آنکھوں کو بھیلے معلوم نہ ہوئے۔ ایک سیلی نے اپنے ڈھائی لاکھ کے پرس سے چند ہزار روپے نکال کر بچے کی طرف بڑھائے تو پورا حال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اسی طرح ایک ایک کر کے سب نے اپنے قیمتی پرسوں سے کچھ روپے نکالے، بچوں کو دیے اور تصاویر کھینچوائیں۔ آخر میں کھانا کھایا گیا اور پھر سب مہنگی گاڑیوں میں بیٹھ آرام وہ گھروں کو روانہ ہو گئے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے چند روپے دے کر خود کو دردمند تو ثابت کر دیا، مگر یوں غریب بچوں کی زندگی میں فرق آجائے گا؟ کیا اس رقم سے ان کی بنیادی ضروریات سدا پوری ہو پائیں گی؟ معمولی رقم ان کی زندگی نہیں بدل سکتی۔ تب ہی مائیں بچوں کو بھوک پیاس سے ہلکا دیکھ کر خودکشی کر لیتی ہیں۔ اصل تہدیلی اسی وقت آئے گی جب ہمارا طبقہ بالا حضور پاک ﷺ کے مانند سادگی اپنالے اور غریب بچوں اور لوگوں کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرے۔ وہ

گولڈ امیٹر کے یہ دلائل سن کر کاہنہ نے ہتھیار ڈال دیے اور امریکا کے ساتھ اسلحہ کی خریداری کا معاہدہ طے پا گیا۔ پھر اسی اسلحہ سے اسرائیل نے عربوں کو شکست دی۔ جنگ کے کافی عرصے بعد امریکی اخبار، واشنگٹن پوسٹ کے نمائندے نے گولڈ امیٹر کا انٹرویو کیا۔ سوال تھا ”امریکی اسلحہ کی خریداری کے لیے آپ کے ذہن میں جو دلیل تھی وہ فوراً ذہن میں آئی یا پہلے سے طے شدہ حکمت عملی تھی؟“

گولڈ امیٹر نے چونکا دیئے والا جواب دیا ”میں نے یہ استدلال اپنے دشمنوں یعنی مسلمانوں کے نبی محمد ﷺ سے لیا ہے۔ میں نے زمانہ طالب علمی میں محمد ﷺ کی سوانح حیات پڑھی تھی۔ جب آپ کا وصال ہوا تو گھر میں چراغ جلانے کے لیے تیل خریدنے کی رقم نہیں تھی۔ آپ اہلبہ (حضرت عائشہؓ) نے آپ کی زرہ بکتر رہن رکھ کر تیل خریدا۔ لیکن اس وقت بھی محمد ﷺ کے حجرے کا دیواروں پر نو تلواریں لٹک رہی تھیں۔

”میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو سوچا دنیا میں ستنے لوگ ہوں گے جو پہلی اسلامی ریاست کی کمزور اقتصادی حالت کے متعلق جانتے ہوں گے؟ لیکن آج مسلمان آدھی دنیا کے فاتح ہیں اب بات پوری دنیا جانتی ہے۔ لہذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر مجھے اور میری قوم کو برسوں بھوکا رہنا پڑے مسلمانوں کی طرح پختہ مکانوں کے بجائے خیموں میں زندگی گزارنی پڑے تو بھی اسلحہ خریدیں گے اور انہی کی طرح فاتح کا اعزاز پائیں گے۔ ان مسلمانوں کی طرح جنہوں نے آدھی دنیا فتح کی لیکن اب وہ اپنی تاریخ کو بھلا چکے۔

کاش، اپنے عظیم ماضی کی طرف ہم پھر لوٹ چلیں
(امام محمد شاہد پاکستان کالونی یورپ والہ)

موٹر سائیکلوں اور موبائل فونز کی ریل پیل ہے۔ اٹھارہ کروڑ عوام دو دقت کی روٹی کھا رہے ہیں۔ سب کو چھت میسر ہے لیکن روٹا پیٹنا پھر بھی ہے کہ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔“

الطاف صاحب نے بالکل سچ لکھا۔ ان حالات کی آپ ایک نہیں بے شمار توجیہات پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً اکثریت میں رزق حلال کمانے کا فقدان ہے برکتی سود کی لعنت سے مکمل چھٹکارا نہ پاسکنا فرقہ واریت میں بنی قوم زبان و نسل کا تعصب۔ تعلیم و تربیت کا فقدان بد عنوانی اور شہوت ستانی، اقربا پروری شرعی قوانین اپنانے سے بے رغبتی اور سب سے بڑا گناہ جھوٹ۔ بزرگوں سے شائبے کہ مومن زانی اور چور ہو سکتا ہے لیکن جھوٹا نہیں۔ جب ہم اغراضی سطح پر جھوٹ پولیس تو مومن کیسے رہ سکتے ہیں؟

(محمد خورشید اقبال سرجانی، ڈکن کراچی)

تھرکول کا عظیم منصوبہ

شہرہ جون ۲۰۱۳ء میں تھرکول پراجیکٹ کے متعلق ماہر ارضیات مرزا عبدالصمد بیگ کے انکشافات پڑھ اور یہ جان کر دل باغ باغ ہو گیا کہ تھرکول کے نو سو سال تک چالیس ہزار میگا واٹ بجلی بنانا ممکن ہے۔ تھرکول پراجیکٹ کے بارے میں معلومات دے کر اردو ڈائجسٹ نے ہمیشہ کی طرح قومی خدمت انجام دی ہے کیونکہ بعض حلقوں کی طرف سے اس کے خلاف غلط اور منفی پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ تھرکول کے اخراجی سو مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہیں۔ اگرچہ ماضی میں یہ منصوبہ ست روٹی کا شکار رہا لیکن اب اس پر برق رفتاری سے کام ہو رہا ہے۔ تھرکول میں قحط آیا تو کسٹمر ہیلپ لائن کی نہیں

اپنی بہت سی عیاشیاں ترک کر کے معصوم بچوں کو بنیادی سہولیات فراہم کر سکتا ہے۔

ہمارے امرا کو سمجھنا ہوگا کہ بیرونی دوروں سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ایک غریب انسان کو زندگی کی بنیادی سہولیات یعنی کھانا، پینا، دوا دارو اور صاف ستھرا ماحول مل جائے۔ ان کا بچہ اگر ایک دن برگر نہیں کھاتا، تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر غریب کا بچہ ایک روٹی کو ترستے ترستے مر جائے، تو یہ پوری انسانیت کی موت ہوگی۔ ہمارے حکمران نجانے کیوں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اگر اللہ نے انھیں پیسا دیا اور اچھے خاندان میں پیدا کیا ہے تو یہ ان کی قسمت ہے۔ بلکہ یوں سوچنا چاہیے کہ اس نے انھیں دیا ہی اس لیے ہے کہ وہ غریب اور نادار بندوں کی مدد کر سکیں۔ وہ نہ دے کر آزماتا اور دے کر بھی آزماتا ہے۔ اور جیت اسی کی ہوتی ہے جو اس کی آزمائش پر پورا اترے۔

(دارالافتاء)

ہم ناشکرے کیوں ہیں؟

جناب الطاف حسن قریشی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: ”معلوم نہیں کہ یہ ہم پر کبھی جبروت کا سایہ ہے یا ہماری ناشکری کا سیاہا کہ ملک میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شام غریباں چارہ بنتی ہے۔ حالات پہلے سے بہت بہتر ہونے کے باوجود بڑے اہتر دکھائی دیتے ہیں۔ فصلیں بہت اچھی ہو رہی ہیں۔ اناج، سبز یوں اور پھلوں کی فراوانی ہے جنھیں دیکھ کر بے اختیار اللہ کا شکر ادا کرنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔ کشادہ سڑکیں ہیں۔ دیہات میں خوبصورت مکانات نظر آتے ہیں۔

(عثمان جموعہ لاہور)

شمارہ جون پہ تبصرے

اردو ڈائجسٹ کے ایک پرانے سلسلے "مشورہ حاضر ہے" کو ضرور جاری رکھا جائے۔ جناب الطاف حسن قریشی کا تجزیہ بہت ہی اعلیٰ اور حالات و واقعات سے بھرپور تھا۔ پسند آیا۔ ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ بھی حالات حاضرہ اور پاکستانیوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے تازہ بانہ ثابت ہوا۔

(محمود منور خان کوٹ سنہا لوالہ میانی)
محترم طیب اہل قریشی کے ایڈیٹر نوٹ نے کئی دروازے کھول دیے۔ دل کی انتہائی گہرائیوں سے لکھا یہ دور مندی کا پورا قصہ دل میں اتر گیا۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے نکلے تمام باتیں بھی غور و خوض کی متقاضی ہیں۔ کب رسول اللہ ﷺ انوکھا موضوع رہا۔ جزاک اللہ۔ بشری رحمن اور خلیم احمد بشیر چونکا دینے والے افسانے لے کر حاضر ہوئیں۔

(جاوید احمد صدیقی راولپنڈی)

.....☆.....

صفائی نصف ایمان ہے

حدیث رسول ﷺ ہے "صفائی نصف ایمان ہے۔" یعنی مسلمان صفائی پاکیزگی اور طہارت اختیار نہ کرے تو نصف ایمان ہوا ہی ساقط ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے ارد گرد دیکھیں تو سڑکوں، بازاروں اور پارکوں پر گندگی اور کوڑے کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ لوگ صرف اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں، محلے کی صفائی سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اکثر ہم اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ سڑکوں اور گلیوں میں پھینک دیتے ہیں۔

فورا تم پارکر کے قحط زدہ علاقوں میں پہنچ گئیں اور ابھی تک لوگوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔

(ڈاکٹر آصف محمود جہا لاہور)

پاکستان کے اصل ہیرو

پاکستان کے اصل ہیرو وہ پاکستانی ہیں جنہوں نے ہمارے سیاست دانوں کی طرح وطن نہیں لوٹا اور نہ ہی غیر ممالک میں روپے جمع کیے، بلکہ اس کے بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنی جائداد وغیرہ بھی پاکستان کے استحکام میں دے ڈالی۔ ان میں سرپرست حضرت قائد اعظم محمد علی جناح ہیں جنہوں نے مرتے دم تک پاکستان کے لیے کام کیا۔

دوسرے نمبر پر مولانا عبدالستار ایدھی اور ان کی جنگیں ہیں۔ انھوں نے غریب ہوتے ہوئے بھی اپنی محنت اور لگن سے خدمت خلق کی تنظیم ایدھی ٹرسٹ قائم کی جس سے لاکھوں انسانوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ وہ ہر جگہ خدمت کرنے پہنچ جاتے ہیں۔

تیسرے نمبر پر حکیم محمد سعید شہید آتے ہیں۔ وہ صرف چند سو روپوں کے ساتھ پاکستان آئے مگر دن رات کی محنت اور لگن سے ہمدرد ٹرسٹ جیسا عظیم الشان ادارہ وطن عزیز کو دے گئے۔ وہ صحت کے علاوہ تعلیم اور دوسرے کئی شعبوں میں پاکستان کی خدمت کر رہا ہے۔

چوتھے نمبر پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان ہیں۔ ایک غریب پاکستانی جو خالی ہاتھ پیدل چل کر مرزمن پاک میں سیدہ کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ انھوں نے پھر ایٹم بم بنا کر قائد کی امانت کو دفاعی طور پر ناقابل تسخیر بنادیا۔ اب کوئی دشمن پاکستان کی طرف ہلے آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

اعلانات

اردو ڈائجسٹ میں شمارہ مارچ تا مئی ایک ہڈل بعنوان ”زری ہاؤس“ قسط وار شائع ہوا تھا۔ تاہم قارئین کی عدم دلچسپی کے باعث مجلس ادارت نے یہ سلسلہ روک دیا ہے۔ نوٹ فرمائیے۔

☆☆

شمارہ جون کے صفحہ ۳۶ پر ایک فکر بعنوان ”مسلمان غیر مسلموں کی نظر میں“ چھپا تھا۔ سہا اس میں مصطفیٰ جناب نظر اقبال کا نام طبع ہونے سے رد کیا۔ ادارہ اس قزو گزاشت پہ معذرت خواہ ہے۔

کاکا

کاروباری نقطہ نظر کو مد نظر رکھتے ہیں اور دولت کا حصول ہی ان کا ہدف ہے۔ جبکہ اردو ڈائجسٹ کا یہ طرہ ہے کہ وہ قوم سے مخلص اور نوجوان نسل کا خیر خواہ ہے۔

جناب الطاف حسن قریشی کے مضامین اور ادارے ہمیں ملکی خیر خواہوں اور بدخواہوں سے باخبر رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کرے زور قلم اور زیادہ! دلی دعا ہے کہ وہ تادیر اپنے فرائض صحت و تندرستی کے ساتھ انجام دیتے رہیں۔

یوں تو ڈائجسٹ ایک خوبصورت مرقع ہے لیکن اس میں معاشرتی کہانیاں کم دکھائی دیتی ہیں۔ اس جانب خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ صحت و طب سائنس نشن شخصیات سفر نامے اور اسلامی مضامین خوب ہوتے ہیں۔ مشہور ادبا کے چیدہ چیدہ المسائے بھی ڈائجسٹ کے زینت بن جایا کریں تو کیا ہی کہنے۔ امید ہے میری رائے کوڑے کی نوکری کی زینت نہیں بنے گی۔

(محمد جاوید برکی راولپنڈی)

یقیناً کئی کام کرنے عام لوگوں کے بس میں نہیں مگر وہ محلوں کی سطح پر کمیشیاں بنا کر صفائی کا نظام بہتر بنا سکتے ہیں۔ مثلاً گھروں کا کوڑا گلی یا سڑک پر پھینکنے کے بجائے کسی مخصوص جگہ ڈال دیا جائے جہاں سے اسے بے سانی اٹھایا جاسکے۔ آپس میں چندہ اکٹھا کر کے سپورٹس سسٹم بہتر بنالیں تاکہ کندے پانی کی نکاسی بہتر طریقے سے ہو سکے۔

ہمیں اپنے بچوں کی ابتدائی سے ایسی تربیت کرنی چاہیے کہ وہ صفائی کے عادی بن جائیں۔ مثلاً کہیں کاغذ یا روٹی دیکھیں خواہ اسکول ہو یا گھر، اسے اٹھا کر کوڑا دان میں ڈال دیں۔ اس سلسلے میں ماںیں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

(شاہدہ رضوی اعجاز تھ ناظم آباد کراچی)

دو سفر نامے شائع کیجیے

میں سیر و سیاحت کا شوقین ہوں۔ اس لیے سفر نامے پڑھنا پسند ہے۔ درخواست ہے کہ رسالے میں ایک کے بجائے دو سفر نامے شائع کیے جائیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ ایک پاکستان دوسرا کسی بیرون ملک کا! (محمد ذہیر ذکی فیصل آباد)

☆☆

میری مائیں

اردو ڈائجسٹ میرا پسندیدہ جریدہ ہے۔ مجھے اس میں سب سے اچھی بات یہ لگتی ہے کہ مادہ پرستی کے اس دور میں بھی یہ اپنے اصولی موقف پر قائم و دائم ہے۔ ڈائجسٹ نے کبھی سگریٹ نوشی کے اشتہاروں کو اپنے اوراق کی زینت نہیں بنایا جبکہ دوسرے جریدہ اخلاقی اقدار اور اصولوں کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ وہ

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

پروسیس نوجوانین

مرتب: غلام سجاد

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر نوجوانوں والی ہی ہے یا)

ماہ جون میں دیے گئے اسلامی کونز کے درست جوابات

اسلامی کونز 1۔ (الف) 2009ء، آذربائیجان
اسلامی کونز 2۔ (الف) مہینہ کثرتِ اہلخانہ
(ب) سنن الی بابہ
(ب) علمی کیفیت اساتذہ

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ اینٹال سلیم (حیدرآباد) 2۔ عمر یوسف نامی (ملتان) 3۔ مسرت خالد (نصیر) 4۔ مقدس مصغر بہری پور

دوست جوابات دینے والوں کے نام

ڈاکٹر دوست مرغان (کرچی، سرسبز چتر، پکوال)، عمر عبد اللہ عمر (بہم، امرتسار، ایفک (حیدرآباد)، مرزا اسلام بیگ (حیدرآباد)، طاہر حسین (حیدرآباد)، یوسف احمد (حیدرآباد)، علی حسین (حیدرآباد)، وحید احمد (حیدرآباد)، جمال سلیم (حیدرآباد)، انیسائی احمد (لاہور)، عمر یوسف نامی (ملتان)، مسرت خالد (نصیر)، طاہر مرغان بیگ (پشاور)، فضل قریشی (راولپنڈی)، مسام ظفر (راولپنڈی)، فیضان اکرم (حیدرآباد)، عمر گلبل عباس شجود (مرگودھا)، حافظ سمیر عبد اللہ (ہری پور)، ملک ساجد (ہری پور)، جویریہ شیر نواز (پشاور)، سرمد علی (ملتان)، عاتق محمود (راولپنڈی)، شاد دست جہان (راولپنڈی)، سعید سلیم (راولپنڈی)، مسرت خالد (نصیر)

اسلامی کونز 1

روزہ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ ارشادِ الہی ہے: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے ایمان کے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے قطعاً ہے کہ تم میں تقویٰ کی مفت پیدا ہو گی۔ چند ضرورتوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی مقدار پوری کر لے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور (بجور و رکھیں) تو وہ نذیر ہیں۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن ازل کا کیا جاتا ہے اس لیے اس امر پر غور ہے کہ اگر ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو ارادہ رکھنے والی اور حق و باطل کا فرق کھل کر دکھائے والی چیز۔

(الف) رمضان المبارک اسلامی کونز میں کتنا صحیح ہے؟ (ب) رمضان المبارک میں خاص رات کون سی پہلی ہے؟

اسلامی کونز 2

حصہ: رمضان المبارک کا ارشاد ہے کہ تین آدمیوں کی دعا مانگیں، ہولی، ایک روزہ دار کی افطار کے وقت کی دعا دوسرے فادلی بارشاد کی دعا، جس کے منظم کی دعا جس کو حق خدائی باروں سے اوپر اٹھائے ہیں اور آسمان کے دروازے اس کے لیے کھول دیے جاتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ میں تیری ضرورت اکر اس کا گوشت (مسیحیت سے) بچھ دوں گا۔ "ما قرینہ، ابن حبان، ابی نعیم" صحیح بخاری کا ارشاد ہے کہ جو شخص بلا کسی شرعی عذر کے ایک دن بھی رمضان کے روزہ کو افطار کر دے، غیر رمضان کے روزے کا ہے تمام عمر کے اس کا بدی نہیں ہو سکتا۔

(طلب) حضور نے فرمایا کہ کس آئی کی دعا مانگیں ہونی؟ (ب) رمضان المبارک کے نبیوں حضرتوں کے نام بتائیں؟

تحریک اسلامی کے شاندار لٹریچر کے وارث

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ، ملتان، لاہور

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ، ملتان، راولپنڈی، لاہور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

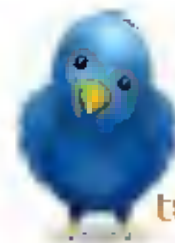
WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1